اورینٹل کالج میگزین

حصہ اوّل

ایڈیٹر

محمد شفیع

(پروفیسر پنجاب یونیورسٹی)

فہرستِ مضامین

جلد ۱۶ - عدد ۴ | بابت ماہِ اگست سنہ ۱۹۴۰ء | عدد مسلسل ۶۲

نوٹ :- ضمیمہ صرف عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کے ممبروں اور خریداران ضمیمہ میں تقسیم ہوتا ہے -

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام مہتہ الشیر داس پرنٹر طبع ہوا اور بابو صدیق احمد خاں نے اورینٹل کالج لاہور سے شائع کیا

اورینٹل کالج میگزین

عرض واجب

اغراض و مقاصد | اس رسالے کے اجرا سے غرض یہ ہے۔ کہ احیاو ترویج علوم شرقیہ کی تحریک کو تاحد امکان تقویت دی جائے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ان طلبہ میں شوق تحقیق پیدا کیا جائے جو سنسکرت۔ عربی۔ فارسی اور دیسی زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں ؛

کس قسم کے مضامین کا شایع کرنا مقصود ہے | کوشش کی جائے گی کہ اس سلسلہ میں ایسے مضامین شایع ہوں جو مضمون نگاروں کی ذاتی تلاش کا نتیجہ ہوں۔ غیر زبانوں سے مفید مضامین کا ترجمہ بھی قابل قبول ہوگا اور کم ضخامت کے بعض مفید رسالے بھی باقساط شایع کئے جائیں گے

رسالے کے دو حصے | یہ رسالہ دو حصوں میں شایع ہوتا ہے حصہ اول عربی فارسی پنجابی (بحروف فارسی) حصہ دوم سنسکرت ہندی پنجابی (بحروف گورمکھی) ہر ایک حصہ الگ الگ بھی مل سکتا ہے ؛

وقت اشاعت و | یہ رسالہ بالفعل سال میں چار بار یعنی نومبر فروری مئی اگست[1] میں شائع ہوگا ؛

قیمت اشتراک | سالانہ چندہ حصہ اردو کے لئے ۱۲؍ اورینٹل کالج کے طلبہ سے چندہ داخلہ کے وقت وصول ہوگا کسی سہ ماہی کے رسالہ کے نہ پہنچنے کی شکایت رسالہ شایع ہونے کی تاریخ سے ایک ماہ کے اندر دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے ورنہ ایسی شکایت پر غور نہ ہوسکے گا۔ یہ ایک ماہ کی مدت فروری و مئی و ستمبر اور نومبر کے آخر سے شمار کرنی چاہیئے ؛

خط و کتابت و ترسیل زر | خرید رسالہ کے متعلق خط و کتابت اور ترسیل زر صاحب پرنسپل اورینٹل کالج کے نام ہونی چاہیئے۔ مضامین کے متعلق جملہ مراسلات اڈیٹر کے نام بھیجنے چاہئیں ؛

محل فروخت | یہ رسالہ اورینٹل کالج کے دفتر سے خریدا جا سکتا ہے ؛

قلم تحریر | حصہ اردو کی ادارت کے فرائض پرنسپل محمد شفیع ایم اے اورینٹل کالج سے متعلق ہیں اور یہ حصہ ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعانت سے مرتب ہوتا ہے ؛

---

[1] چونکہ اگست میں کالج بند ہوتا ہے۔ اسلئے یہ نمبر مجبوراً جون یا ستمبر میں شایع ہوتا ہے ؛

نوروز

ایرانیوں کا تہوار نوروز دنیا کے بڑے اہم تہواروں میں سے ہے اور ہمارا خیال ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں کوئی قومی تہوار ایسی سرگرمی کے ساتھ نہیں منایا جاتا ہوگا جیسا کہ ایران میں نوروز، قدامت کے لحاظ سے بھی شاید دنیا کا کوئی تہوار اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ وہ اس قدر قدیم ہے کہ اس کی ابتدا کا پتہ لگانا تقریباً محال ہے تاریخی زمانے میں بعض دَور ایسے گزرے ہیں۔ جبکہ وہ ایشیا کے بیشتر حصّے میں منایا جاتا تھا اور حیرت کی بات یہ ہے۔ کہ ہر جگہ اس کے متعلق رسوم وعقاید یکساں تھے +

ہم نے ابھی کہا کہ نوروز کی ابتدا قدامت کی تاریکی میں گم ہے۔ اسی وجہ سے اس کے متعلق کتابوں میں فرضی اور افسانوی روایات بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ عیدِ نوروز کا بانی جمشید ہے۔ اہلِ ایران نے ہر اُس چیز کو جس کی ابتدا کا معلوم کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔ اسی افسانوی بادشاہ کے عہد کی ایجاد قرار دیا ہے۔ کتاب نوروزنامہ میں جو غلط طور پر خیّام کی طرف منسوب ہے لیکن یقیناً فارسی کی قدیم ترین نثر کی کتابوں میں سے ہے نوروز کی ابتدا بالفاظ ذیل بیان کی گئی ہے :-

اما سبب نہادن نوروز آن بوده است کہ چون بدانستند کہ آفتاب را دو دور بود یکی آنک ہر سیصد و شست و پنج روز

ورُبعی از شبانروز باوّل دقیقۂ حمل باز آید بهمان وقت و روز
کہ رفتہ بود بدین دقیقہ نتواند آمدن چہ ہر سال از مدت ہمی
کم شود، و چون جمشید آن روز را در یافت نوروز نام نہاد
وجشن آیین آورد و پس ازان پادشاہان و دیگر مردمان بدو
اقتدا کردند،"

فردوسی کا بیان اگرچہ اس بیان سے مختلف ہے۔ تاہم جمشید کی طرف منسوب کرنے میں وہ اس سے متفق ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

بفرّ کیانی کی تخت ساخت — چہ مایہ بدو گوہر اندر نشاخت
کہ چون خواستی دیو بر داشتی — ز ہامون بگردون برافراشتی
چو خورشید تابان میان ہوا — نشستہ بروشاہِ فرمانروا
جہان انجمن شد بر تخت اوی — ازان بر شدہ فرۂ بخت اوی
بجمشید بر گوہر افشاندند — مران روز را روز نو خواندند
سر سال نو ہرمز فردین — برآسودہ از رنج تن دل زکین
بنوروز نوشاہ گیتی فروز — بران تخت بنشست فیروز روز
بزرگان بشادی بیاراستند — می و رود و رامشگران خواستند
چنین جشن فرخ ازان روزگار — بماندہ ازان خسروان یادگار

لیکن نوروز کی حقیقی ابتدا صرف یہ ہے کہ وہ موسم بہار کی آمد کی خوشی میں منایا جانا شروع ہوا۔ ایران میں چونکہ موسم سرما بہت طویل اور شدید ہوتا ہے۔ اور بہار کی آمد نہ صرف گرمی کا پیغام لاتی ہے۔ بلکہ فصلوں کے بونے کا موسم بھی اسی سے شروع ہوتا ہے لہذا اس کی آمد پر خوشی کا اظہار ایک طبعی امر ہے۔ علاوہ اس کے اس موسم میں اعتدالِ ہوا کی

وجہ سے طبیعتوں میں ایک قدرتی امنگ ہوتی ہے اور گل و سبزہ اور چمن کی شادابی دلوں میں جوش پیدا کرتی ہے۔ اس لئے ایسے موسم میں اس قسم کے تہوار کا ہونا لازمی اور بدیہی بات ہے۔ ایران کے ایک فاضل مضمون نگار نے جشن نوروز کی کیفیت و تاثیر بیان کرتے ہوئے اسی خیال کی تائید بالفاظِ ذیل کی ہے:-

"چون این جشن ملّی درمیان اہل ایران در اوّل فصل بہار و موسمِ بیداری طبیعت برپا می شود و بہار ایران نیز در دشت و چمن و کوہسار و ہامون جلوۂ شور انگیز غریبی دارد لہذا این نفخۂ صور رستخیز بہاری کہ در اعتدال ربیعی و تعادل شب و روز و اعتدال ہوا دمیدہ می شود یک عیدی است ہم طبیعی و ہم وضعی و ایرانی بداشتن یک چنین عید ملّی سرفرازست"[1]

بہار کی آمد کا یہ جشن اگرچہ عہد تاریخی سے پہلے شروع ہوا۔ لیکن ایرانیوں کے شمسی سال کا آغاز (جس کی رو سے نوروز کا جشن ماہِ مارچ میں تعادلِ روز و شب کے موقع پر قرار دیا گیا تھا) عہد داریوش اوّل (۵۲۱ تا ۴۸۵ ق۔م) کی یادگار ہے۔ پروفیسر مارکوارٹ آلمانی نے ایک فاضلانہ مقالے میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ایرانیوں کے سالِ شمسی کا آغاز ۴۹۳ اور ۴۸۶ ق۔م کے درمیان ہوا[2]۔ یہ سال تیس تیس دن کے بارہ مہینوں پر مشتمل تھا۔ اور آخر میں پانچ دن کبیسہ کے طور پر بڑھائے جاتے تھے، لیکن چونکہ شمسی سال حقیقت میں ۳۶۵ دن

---

[1] روزنامۂ کاوہ، اپریل ۱۹۲۱ء ، [2] مودی میموریل والیوم (طبع بمبئی)،

۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۶ سیکنڈ کا ہوتا ہے ۔ لہٰذا ایرانی سال میں نوروز کا دن ہر چار سال کے بعد ایک دن پیچھے ہٹتا رہا ۔ یہاں تک کہ وہ بہار کے موسم سے نکل کر سال کے ہر موسم میں گردش کرتا چلا گیا ، یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے مختلف زمانوں میں اس کا وقوع مختلف مہینوں میں مذکور ہے ۔ چنانچہ ۳۲۴ء میں نوروز ۱۱ ستمبر کو ہوا ، ۶۰۶ء میں (خسرو پرویز کے عہد میں) ۲۰ جون کو ہوا اور ۸۲۵ء میں (خلیفہ مامون کے عہد میں) ۱۲ اپریل کو ۔ نوروز کی یہ گردش ملک شاہ سلجوقی کے عہد تک جاری رہی ، تاریخ میں ملک شاہ کے زمانے کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ اس نے تقویم ایرانی کی تجدید کے لئے اصفہان میں ایک خاص رصدگاہ بنوائی اور عمر خیّام اور چند اور منجموں کو اس کام پر مامور کیا ، ۱۰۷۹ء میں نئی تقویم جو تقویم جلالی کہلاتی ہے تیار ہوئی جس کی رُو سے نوروز کا دن ہمیشہ کے لئے ۲۱ مارچ مقرر ہوگیا ۔ یعنی وہ دن جبکہ آفتاب برج حوت سے نکل کر برج حمل میں داخل ہوتا ہے +

علم ہیئت کے اعتبار سے نوروز کی گذشتہ تاریخ کو بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں ۔ اس لئے کہ علامہ البیرونی نے آثار الباقیہ میں اس کو وضاحت کے ساتھ لکھا ہے ۔ اور پروفیسر مارکوارٹ آلمانی نے بھی اپنے مقالے میں اسے دہرایا ہے [۱] ، لیکن اس بارے میں ایک بات جو قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ داریوش کے زمانے سے ملک شاہ کے عہد تک نوروز کا دن پیچھے ہٹتے ہٹتے سال کے مختلف موسموں میں دَورہ کرتا رہا ۔ تاہم ہمارے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ نوروز کا تہوار عہد ملکشاہی سے پہلے بھی ہمیشہ موسم بہار ہی میں منایا جاتا تھا ۔ مختلف زمانوں کے شعراء جو نوروز پر

---

[۱] مودی میموریل وولیوم (طبع بمبئی) ؛

قصائد لکھتے رہے ہیں ہمیشہ موسم بہار کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔
مہیار دیلمی نے جو چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے شروع
میں گذرا ہے تہنیت جشن نوروز پر بے شمار قصیدے لکھے ہیں جن میں
متعدد موقعوں پر بہار کا مذکور ہے، ذیل کے اشعار مثال کے طور پر پیش
کئے جا سکتے ہیں:-

(۱) وَاِنْ أتی رائد النّیروز مجتدیا
أیمانکم فالروابی الخُضْر والعُشُبُ
فمن جباهکم نَوْرُ الربیع لنا
ومن أکفکم الانواء تنسکبُ (دیوان ج ۱، ص ۱۳۲)

(۲) أرجات الأعطاف مُهدیٌ جناها
لک یُهدی الی الربیع الوردا (ج ۱، ص ۲۷۱)

(۳) وحسر النّیروزُ من قناعه
طلعته علی الرّبیع الناضر
وزار کم یرفل فی وشائع
من حلل الرّوض وفی حبائر (ج ۲، ص ۲۲)

فرّخی نے بھی (جو عہد ملکشاہی سے پہلے کا شاعر ہے) بہت سے قصیدوں
میں نوروز کا مضمون نظم کیا ہے۔ اور ہر جگہ موسم بہار کے ساتھ اس کا وابستہ
ہونا ظاہر کیا ہے، مثلاً:-

(۱) روز نوروز و روزگار بہار فرّخت باد و خرّم و پدرام
(دیوان ص ۲۳۱)

(۲) سال نو است و ماه نو و روز نو وقت بہار و وقت گل کامگار

شادی وخرّمی را نوکن بسیج　　　دل را بخرّمی وبشادی سپار

(ص ۹۹)

(۳) نوروز وجہان چون بہشت گشتہ　　　پُرلالہ وپُرگُل کُہ وبیابان
چون چادر مصقول گشتہ صحرا　　　چُون حلّۂ منقوش گشتہ بُستان
در باغ بنوبت ہمی سراید　　　تا روز ہمہ شب ہزار دستان

(ص ۳۲۴)

عنصری کے ہاں بھی اسی قسم کے اشعار ملتے ہیں اور منوچہری کے دیوان میں ایسی مثالیں اور بھی زیادہ ہیں *

ایک قصیدے میں جس کا عنوان" درصفت نوروز ومدح خواجہ حسن میمندی" ہے۔ اُس نے نوروز کے موقع پر آفتاب کا برج حوت سے برآمد ہونا واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں نوروز کا دن ۲۱ رمارچ ہی تھا:۔

باردرّ خوشاب بازز آستین سحاب
وزدُم حُوت آفتاب روی ببالا نہاد

ان مثالوں سے بخوبی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ کہ تقویم جلالی سے پہلے بھی نوروز کا تہوار ہمیشہ موسم بہار ہی میں منایا جاتا تھا، دوسری طرف (جیساکہ ہم نے اوپر بیان کیا) تاریخ سے ثابت ہے کہ مختلف زمانوں میں نوروز کا دن مختلف مہینوں میں آتا رہا۔ ان معلومات کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ایران میں دو تقویمیں رائج تھیں۔ ایک سرکاری، جس کی رو سے سال شمسی ۳۶۵ دن کا تھا۔ اور لہٰذا نوروز کا دن پیچھے سرکتا رہتا تھا اور دوسری مذہبی جس کی رو سے شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے

۴۸ منٹ اور ۴۶ سیکنڈ کا تھا۔ اور لہذا نوروز ہمیشہ ۲۱ مارچ کو ہونا تھا تمام تہواروں کا منانا مذہبی تقویم کے مطابق ہوتا تھا۔ البیرونی کے بیان سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ خلیفہ المعتضد نے (۸۹۲ء سنہ ۹۰۲ء) ایرانی تقویم میں اصلاح کرائی اور نوروز کو ماہ جون میں قرار دیا اور تقویم جلالی کے آغاز تک وہ جون ہی میں مقیم رہا"[1]

ساسانیوں کے زمانے میں جبکہ زرتشتی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا تو عید نوروز کا بطور سرکاری جشن کے منایا جانا شروع ہوا۔ اور لہذا اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس کی حیثیت اس زمانے میں نیم سرکاری اور نیم مذہبی تہوار کی تھی۔ مذہب کی رو سے زرتشتی نوروز کو "یوم اموات" مانتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ اس روز مُردوں کی رُوحیں آسمان سے اُترتی ہیں اور اپنے اعزّہ کے گھروں میں آکر کھانے اور پینے کی چیزیں مانگتی ہیں، لوگ اُس رات گھروں کی چھتوں پر یا دخموں پر کھانے کے خوان رکھواتے تھے۔

شاہانِ ساسانی نوروز کو مذہبی تہوار کے طور پر مناتے تھے، اُس دن صُبح کے وقت سب سے پہلا شخص جو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا موبدان موبد تھا۔ نوروز نامے کے بیان کے مطابق وہ اپنے ساتھ مفصلہ ذیل اشیاء بادشاہ کے پاس لے جاتا تھا:۔ سونے کا ایک پیالہ جس میں شراب ہوتی تھی، انگشتری، درہم، دینار، خوید، تلوار، تیر و کمان،

---

[1] سرکاری تقویم کی رو سے نوروز کا دن بطور تہوار کے نہیں منایا جاتا تھا۔ بلکہ زمینداروں سے سالانہ وصول کرنے کا ایک روزِ معین تھا۔ نوروز کو جون میں لانے کی وجہ یہی تھی کہ اس مہینے میں فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے اور کاشتکاروں کو لگان ادا کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

دوات و قلم، گھوڑا، باز اور ایک خوب صورت غلام، نوروزنامے کے مصنّف نے ان میں سے ہر ایک چیز کی خوبیاں اور معنی سمجھائے ہیں، بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر وہ الفاظ ذیل کو دہراتا تھا:-

"شہا بجشن فروردین بماہ فروردین آزادی گزین بیزدان ودین کیان، سروش آورد ترا دانائی و بینائی بکاردانی، و دیر زی باخوی ہژیر، و شاد باش بر تخت زرّین، و انوشہ خور بجام جمشید ورسم نیاگان در ہمّت بلند و نیکوکاری و ورزش داد و راستی نگاہ دار، سرت سبز باد و جوانی چون خوید، اسپت کامگار و پیروز و تیغت روشن و کاری بدشمن و بازت گیرا و خجستہ بشکار، و کارت راست چون تیر، و ہم کشوری بگیر نو، بر تخت با درم و دینار، پیشت ہنری و دانا گرامی، و درم خوار و سرایت آباد و زندگانی بسیار،"

یہ کہہ کر وہ شراب کو پہلے خود چکھتا تھا اور پھر بادشاہ کو ایک ہاتھ سے پیالہ اور دوسرے ہاتھ سے خوید دیتا تھا اور درہم و دینار کو اس کے آگے تخت پر رکھ دیتا تھا، جشن نوروز مسلسل چھ دن تک منایا جاتا تھا یعنی یکم فروردین سے ۶ فروردین تک، ان میں سے پہلا اور چھٹا دن بہت مقدّس مانے جاتے تھے۔ یکم فروردین کا نام روز ہرمز تھا اور ۶ فروردین کو روز خرداد کہتے تھے اور عقیدہ یہ تھا کہ اس دن خدا نے کائنات کی آفرینش کا کام ختم[1] کیا اور ہر شخص کو اس کی قسمت عطا کی گئی، پہلی تاریخ کو تعطیل عام ہوتی تھی۔ بادشاہ لوگوں کو انعام دیتا تھا اور خیرات کرتا تھا، زمینداروں سے جو معاملہ

---

[1] اسلامی عقیدہ بھی یہی ہے۔ کہ خدا تعالےٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا،

سال بھر میں وصول کیا جاتا تھا وہ اس روز بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوتا تھا اور نئے سکّے جاری کیئے جاتے تھے۔ بادشاہ دربار کرتا تھا اور امراء اور شاہزادے سلام کے لئے حاضر ہوتے تھے اور بادشاہ سے انعام و اکرام پاتے تھے۔ چھٹے دن بادشاہ کے محل میں ضیافت کا سامان ہوتا تھا جس میں صرف خاندان شاہی کے لوگ اور ممتاز امرا شریک ہوتے تھے۔ آتشکدوں میں صفائی کی جاتی تھی اور لوگ علی الصباح نہروں اور دریاؤں پر نہانے جاتے تھے، ایک دوسرے پر پانی چھڑکتے تھے اور ایک دوسرے کو مٹھائیوں کے تحفے دیتے تھے، ہر شخص صبح اُٹھتے ہی بات کرنے سے پہلے شکر چکھتا تھا یا تین بار شہد چاٹتا تھا اور جسم پر تیل ملتا تھا۔ تاکہ سارا سال بیماریوں سے محفوظ رہے۔ پانی چھڑکنے کی رسم کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے۔ کہ جمشید کے تخت نشین ہونے سے پہلے سخت خشک سالی ہوئی۔ لیکن جس دن وہ تخت نشین ہوا اُسی دن بارش ہوئی اور اس کو فال نیک سمجھا گیا، لوگوں نے اس کو نیک شگون قرار دینے کے لئے ایک دوسرے پر پانی چھڑکنے کی رسم جاری کی شکر چکھنے کی رسم بھی جمشید ہی کے زمانے سے جاری ہوئی، نیشکر سب سے پہلے اُسی کے عہد میں دریافت ہوا اور شکر سب سے پہلے اُسی کے زمانے میں تیار کی گئی۔ اس کا چکھنا اور ایک دوسرے کو تحفے کے طور پر بھجوانا خوش بختی کی علامت قرار دیا گیا۔

اسلامی زمانے میں خلفاء عباسی نے ساسانیوں کی جملہ رسوم و روایات کو برقرار رکھا، منجملہ ان کے ایرانی تہواروں کا منانا تھا، چنانچہ ان کے زمانے میں جشن نوروز کی تقریب تقریباً تمام اسلامی ممالک میں رائج ہوگئی،

خصوصاً عراق، مصر اور ترکستان میں، جرمن مؤلف ایڈم میٹس نے اپنی کتاب "احیاء اسلام"[۱] میں ممالک اسلامی میں نوروز کے جشن کی کیفیت بیان کی ہے وہ لکھتا ہے کہ بغداد میں خلیفہ عباسی نوروز کے دن لوگوں کو بیش بہا تحفے انعام میں دیتا تھا۔ بخارا میں شاہان سامانی اس روز اپنے سپاہیوں کو گرمیوں کے کپڑے تقسیم کرتے تھے۔ اسی طرح مصر میں خلفائے فاطمی بھی لوگوں کو خلعت اور لباس انعام میں دیتے تھے۔ بغداد میں خلیفہ کے سامنے ایکٹر کھیل کر کے دکھاتے تھے اور خلیفہ ان پر زر و نقد نچھاور کرتا تھا، ایک دوسرے پر پانی چھڑکنے کی رسم مصر میں بھی تھی۔ اور چینی سیاح ونگ ین ٹے نے ۹۸۱ء میں یہی رسم طرفان (ترکستان) میں بھی دیکھی جہاں لوگ چاندی اور تانبے کی نلیوں میں پانی بھر کر ایک دوسرے پر پھینکتے تھے، مصر میں نوروز کے دن ایک شہزادے کو امیر النوروز مقرر کیا جاتا تھا، وہ اپنے چہرے پر آٹا اور چونہ مل کر ایک گدھے پر سوار ہو کر بازاروں میں پھرتا تھا۔ اور مالدار لوگوں سے نقدی وصول کرتا تھا اور جو نہ دے اس پر غلاظت پھینکتا تھا، لوگ ایک دوسرے کو ہنسی مذاق کے طور پر چابکوں سے مارتے تھے، اور اس بارے میں پولیس کوئی شکایت نہیں سنتی تھی، مدرسوں کے طالب علم اپنے استادوں کے ساتھ ہر قسم کی گستاخیاں کرنے کے مجاز تھے۔ بعض وقت وہ ان کو کسی حوض میں دھکا دے کر گرا دیتے تھے اور جب تک وہ انہیں کچھ نقد ادا نہ کرے اسے نکلنے نہیں دیتے تھے ۹۷۴ء میں خلیفہ نے جشن نوروز کا منانا ممنوع قرار دیا۔ لیکن لوگ باز نہ آئے۔ تا آنکہ چودھویں صدی کے آخر میں سلطان برقوق نے اس کا بالکل

---

[۱] Renaissance of Islam

خاتمہ کر دیا ۔

شاہانِ غزنوی بھی نوروز کو بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے ، دربارِ عام ہوتا تھا اور شعراء مبارکباد کے قصیدے پیش کرتے تھے جن کے نمونے فرخی اور منوچہری کے دیوانوں میں موجود ہیں ۔ شراب کا دَور چلتا تھا اور رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی تھیں ، سلجوقیوں نے نوروز کو جو اہمیت دی وہ اس سے ظاہر ہے ۔ کہ ان کے زمانے میں سرکاری تقویم میں بھی نوروز کا دن ۲۱ مارچ قرار پایا ۔ عہدِ سلجوقی کے شعراء بھی جشن نوروز کے قصیدے بڑی دھوم دھام سے لکھتے رہے ہیں ۔

ہندوستان میں مغلوں سے پہلے نوروز کے تہوار کے متعلق کسی قسم کے صریح بیانات نہیں ملتے ۔ بدر چاچ کے دیوان میں صرف ایک قصیدہ محمد تغلق کی مدح میں ہے جو ایک جشن کی تقریب پر پیش کیا گیا تھا ۔ یہ جشن ۱۳۴۰ء کے ماہ مارچ میں منعقد ہوا جبکہ عید الفطر اور نوروز دونو ساتھ پڑے تھے ۔ اس بات کا ذکر وہ اشعار ذیل میں کرتا ہے :-

عید آمده برائے تماشائے جشن شاه	بر در نشستہ طالب پروانۂ درست
نوروز نیز آمده آورده عیدئی	یک سبز بره کا هوی زردیش دربست
زان مُهر زر بہ پیش ترازو شرف گرفت	کآنجای وزن مشک بکافور همسرست
خاتون نوبهار شده پای کوب جشن	موی سیه بقدّ سفیدش برابرست[1]

(ص ۳۵)

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا یہ جشن عید کی تقریب میں تھا یا نوروز کی تقریب میں ۔ لیکن اشعار بالا میں نوروز کا ذکر اس امر کو ثابت کرتا ہے ۔ کہ اُس

---

[1] آخر کے دو شعروں کا مطلب یہ ہے کہ رات اور دن برابر ہو گئے ہیں (۲۱ مارچ کو) ؛

عہد میں اس کو خوشی اور شادمانی کی تقریب سمجھا جاتا تھا۔

مغلوں کے دور میں اکبر نے نوروز کو ایک باقاعدہ تہوار قرار دیا۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں توضیح کی ہے۔ کہ چونکہ بادشاہ سلامت آفتاب کی پرستش کے قائل تھے۔ لہذا انہوں نے نوروز جلالی کو ایک مقدس تہوار تسلیم کیا۔ بدایونی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ نوروز مسلسل اُنیس دن تک منایا جاتا تھا۔ یعنی یکم فروردین سے ۱۹ فروردین تک، انیسواں دن روز شرف کہلاتا تھا اور سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا، آگرے کے بازاروں میں آئین بندی ہوتی تھی۔ اور محلاتِ شاہی، دیوان عام اور دیوان خاص کو سجایا جاتا تھا۔ قیمتی پردے آویزاں کئے جاتے تھے۔ بیش بہا قالین بچھائے جاتے تھے اور دربار عام ہوتا تھا۔ سنہ ۹۹۰ھ میں جشن نوروز کی کیفیت کو بدایونی نے بالفاظ ذیل لکھا ہے:-

و پانزدہم شہر صفر این سال (سنہ ۹۹۰ھ) تحویل نوروز و شروع در سال بیست و ہشتم از جلوس روی دادہ، آئین بندی ہر دو دیوان خانۂ خاص و عام بانواع تماشہای لطیف فرمودہ اشیای قیمتی گوناگون ترتیب نمودہ و پردہ ہای فرنگی و تصویرہای بی نظیر گرفتند و سراپردہای اعلیٰ افراشتند و بازار آگرہ و فتحپور را نیز باین دستور آراستہ تا ہژدہ روز و شب جشن عالی داشتند و اقسام طوائف اہل نغمہ و ساز ہندی و فارسی و ارباب طرب از مرد و زن ہزاران ہزار طلبیدہ ہر روز در ایوان یکی از امرای نامدار آمدہ و صحبت داشتہ پیشکش معتبر و اسباب مہمانی از وی گرفتند

(ص ۳۳۸ از طبع نولکشور)

شاہانِ مغلیہ اپنے سالِ جلوس کی ابتدا نوروز کے دن سے شمار کرتے تھے۔ جہانگیر اپنی توزوک میں ہر نئے سال کے واقعات کو جشنِ نوروز کی کیفیت سے شروع کرتا ہے۔ اس کے عہد میں نوروز بالکل اسی طرح منایا جاتا تھا جس طرح کہ اکبر کے زمانے میں، یعنی جشن کا زمانہ یکم فروردین سے ۱۹ ر فروردین تک ہوتا تھا، پہلے دن بادشاہ زمرّدین لباس پہن کر تحویل آفتاب کے وقت دربارِ عام کرتا تھا اور امراء تحفے اور نذرانے پیش کرتے تھے، انیس دن تک ہر روز امرا میں سے ایک نہ ایک بادشاہ کی دعوت بڑی دھوم دھام سے کرتا تھا اور بیش قیمت اشیاء بطور پیشکش بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا تھا۔ ان اشیاء میں عموماً ہاتھی، جواہرات، قیمتی کپڑے، خوشبوئیں، چینی کے برتن اور دوسری نادر چیزیں ہوتی تھیں۔ بادشاہ بھی امراء کی ضیافتیں کرتا تھا اور انعام واکرام دیتا تھا، منصبوں میں ترقیاں دی جاتی تھیں، خطاب ملتے تھے۔ اور اعلے عہدے تقسیم کئے جاتے تھے۔ شاہی محلات اور بازار سجائے جاتے تھے۔ ان سب باتوں کی تفصیل توزوک جہانگیری اور بادشاہ نامہ ملّا عبدالحمید لاہوری میں مسطور ہے، اورنگ زیب نے جشنِ نوروز کی تقریب کو ممنوع قرار دیا +

ایران میں شاہانِ صفوی کے زمانے میں جو مغلوں کے معاصر تھے نوروز بڑے اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ اگرچہ اس شان وشوکت کے ساتھ نہیں جو مغلوں کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ شاہ عباس کے زمانے میں نوروز کے موقع پر جو رسوم ادا کی جاتی تھیں اس کی کیفیت تاریخ عالم آرای عباسی میں ملتی ہے۔ ذیل کی عبارت سنہ ۱۰۰۴ھ کے نوروز کی کیفیت کو بیان کرتی ہے:-

نوروز این سال جہان آرا در روز یکشنبہ دہم شہر رجب سنہ مذکور اتفاق افتادہ خسرو انجم ومسند نشین فلک چہارم اورنگ حمل را بفر طلعت خود آراست و باد بہاری نزہتگاہ چمن را بگونہ بگونہ ریاحین پیراست، حضرت اعلی شاہی ظل الہی در دار السلطنۃ قزوین وایوان چہل ستون دولتخانۂ خلد آئین بزم خسروانہ و جشن پادشاہانہ آراستہ سلاطین وسلاطین زادہای اطراف مثل حاجی محمد خان پادشاہ خوارزم و نور محمد خان والی مرو شاہجان وسلاطین زادہای گرجستان وایلچیان روس وسائر ممالک کہ در پایۂ سریر اعلی بودند بمجلس بہشت آئین طلب فرمودہ بمبارکی سال نو وتہنیت قدوم نوروز چند روز بلوازم عیش وخرمی پرداختند وبازارہای شہر را آذین بستند در میدان سعادت آباد بچوگان بازی وقبق اندازی مشغولی فرمودہ قریب دہ دوازدہ روز عموم خلایق بسیر وصحبت وفراغت میگذرانیدند

سنہ کا نوروز خاص شان وشکوہ سے منایا گیا۔ اس کے متعلق تاریخ مذکور میں لکھا ہے کہ :۔

پادشاہ مؤید منصور در کمال بہجت وسرور بطریق معہود در باغ مزبور جشن عالی طرح فرمودہ اطراف نہر آبی را کہ از میان باغ جاریست وحوض بزرگی برمثال دریاچہ درمیان آن ترتیب یافتہ سلاطین ماضیہ عمارات دلکشا درکنار حوض وبالای نہر ساختہ و پرداختہ اند باکابر واعیان دار السلطنۃ مذکور وبلوکات واہالی خراسان وتجار واصناف خلایق کہ در پای تخت ہمایون بودند

علی قدر مراتبہم قسمت فرمودہ ہر طبقہ مجلسی طرح انداختند و اطراف
اربعہ آن دریاچہ را با امرا و وزرا و ارکان دولت و مقرّبان بارگاہ
سلطنت اختصاص دادند و محافل فیض بخش بہجت فزا انعقاد
یافتہ در برابر ہر مجلس چہار طاقہا افراشتہ استادان نجار و ہندسان
نادرہ کار بفنون غریبہ انواع ہیاکل پرداختہ چراغدانہا بر آن
تعبیہ کردند و ہمہ شب تا بصبح روشنان سپہر مینائی کہ مجلس آرایان
عالم علوی و بزم افروزان عشرت سرای ملکوتی اند بہزاران
چشم حسرت بر آن چراغان و مجالس بہشت نشان می نگریستند
و شہریار عشرت آئین محفل را ہمہ شب در آن مجالس روح افزا
سیر فرمودہ در ہر مقامی کہ دلنشین خاطر انور می شد آرام گرفتہ
صحبت پیرا بودند و نغمہ سرایان خوش آہنگ و مغنّیان
تیز چنگ بنغمات دلاویز و ترنمات شکر ریز غمزدای خواطر بودہ
گلرخان لالہ عذار از بادہای خوشگوار دماغ مجلسیان را تازہ و تر
میداشتند۔ القصّہ تا نُہ شبانروز محافل عیش و نشاط انعقاد
یافتہ داد خوشی و خوشدلی دادند (صفحہ ۵۵ - صفحہ ۱۵۵)

شاہ عباس کے زمانے میں ایک انگریزی سیاح ٹامس ہربرٹ ایران
آیا۔ اور دو برس (۱۶۲۷ء - ۱۶۲۹ء) وہاں مقیم رہا۔ اس نے اپنے سفرنامے
میں دو جگہ نوروزِ ایران کا حال لکھا ہے۔ اس نے تقریبًا وہی رسوم بیان
کی ہیں۔ جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ یعنی یہ کہ لوگ اُس روز عمدہ کپڑے پہنتے
ہیں۔ باغوں میں جاتے ہیں گاتے بجاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحفے
تحائف دیتے ہیں۔ گھوڑ دوڑیں ہوتی ہیں۔ مرغ لڑائے جاتے ہیں اور

دعوتیں ضیافتیں ہوتی ہیں۔ لیکن ایک دلچسپ بات جو اس نے لکھی ہے وہ یہ ہے۔ کہ جشن نوروز کے ایّام میں عورتوں کو پوری آزادی ہوتی ہے وُہ اُن ایّام میں بالکل پردہ نہیں کرتیں اور کھُلے منہ باغوں میں پھرتی ہیں۔ اور ہر قسم کی کھیل کُود میں حصّہ لیتی ہیں ؀

آجکل بھی ایران میں سب سے بڑا قومی تہوار نوروز ہی ہے۔ جو مسلسل تیرہ دن تک منایا جاتا ہے، تمام دفاتر اور مدارس تیرہ دن تک بند رہتے ہیں۔ شاہ دربار کرتا ہے اور امراء سلام کے لیئے حاضر ہوتے ہیں۔ ہر گھر میں صفائی اور آرایش نظر آتی ہے۔ پہلے دن ہر شخص عمدہ سے عمدہ پوشاک پہنتا ہے۔ تحویل آفتاب کے وقت گھر سے باہر کوئی نہیں نکلتا۔ ایک خوان سجایا جاتا ہے۔ جس میں شگون کے لیئے سات ایسی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ جن کے نام حرفِ سین سے شروع ہوں۔ بالعموم وہ سات چیزیں یہ ہوتی ہیں:۔ سرکہ، سیم، سماق، سیر، سمن، سکنجبین، سبزی سپند، ان کو ہفت سینِ نوروز کہتے ہیں، تحویل کے بعد گھر کا بزرگ بچّوں کو عیدی دیتا ہے اور سب سے بزرگ عورت ہاتھ میں سبزی لے کر باہر سے گھر میں داخل ہوتی ہے۔ یہ شگون اس لیئے ہوتا ہے کہ سال بھر گھر میں خرّمی اور رونق رہے، دوست آشنا ایک دوسرے کی ملاقات کو جاتے ہیں اور پھولوں۔ پھلوں اور مٹھائیوں کے تحفے تقسیم کرتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں عید کے موقع پر مبارکباد کے لیئے عید کارڈ بھیجے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہاں لوگ نوروز کے کارڈ ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں۔ سرکاری دفاتر پر جھنڈے لہرائے جاتے ہیں اور بازاروں اور دکانوں کی آرایش کی جاتی ہے۔ آخری یعنی تیرھواں دن گھر میں بسر کرنا منحوس سمجھا جاتا ہے

اُس روز لوگ سارا دن باہر باغوں میں یا ندیوں پر گزارتے ہیں ۔ اس دن کا نام " سیزدہ بدر" ہے ؂

بمبئی کے پارسی بھی نوروز مناتے ہیں لیکن کسی خاص اہتمام سے نہیں ۔ وہاں پارسیوں کے تین فرقے ہیں اور تینوں کا نوروز مختلف ہے ایک فرقہ " تقویم شاہنشاہی" کی رو سے نوروز مناتا ہے ، یہ نوروز مسلمانوں کے تہواروں کی طرح ایک موسم سے دوسرے موسم میں دورہ کرتا ہے ۔ آجکل وہ ستمبر میں ہے ، دوسرا فرقہ " تقویم قدیمی" کا نوروز مناتا ہے ۔ یہ نوروز ہمیشہ ماہِ اگست میں آتا ہے ۔ تیسرا فرقہ " جمشیدی نوروز" کا پیرو ہے اور وہ وہی ایرانی نوروز ہے جو ۲۱ مارچ کو ہوتا ہے ۔ اس دن مذہبی لوگ آتشکدوں میں جاکر نماز ادا کرتے ہیں ۔ اور کسی قسم کی خوشیاں نہیں منائی جاتیں ؂

ہمارے نزدیک نوروز کی ادبی اہمیت بھی بہت بڑی ہے ۔ فارسی اور عربی میں بے شمار نظمیں اور قصیدے نوروز کی بدولت وجود میں آئے اگر فارسی شاعری میں سے ان قصیدوں کو خارج کر دیا جائے جو نوروز اور بہار کی کیفیت پر لکھے گئے ہیں ۔ تو ہم سمجھتے ہیں کہ فارسی ادبیات کے لئے وہ بہت بڑی حد تک افلاس کا باعث ہوگا ؂

محمد اقبال

فارسی شاعری اور مسائل حیات

بریڈلے[1] نے کہا ہے۔ کہ شاعری قوموں میں کلچر اور شایستگی پیدا کرتی ہے۔ اور زندگی کے اہم مسایل کے متعلق ذہن اور فکر کو ایک خاص نہج پر ڈھال دیتی ہے۔ ایسے اوقات میں جب انسانوں کی تھکی ہوئی روح دنیا کے مصائب اور تکالیف اور معاش اور معاشرت کے ہنگاموں سے نجات پاکر اپنے خلوت کدے میں اطمینان اور تسکین کی تلاش کرتی ہے تو اُسے شعر کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ شعر اس کو رسوم و قواعد کی اس بستی سے دُور، تخیل کے ایک اور بہشت آباد میں لے جاتا ہے۔ جہاں رُوح یکچند مدہوشی کے گھنے سایہ میں خوابِ شیریں کا لطف اُٹھاکر اور مادہ اور عناصر کی آلودگیوں کو آبِ زمزم سے دھوکر واپس آتی ہے۔

یہی نہیں۔ بلکہ شاعری اس سے کہیں زیادہ اثر کرتی ہے۔ قوموں کے کیریکٹر اور اخلاق کو ایک خاص رجحان بخشتی ہے۔ افراد کو کائنات اور اس کے تمام مسائل کے متعلق ایک خاص سبق سکھاتی ہے۔ موت، اور زندگی، جہالت اور عمل صالح، عشق اور عقل، یاس اور امید، خوشی اور غم، عفت اور پاکدامنی فضائل اور مکارم۔ غرض اس جہانِ آب و گل کے تمام مقاصد و مطالب کے متعلق ایک مختص النوع تصور پیدا کرتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ بقول پروفیسر نیو بولٹ[2] قوموں کی تاریخ کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ جو تاریخ ہی کی طرح اخلاق و عادات، تصوّر اور نظریات، اعتقادات اور خیالات کا آئینہ بن کر کسی قوم کی تہذیب اور کلچر کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

---

[1] Oxford Lectures on Poetry, 1914.
[2] New Study of English Poetry.

فارسی شاعری، اطالوی اور انگریزی شاعری کی طرح دُنیا کی جمیل ترین ادبیات میں شمار ہوتی ہے۔ ایران میں (اور تمام فارسی کے زیرِ اثر ممالک میں) شعر و سخن انسانی زندگی کے لوازم میں شمار ہوتے آئے ہیں۔

مختصر یہ ہے۔ کہ ایرانی زندگی (یا مشرقی زندگی) میں شعر و شاعری کی اہمیت اور کلام مقفی کا اثر اتنا گہرا نظر آتا ہے۔ کہ اس کے رنگ میں صاحب تاج و تخت اور گدائے بے نوا یکساں طور پر رنگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ ایک ایک شعر اور ایک ایک نظم نے سلطنتوں میں انقلاب پیدا کیے۔ ادنےٰ اور بے مایہ انسانوں کے قلوب میں اولوالعزمی کی چنگاریاں روشن کر دیں اور ان معاملات کا پُرامن تصفیہ کیا۔ جس سے خونچکاں تلواروں کی چمک اور نیزوں کی ہلاکت خیز جھنکار بھی عاجز آچکی تھی۔

حافظ کا دیوان غیب کی زبان بن کر، نامعلوم مستقبل کا پتہ اسی طرح دیتا رہا۔ جس طرح کسی صحرا میں چلنے والے قافلے رات کے ستاروں سے رہنمائی حاصل کیا کرتے ہیں[1]۔

شعر و شاعری کو ایرانی زندگی سے جب اس درجہ وابستگی اور تعلق ہے۔ تو یہ سوال غالباً غیر حق بجانب نہ ہوگا۔ کہ فارسی شاعری نے کلچر اور زندگی پر کیا اثر ڈالا؟ اس شاعری کا مطالعہ زندگی کے مسائل کے متعلق کیا حل پیش کرتا ہے؟ اور بالآخر یہ کہ اس سے اجتماعی ذہنیت اور تصوّر قومی میں کیا نمایاں خصوصیات پیدا ہوئیں۔ جن کو ہم خاص طور پر فارسی شاعری کا رہینِ منت خیال کریں

---

[1] پروفیسر براؤن جب شیراز میں وارد ہوئے۔ تو انہوں نے دیوان حافظ سے فال لی۔ انہوں نے اپنی کتاب A year amongst the Persians میں بہت سے واقعات ایسے لکھے ہیں۔ جن میں بڑے بڑے بادشاہوں نے دیوان حافظ سے رہنمائی حاصل کی۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے تمہیداً یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلچر اور ادبیات کا بھی ایک عجیب چکّر ہے جن کے آغاز کا اور فعل و انفعال کے دوران کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ کلچر ادبیات کی پیداوار میں ممد ہوتا ہے۔ یا ادبیات سے کلچر کے ایک خاص اسلوب کی تخلیق اور پرورش ہوتی ہے ؟ اس کا فیصلہ کن جواب دینا تو شاید مشکل ہی ہوگا۔ تاہم تصفیہ بین الامرین کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اکثر اوقات ادبیات قوموں کے کلچر کی تشکیل میں بہت بڑا حصّہ لیتے ہیں اور وہ فطری اور نسلی خصایص جو جماعتوں میں موجود ہوتے ہیں۔ ادبیات سے متأثر ہو کر ایک نئے قسم کا تصوّر زندگی پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں۔ کہ اقوام کے فطری میلانات انجامِ کار علم و ادب پر اپنا اثر ڈال دیتے ہیں۔ اور کلچر اور ادبیات ایک ہی حقیقت کے دو رُخ بن جاتے ہیں ؀

ایران ہزار ہا سال سے ایک خاص قسم کے کلچر کا گہوارہ چلا آیا ہے۔ ایران کے طبعی اور جغرافیائی حالات، آب و ہوا، موسموں کا تغیّر، شہروں اور بستیوں کے محلّ وقوع، پہاڑوں اور دریاؤں کے خصایص، رسوم و رواج کی رنگا رنگیاں، ذہن و فکر کے تجلّیات۔ سب کی سب ایک خاص نوعیت اور کیفیت رکھتی ہیں۔ یہ وہ گہری اور عمیق حقیقتیں ہیں۔ جو ایرانی زندگی میں خون، رگ و پوست اور خلط و مزاج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کو عارضی طور پر دبایا جا سکتا ہے۔ لیکن فنا نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ان کو نئے رنگ و روغن اور نئی صورت سے ایک دوسری وضع میں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کا ہیولیٰ اور مادّہ نہیں مٹ سکتا۔ قومیں ایسی ہی رہی ہیں۔ اور ایسی ہی رہیں گی۔ ان کی زندگی کا دریا دھیرے دھیرے بہتا رہے گا۔ ان میں

سیلاب اور طوفان آتے رہتے ہیں - جو عارضی طور پر ان کی گذرگاہوں کو تبدیل کر دیتے ہیں - لیکن حیاتِ قومی کا زندہ رود اور جیحوں اور فرات جیسا ہزار سال قبل تھا - آج بھی وہی ہے اور ہزار سال آئندہ بھی شاید ایسا ہی رہیگا ~

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی

عربوں نے ایران پر حملہ کیا - اور فتح کر لیا - عرب ایک بہادر اور عملی قوم ہے - اس کو خالی خولی باتوں سے نفرت ہے - وہ عمل کی گرمی اور عزم کی سردی کی قائل ہے - عربوں کے اونٹ ہزاروں میلوں تک بے آب و علف، دوڑ سکتے ہیں - ان کے تصورِ حیات میں کوئی الجھن نہیں - کیونکہ وہ ایک ایسے ملک میں بستے ہیں - جہاں سر پر آسمان ہے اور نیچے ریت! وسیع ریت! نہ ختم ہونے والی ریت! آسمان اور زمین کے درمیان اس کے نظریہ اور اس کی نظر کو متاثر کرنے والی کوئی چیز موجود نہیں - نہ ہمالہ ہے نہ دماوند، نہ گنگا ہے نہ فرات، نہ گھنے جنگل ہیں نہ اونچے پربت -- ! اس کا مطمح نظر وسیع مگر الجھنوں سے خالی ہے پس وہ ماوراء الانسان اور ماوراء الخارج اگر کسی اور چیز کو مان سکتا تھا - تو وہ شاید خدائے واحد کا تصور ہے - جس سے اسلام اور قرآن نے اسے روشناس کر دیا +

ایران کی گذشتہ تیرہ سو سال کی زندگی درحقیقت دنیا کے ایک عظیم الشان اور حیرت انگیز تجربہ کا نمونہ پیش کرتی ہے - جس میں ایرانی تفلسف اور عربوں کی عملیت، ایرانی انفعالیت اور عربی فعلیت کا عجیب و غریب امتزاج ہوا اور اس میں کچھ شک نہیں - کہ اگرچہ آج ہم باعتبار نتائج اور موجودہ قلب ماہیت کے، اس خوشگوار امتزاج کے ثمرات سے دانستہ تغافل اور تجاہل

برت رہے ہیں۔ لیکن تاریخ کا تجزیہ ثابت کر رہا ہے۔ کہ دنیا کی تہذیب اور شایستگی میں شاید اس سے بہتر نتائج کسی ملک اور کسی سرزمین میں حاصل نہ ہوئے ہوں گے۔ جن سے ایرانی تاریخ کا دامن گذشتہ تیرہ صدیوں میں مالامال نظر آتا ہے ؂

مغربی تحقیق اور ریسرچ جہاں بقول علامہ شبلی 'ایک کشت زعفران' کا درجہ رکھتی ہے۔ وہاں اس کا یہ مجموعی مقصد کچھ ناگوار اور غیر منصفانہ بھی ہے کہ اس سے مشرقی اقوام میں نسلی تفریق اور وطنی اختلافات کا دروازہ زیادہ کھلتا جاتا ہے۔ ایرانی قومیت کو عربی مذہب کے خلاف صف آرا کرنا اور تاریخ کے محض معمولی اور ناقابلِ ذکر واقعات کو نمایاں کرتے ہوئے ترکی عصبیت اور ایرانی وطنیت کو اُبھارنا اس تحقیق کا ایک مشئوم اور مذموم پہلو ہے۔ مثال کے طور پر کاونٹ گوبنیو وغیرہ نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے۔ وہ مستحق مدح ہونے کے باوجود ہمارے لئے موجبِ شکایت بھی ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے۔ کہ ایرانیوں کی لطافتِ طبع اور ذہانت نے عربی قوتِ عمل کے ساتھ مل کر انسانی شایستگی کے فروغ اور ترقی کے لئے اتنا دلکش اور شاندار معجون تیار کیا ہے۔ کہ اس کی مثال شاید کہیں اور نہیں ملے گی ؂

ثبوت اس کا یہ ہے۔ کہ اگرچہ اسلامی فتوحات کا سیلاب چین سے سپین تک اور قطب شمالی سے جاوا اور سماٹرا تک بڑھا۔ جس میں اسلام اور عرب کی پیدا کی ہوئی قوتِ عمل نے سب سے زیادہ کام کیا۔ لیکن تہذیبی اور علمی کام بیشتر ایرانیوں کے ہاتھوں انجام پایا۔ علامہ ابن خلدون کے بقول عربی کی بیشتر تصانیف ایرانیوں کے قلم سے نکلیں اور علوم و فنون اور شعر و سخن

میں نہ صرف عربی ممالک، ایران سے متاثر ہوئے بلکہ خود ترکی اور ہندوستان کے لٹریچر پر نہایت وسیع اثر پڑا۔ پس ایرانی ذہن وفکر کے کارناموں کو اسلام کے طفیل اتنا وسیع میدانِ عمل میسّر آیا۔ جتنا شاید خود ساسانیوں کے زمانے میں بھی نصیب نہیں ہُوا ہوگا ؛

فارسی شاعری بھی اسی 'مخلوط قسم کے تصوّر' کی آئینہ دار ہے جس میں بلاشبہ ایرانی خصوصیّات جزوِ غالب کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن اسلامی اور عربی اثرات نے اس تصویر کے خط وخال کو نیا رنگ اور نیا روپ بخشا ہے ؛

فارسی شاعری کا رجحان روحانی ہے

(۱) خدا کی وحدت کا یقین

فارسی شاعری کا مجموعی مطالعہ دلوں میں خدا کی ہستی کا یقین پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ انسانوں کے لئے لایق پرستش رہی ہے۔ اور پیکرِ خاکی کے لئے تاریخ کے ہر مرحلے میں اپنے معبود کی تلاش اور خوشنودی ایک محبوب جستجو رہی ہے۔ لیکن فارسی شاعری کا خدا نہایت پیارا خدا ہے۔ دُنیا اس کی طرف یوں کشش پر مجبور ہے۔ جس طرح عاشق محبوب کی طرف کھچا ہُوا چلا جاتا ہے۔ جس طرح سپنوزا کے نزدیک انسانی سعادت کا آخری درجۂ کمال فنا فی اللہ ہونا ہے۔ اسی طرح فارسی شعرا کے خیال میں استکمال کا آخری مرحلہ ذاتِ باری میں مدغم ہوجانا ہے ؛

خُدا کی ذات یہی نہیں۔ کہ واحد ہے۔ بلکہ اس کی توحید کا صحیح معیار یہ ہے۔ کہ اس کے بغیر کچھ موجود نہیں۔ اگرچہ وحدتِ شہود سے بھی توحیدِ باری کا حق ادا ہوجاتا ہے لیکن حق یہ ہے۔ کہ وحدتِ وجود کے بغیر وحدانیت کا

تصور ناقص رہتا ہے۔ وہ ارسطو کا خدا نہیں۔ کہ محض علت العلل اور مبدءِ وجود ہے۔ جو بقول ڈیورنٹ "انگریزوں کے بادشاہ کی طرح بادشاہ تو ہے لیکن فرماں روا نہیں"۔ بلکہ غایت الغایات ہے۔ وہی اوّل ہے اور وہی آخر، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن! اس کی وحدت کا تصوّر 'دوئی' اور 'غیر' کے شائبہ سے پاک ہے ؎

غیر نقش غیر در جہاں نگذاشت	لاجرم عین جملہ اشیا شد

عراقی

فارسی شاعری کا خدا ایک محبوب ہے۔ جس کے عشق میں تمام ذرّاتِ عالم سرگرداں ہیں ؂

تصوّف نے اس محبوب کو مجاز کا لباس پہنایا۔ انسان عاشق بلکہ تمام اکوانِ ممکنات اس کے عشق میں والہ و شیدا ہیں۔ وہ محبوب مجازی کی طرح عاشقوں کے لئے کرشمہ باریاں کرتا ہے۔ کبھی التفات کے خندہ ہائے شکریں سے نوازتا ہے۔ کبھی عدم التفات سے پہلو بچا کر نکل جاتا ہے۔ کبھی نقاب میں رہ کر تجلّیات کی بارش کرتا ہے اور کبھی بے حجابانہ خرمنِ وجود کو خاک و خاکستر بنا دیتا ہے ؂

یہ تصوّف کا احسان ہے۔ کہ اُس نے مجازی عشق اور ہوس کاری کے رجحانات کو حقیقت اور عشقِ ایزدی کے تصوّر سے بدل دیا۔ صوفی شاعروں نے مجاز کے رنگ میں اپنے حقیقی محبوب کے عشق کے ترانے گائے اور چشم و ابرو کے کرشموں سے شاہدِ ازل کے حسن جمال آرا کی طرف رہنمائی کی ؂

Story of Philosophy, P. 81	۱ے

خدا اور خالق کی وحدت کے اس مضبوط عقیدہ کی بنیاد پر فارسی شاعری کا سارا رجحان روحانی ہے۔ عرفان کی منزل سے لے کر کمال اور فنا کے معراج کمال تک، شاعر کے پیشِ نظر ایک ہی غایت ہے۔ یعنی ذاتِ باری سے متحد ہونا انسان جب تک انسان ہے یعنی جب تک مادّہ کے عنکبوتی تار و پود کی الجھنوں میں اسیر ہے۔ ذاتِ باری سے متحد نہیں ہو سکتا۔

فارسی شاعری نے انسان کامل کا جو تصوّر اپنے سامنے رکھا ہے۔ وہ بھی روحانی مدارج کی تکمیل پا لینے والا انسان کامل ہوگا۔ جو عرفان کے تمام معارج سے بلند ہوتا ہوا روحانی ترقی کے بلند ترین زینے پر پہنچ جائیگا انسان کامل کی جملہ ترقیات، عشق کے ذریعے ممکن ہوں گی۔ نہ کہ عقل کے ذریعے، فارسی شاعری میں عشق اور عقل کی جنگ کا جو تصوّر موجود ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ عقل عشق کے مقابلہ میں ایک طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہی وہ عشق ہے۔ جو تمام ترقی اور ارتقا کا باعث ہے۔ یا رومی کے الفاظ میں عشق "اصطرلاب اسرار خدا" ہے۔ جس سے دانش اور عرفان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ وہ دانش نہیں۔ جو عقلیت[1] کی پیداوار ہے۔ بلکہ یہ دانش سر چشمۂ ایمان ہے۔ انسان اپنی منزل تک اسی عشق یا سرچشمۂ ایمان کے ذریعے پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ برگساں نے ثابت کیا ہے۔ عقلیت[1] انسان کو اس کی اصلی منزل سے دُور لے جاتی ہے۔

فارسی شاعری انسان کے سامنے جو روحانی منزل پیش کرتی ہے۔

---

[1] Intellect.

اس کے لئے وہ عشق لازمہ حیات ہے۔ جو خلود کا متقاضی ہو۔ یہی وُہ صفت ہے۔ جسے حافظ "آتش دل" کہہ کر پکارتے ہیں ؎

ازاں بدیرِ مغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دلِ ماست

ایمان اور ایقان کے اس ذوق عام کا ہی اثر تھا۔ کہ فارسی شعرا اور حکما بھی، تشکیک اور تردّد سے بہت کم آشنا رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ خیام اور بعض دیگر شعراء نے جزواً ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے لا ادریت مترشح ہوتی ہے۔ لیکن مولانائے روم کے ہمہ گیر اثر نے اس کی جڑوں کو پختہ نہ ہونے دیا۔ رومی ایمان و ایقان کے فروغ کے لئے شک کے قایل ہیں۔ لیکن وہ بھی ایقان کی برتری ثابت کرنے کے لئے! چنانچہ فرماتے ہیں ؎

تا نباشد راست کے باشد دروغ
آں دروغ از راست می گیرد فروغ

خدائے واحد کی ذات میں یقین کامل، عقل کے مقابلہ میں فوقیت عشق (یعنی سرچشمۂ ایمان) کا اعتقاد اور نبی کی منظہریت کا گہرا عقیدہ۔ فارسی شاعری میں اس درجہ جاری وساری ہے۔ کہ ہم کسی دیوان، کسی مثنوی بلکہ کسی قصیدہ تک کو بھی اس سے خالی نہیں پاتے۔ حمد باری، مناجات اور نعت عام مثنویوں میں ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نظامی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اسرار سے مخزن اسرار کو شروع کیا۔ پھر ان کے تتبع کرنے والوں نے ہمیشہ اس رسم کو قایم رکھا۔

فارسی شاعری کے تمام شاہکار عشق، روحانیات اور فنا کی منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور شک اور تردّد پیدا کرنے کی بجائے ایمان کی طرف

متوجہ کرتے ہیں ۔

فارسی شاعری میں مطمح نظر کی وسعت

فارسی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس کی مجموعی اپیل وطنیت، نسل، قومیت اور مذہبی تنگ نظری کے تصوّر کے خلاف ہے یہ امتیاز اس درجہ عام ہے۔ کہ خود حُسن کے احساس کے بارے میں فارسی شاعری نے کسی محدود مظہر حسن کو اپنی ستایش کا موضوع قرار نہیں دیا بلکہ حُسن اور جمال کے ذوق کو ہر حسین وجمیل حقیقت تک وسیع کر دیا ۔ ایرانی شاعر، ورڈز ورتھ کی طرح تمام کائنات اور نیچر کو حُسن وجمال کا مرقّع خیال کرتا ہے ۔ بلکہ تمام نیچر میں ایک عالمگیر روح کو جاری وساری پاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے کسی ایک ندی، کسی ایک پہاڑ، کسی ایک چشمۂ رواں، کسی ایک پھول، کسی ایک محبوب کی یاد سے اپنی شاعری کو محدود نہیں کیا ۔ بلکہ اس نے اپنے احساسِ حسن کا وہ خلاصہ پیش کیا ۔ جو ہر جمیل و حسین چیز پر صادق آسکتا ہے ۔

فارسی شاعری کے اس پہلو پر اعتراض بھی کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ اعتراض بیجا ہے ۔ کیونکہ یورپ کے شعرا کی طرح ایک ایک فرد، ایک ایک پہاڑ ایک ندی کی تعریفِ حسن ایشیائی شاعر کی فطرت کے خلاف ہے وہ تمام کائنات میں حُسن کو جلوہ گر پاتا ہے ۔ اور تمام دنیا کے محبوب اس کے محبوب سے مشابہ ہونے کی وجہ سے، حُسن عام کا ایک جزو ہیں ؎

یک چراغ است دریں خانہ واز پرتوآں
ہر طرف می نگری انجمنے ساختہ اند (فغانی)

اگر کوئی مغربی شاعر کسی ندّی کے کنارے بیٹھتا ہے۔ تو وہ اپنے تاثرات
کا ایک نقشہ اس رنگ میں کھینچتا ہے۔ کہ اس ندی کی رفتار، اس کے ملحول
میں سبزہ زار کی دلکشی، اور پانی کے ترنم شیریں کی ایک تصویر بناتا ہے ؛
لیکن ہمارا شاعر اس تأثر کو ان حدود سے محدود نہ کرتے ہوئے ایک
عام تصویر کھینچے گا۔ جو نہ محض نیکر[۱]۔ یا کسی اور ندّی کے آس پاس رہنے
والوں کو متاثر کر سکے گی۔ بلکہ ہر آب رواں اور ہر جوئے کہسار کی روانی کے
حسن کی دلفریبیاں اس سے نمایاں ہوں گی ؛
یہی وجہ ہے۔ کہ فارسی شاعری میں جغرافیائی مناظر کی تصاویر بہت
کم موجود ہیں۔ بلکہ شعراء نے اپنی اپنی بستیوں کو بھی کما حقہٗ زندہ کرنے کی
کوشش نہیں کی۔ جن کے سبزہ زاروں میں انہوں نے اپنے رنگین تصورات
کی پرورش کی۔ آج شیراز کا نام جب ہم سنتے ہیں۔ تو ہمارے چشم تخیل کے
سامنے عجیب و غریب پُر رونق مرغزار، حسن اور رنگ و بو کے کھل جاتے ہیں
لیکن حافظ اور سعدی اور عرفی نے بھی اپنی اُس جنّت کا وہ نقشہ نہ کھینچا جس کا
استحقاق شیراز ایسے مردم خیز خطّے کو حاصل ہے ؛
حافظ نے مصلّی، اور رکن آباد اور تنگ الہ اکبر کا ذکر بھی کیا۔ تو کچھ آمد سخن
میں۔ اور اس طریق سے کہ اس سے "بے اعتنائی" کا ترشح ہوتا ہے۔ حافظ
نے کہا بھی تو یہ کہ ؎

خوشا شیراز و وضع بے مثالش
خداوندا نگہ دار از زوالش

نظیری اپنے نیشاپور کو یوں یاد فرماتے ہیں ؎

---

[۱] ایک ندی کا نام Neeker

اخراج مغل خواہم و تاراج قزلباش کز ہند بر ندم بہ نشاپور فروشند

اسی رجحان کا کسی حد تک یہ اثر معلوم ہوتا ہے ۔ کہ وطنی شاعری کا بھی ایران میں فقدان نظر آتا ہے ۔ فردوسی کا شاہنامہ ایرانی وطنیت کے جذبات کا آئینہ دار ہے ۔ لیکن اس کا اظہار بھی کس منقطع[1] طریق سے ہُوا ۔ خاقانی کا ایوان مدائن ۔ سعدی کا مرثیہ بغداد اور اس نوع کی چند اور نظمیں اس کلیہ کی مستثنیات میں سے ہیں ۔ اور اس بات کو ثابت کرتی ہیں ۔ کہ فارسی شاعروں نے مجسّم[2] کی بجائے مجرّد[3] حقایق کو اپنے سامنے رکھا ہے ۔

اسی وسعتِ نظر کے زیر اثر ہم دیکھتے ہیں ۔ کہ فارسی شاعری مذہبی فرقہ پرستی اور تنگ نظری کی سخت مخالف ہے ۔ خواہ اس چیز کو آپ ایرانی طبیعت کا عدم تقشف کہیں یا تصوّف کا 'لبرلزم' ۔ لیکن یہ واقعہ ہے ۔ کہ فارسی شاعری کے مطالعہ سے تعصّب اور تنگ نظری کو بہت ضعف پہنچتا ہے ۔ اسلامی ممالک میں علماء کو جو زبردست اقتدار ہمیشہ سے حاصل رہا ہے ۔ اس کے پیش نظر یہ بات عجیب و غریب نظر آتی ہے ۔ کہ ہمارے فارسی شعراء بعض اوقات کفر و دین اور کعبہ و بتکدہ کی قیود سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں ۔ اور عوام کو وسعتِ مشرب کی تلقین کرتے ہیں ؎

ہرگز مگو کہ کعبہ ز بتخانہ خوشتر است
ہر جا کہ ہست جلوۂ جانانہ خوشتر است (عرفی)

گفتگوے کفر و دین آخر بیکجا می رسد
خواب یک خوابست امّا مختلف تعبیر ہا (صائب)

فارسی شعراء نے کعبہ کے مقابلہ میں بتکدہ اور دَیر کو جس جس طریق سے سراہا ہے

1. Detached. 2. Concrete. 3. Abstract.

اور اس کے تفوق کے جو جو پہلو نکالے ہیں۔ ان کو پڑھ کر فارسی شاعری کے اس وصف سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ ایران میں (یا عالم اسلام میں) عام مذہبی بے تعصبی کو بہت پسند کیا جاتا تھا ؛

(۲) فارسی شاعری میں یاس و ناامیدی

فارسی شاعری کی دوسری سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں امید کی بجائے یاس اور رجا کی بجائے "قنوط" کا اثر[1] ہے۔ اس کے پڑھنے سے زندگی اور اس کے جملہ مظاہر کے بارے میں یک گونہ مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ مشرقی شاعر کے نزدیک تخلیق عالم ایک حادثہ ہے۔ جس کا مقصد خالق کے نزدیک تو شاید کسی مصلحت پر مبنی ہو۔ لیکن اس کمزور، مجبور، اور مقہور مخلوق کی نظروں میں یہ ایک ایسا تجربہ ہے۔ جس کا آغاز غم ہے اور انتہا تو غم ہے ہی کیونکہ وہ فنا اور عدم پر منتج ہوتی ہے ؛

یاس اور فنا کا یہ اثر اور بھی نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق تغیّر و اصلاح کے ان ہنگاموں سے ناآشنا ہے۔ جن میں انقلاب کے ہچکولے زندگی کے جہاز کو کبھی ساحل پر پہنچا دیا کرتے ہیں اور کبھی طوفان خیز موجوں کی کشمکش میں دھکیل دیا کرتے ہیں۔ مشرقی زندگی ایک ہموار دریا کی طرح ہے۔ جس میں سیاسی انقلابات کے انتہائی تحرّکات کے باوجود ایک یکسانی اور ہمواری سی نظر آتی ہے۔ عوام یعنی جمہور ہمیشہ یکرنگی اور یکسانی میں

---

[1] یہ کوئی فارسی شاعری ہی کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ ازمنہ متوسط میں عام انسانی رجحان یہی تھا۔ ملاحظہ ہو *The Waning of Medieval Ages* کا دوسرا باب۔ جو اسی موضوع پر ہے ؛

رہتے ہیں۔ خواہ سیاسی دنیا میں لاکھوں تبدیلیاں کیوں نہ واقع ہو جائیں۔

جمال الدین اصفہانی کا قصیدہ "آشوب روزگار" کے بارے میں انسانی زندگی کی تلخیوں کا مکمل مرثیہ ہے۔ ان کے خیال میں حیات اگرچہ بظاہر شراب انگوری ہے۔ لیکن اس کے قوام میں زہر ہلاہل موجود ہے۔ اصفہانی کو تعجب ہے۔ کہ کیونکر کوئی عاقل ان ناگوار حوادث کے باوجود دنیا پر تسلّی کا اظہار کر سکتا ہے۔ جس میں موت حاکم ہے اور آفتیں ہر وقت تقدیروں پر اثر انداز ہونے کے لیئے آمادہ رہتی ہیں۔ جس میں کمال کے ساتھ زوال اور طلوع کے بعد غروب لابدی ہے۔ چاند میں بہت خوبیاں ہیں۔ لیکن محاق کا نقص اس کے شامل حال ہے۔ اور سورج اگرچہ دنیا کو اپنی روشنی سے منوّر کرتا ہے۔ لیکن کسوف (گرہن) کا عارضہ اس کے لئے وجہِ تشویش بنا ہؤا ہے۔ غم والم کی اس بستی میں جسے لوگ دنیا کہتے ہیں۔ اہلِ کمال ہی پر ساری آفتیں ٹوٹتی ہیں۔ شمع ہر صبح بجھ جاتی ہے۔ لالہ چند گھنٹوں کے اندر اندر پژمردہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ باغ دیکھتے دیکھتے اجڑ جاتے ہیں۔ اور مہتاب چند روز آب وتاب کے بعد گھٹ کر معدوم ہو جاتا ہے۔

شعرائے فارسی کے نالۂ یاس میں دو باتیں بہت نمایاں ہیں۔ اوّل یہ کہ دنیا عارضی اور ناپائدار ہے۔ اور دوم یہ کہ زمانہ آسمان اور فطرت انسانی کی بنیاد شر پر رکھی گئی ہے[1]۔ صائبؔ فرماتے ہیں ؎

بامید اقامت دل باسباب جہاں بستن
بود شیرازۂ غفلت باوراق خزاں بستن

---

[1] یہ خیال حقیقۃً ایک مجوسی عقیدہ سے ماخوذ ہے۔

غنیؔ کاشمیری کہتے ہیں ؎

نکیہ تا چند کنی بر نفسے ہچو حباب　　　چشم بکشای کہ ہستی گرہے بر باد است

صائبؔ اسی بے ثباتیِ عالم کے مضمون کو یوں مؤثر بناتے ہیں :-

از نسیمے دفتر ایام برہم می خورد
از ورق گردانیے لیل و نہار اندیشہ کن

دنیا کی طرف سے یہ کھٹکا چھوٹے سے لے کر بڑے شاعر تک سب کے دِل میں موجود ہے۔ اس خیال کے اظہار کے لئے جتنے مؤثر پیرایہ ہائی بیان اختیار کئے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ کسی اَور عقیدہ اور تصوّر کے لئے پیدا نہیں ہو سکے۔

مغرب میں شوپن ہار کو فلسفۂ غم کا پیغمبر مانا جاتا ہے۔ اس کے تصوّر کے چند اجزاء یہ ہیں: کہ یہ زندگی غم و الم کی زندگی ہے۔ کیونکہ اس میں احتیاج ہے۔ انسان اپنی آرزوؤں تک پہنچ نہیں سکتا۔ اور اگر بالفرض ایک آدھ خواہش پُوری بھی ہو جائے۔ تو انسانی آرزو کا انجام ہی کچھ نہیں۔ ہر آرزو تکمیل کے ساتھ ساتھ اَور نئی آرزوؤں کی تخلیق کرتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ناکامیاں غم پیدا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ علم بھی اس غم فراواں کو نہیں مٹا سکتا۔ بلکہ

"The man who is gifted with genius suffers most of all"

"He that increaseth knowledge increaseth sorrow."

تمام سفرِ ہستی ایک کش مکش، ایک جنگ، ایک پیکار میں گذرتا ہے۔

تا آنکہ موت کا دروازہ کھلتا ہے۔ لیکن کسے معلوم کہ اس عارضہ وجود کی نحوستیں اس نئی زندگی میں کن کن مصائب کا سرچشمہ بنتی ہیں ؛

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ شوپن ہار کا فلسفہ از سرتاپا فارسی شاعری کی ایک تفسیر ہے۔ جس کی جزئیات کو کسی قدر مرتب اور مربوط کر لیا گیا ہے جہاں تک دنیا کی بے ثباتی کا تعلق ہے۔ یہ افسانۂ غم چنداں اوپرا نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ موت کی چیرہ دستیاں ، پھولوں کی پژمردگی، لالہ رخوں کی جوانامرگی، لیل و نہار کے انقلابات انسانی دماغ کے توازن کو بگاڑنے کے لئے کافی سے زیادہ مؤثر اسباب ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس "یاسیہ شیون" کا وہ حصہ بہت دلگداز ہے۔ جس میں خود انسانی فطرت کی خرابی کو زیربحث لایا گیا ہے۔ آسمان کی شکایت اور خصوصاً اہل کمال سے مخالفت کا مضمون کچھ اس انداز سے دہرایا گیا ہے۔ کہ واقعی انسان اور زندگی دونوں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے ؛

غنیؔ کاشمیری کو شکایت ہے۔ کہ آسمان بے تمیز ہے۔ جو اہلِ کمال کی قدر کو خاک میں ملا دیتا ہے ؎

گوہر قدر عزیزاں را سپہر بے تمیز
توتیا سازد وسے در چشم نابینا کند

دنیا قابلِ نفرت جگہ ہے۔ دلیل یہ کہ جو جاتا ہے۔ واپس نہیں آتا ؎

وضع زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رُو پس نکرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت (کلیمؔ)

دنیا ، بحرِ حوادث میں ایک شکستہ کشتی سے مشابہ ہے۔ اس میں کسی کو آرام و قرار نہیں مل سکتا ؎

دنیا شکستہ کشتئ بحر حوادث است

در کشتئ شکستہ کسے آرمیدہ نیست (قابل)

دنیا، وہ عروس ہے۔ جو پہلے شوہر کو قتل کرتے ہوئے نت نئے شوہر کی تلاش میں رہتی ہے ؎

مرد عاقل بہ طلبگاریے دنیا نرود

کیں عروسے است کہ شو کشتہ و شوہر خواہد (سالک یزدی)

دنیا، ایک باغ ہے۔ جس میں میوۂ پختہ صرف خامکاروں اور ناکسوں کو دیا جاتا ہے ؎

میوۂ پختہ دریں باغ بخاماں بدہند

پختگاں را دہد ایام اگر خامے ہست (سالک یزدی)

حافظ جیسے اہل کمال بھی جفائے روزگار کے شاکی ہیں ؎

ابلہاں را ہمہ شربت زگلاب و قند است

قوت دانا ہمہ از خون جگر می بینم (حافظ)

طالب آملی کے نزدیک خود ہنر ہی بے قدری کا سبب ہوتا ہے ؎

گفتند کہ بود ت بجہاں رہزن اقبال؟

نالیدم و گفتم کہ ہنر بود ہنر بود! (طالب)

اس بے مہری اور بے قدری کے خراب آباد میں بسنے والے بھی ایسے ہی بے مہر، جفاجو، بے وفا، بلکہ بے سبب آزار ہیں۔ صائب اس حقیقت سے اس درجہ متاثر ہے۔ کہ قیامت کے دن بھی اپنے ابنائے نوع کو نہیں دیکھنا چاہتا ؎

مرا ز روز قیامت غمے کہ ہست این است کہ روئے مردم عالم دوبارہ باید دید (صائب)

سالکؔ یزدی یوسف کی طرح زندانِ چاہ میں اسیر رہنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن بنی نوع کے قافلہ کے ہمراہ نہیں جانا چاہتے ؎

سالکؔ تو یوسفی و رفیقاں تمام گرگ
در چہ بمان و ہمرہِ ایں کارواں مباش

غنیؔ کاشمیری نے عمر بھر ترک تعلق کا مسلک اختیار کئے رکھا۔ لیکن اس عزلت کے باوجود اُن کے دل میں ابنائے زمان کے نفاق کا بہت گہرا اثر موجود ہے ؎

غبارِ خاطرم از اہلِ عالم جمع شد چنداں
کہ می خواہم بہ پیشِ روئے خود دیوار بردارم (غنیؔ)

صاف دلی اور خلوص اس درجہ بے کار ہیں۔ کہ طاہر وحید اسے کامیابی کے منافی خیال کرتے ہیں ؎

صاف دل گشتن جہاں را دشمنِ خود کردن است
سنگ چوں آئینہ شد بیند بہ ہر سنگے شکست
قصۂ یوسف و بے مہریِ اخوان سند است
کہ برادر بہ جہاں یار برادر گردد (سالکؔ یزدی)

زندگی سے دلچسپی کی کمی کا یہ احساس نہ صرف قدیم شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ ہمارے اپنے زمانے میں بھی اس کا اثر نمایاں ہے۔ ایران کے جدید شعراء میں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں[۱]۔

---

[۱] اس موضوع پر بہارؔ، ادیب پشاوری اور بعض اور جدید شعراء کا مناظرہ "سخنورانِ عصرِ حاضر" اور شعرائے دورانِ پہلوی میں ملاحظہ ہو۔

حافظ و خیام کا فلسفۂ غم

بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ حافظ اور خیام نے فارسی شاعری میں امید اور رجا کا پیغام دیا ہے لیکن یہ خیال غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں شعراء کے پیغام کا خلاصہ صرف اس قدر ہے۔ کہ چونکہ دنیا بے ثبات ہے اور غم والم اس کا آئین مسلّم ہے۔ اس لئے اس کا ماتم کرنے کی بجائے مے و مطرب سے دل لگا لینا چاہیئے۔ زندگی ایک معمّہ ہے جس کی تعبیر نہایت مشکل ہے علم باوجود اپنی تمام اسرار کشائیوں اور زھد باوجود اپنی تمام پاکبازیوں کے راز حیات تک نہیں پہنچا سکتا۔ پس اس دنیائے فانی میں انسان کے لئے کوئی نسخہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ کہ جہاں تک بھی ممکن ہو عمر عزیز کو بے غمی اور آزادگی میں گذار دیا جائے؛

حافظ کے نزدیک دنیا کی مصروفیتیں دلچسپی کے قابل نہیں ؎

دمے باغم بسر بُردن جہاں یکسر نمے ارزد
بمے بفروش دلق خود کزیں بہتر نمی ارزد

دنیا چونکہ ناپائدار ہے۔ اس لئے اس کی بے ثباتی کا غم مئے و مینا میں ڈبو دیا جائے ؎

خیز و در کاسۂ زر آب طربناک انداز
پیشتر زانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز
عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

حافظ اس ہنگامۂ ہست و بود کو ایک خندۂ استغفار کا مستحق خیال کرتے ہیں اور علاوہ فطری غم والم کے، بے سروسامانی اور تنگدستی کی

مصیبتوں میں بھی خوش رہنے اور مے پینے کی تلقین کرتے ہیں ؎

ہنگامِ تنگدستی در عیش کوش و مستی
کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا

یہی خیال خیام کا ہے۔ جو زندگی کو محض نمود اور موہوم خیال کرتے ہیں۔ لیکن اس صورتِ حال سے دوچار ہونے کا علاج ان کے نزدیک یہی ہے۔ کہ غموں کو پاس نہ آنے دیا جائے اور مے و معشوق کی دلفریبیوں میں تلخی روزگار کو فنا کر دیا جائے ؛

یاس کے اسباب

فارسی شاعری میں غم اور یاس کی اس موجودگی سے قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایسا کیوں ہے جبکہ وجود کی ناگزیر حقیقت جسے عرف عام میں زندگی کا سہانا نام دیا جاتا ہے۔ مشرق و مغرب میں یکساں طور پر کارفرما ہے۔ ہر جگہ وہی تخلیق ہے، وہی صبح ظہور، وہی شامِ زندگی! جس طرح یورپ کا آفتاب طلوع ہوکر اپنی نورانی کرنوں سے فضائے عالم کو نورانی کرتا ہے۔ بعینہٖ وہی کیفیت مشرق میں ہوتی ہے۔ دریاؤں کا رُخ ہر جگہ پستی کی جانب ہے پہاڑوں میں ہر جگہ اونچائی اور وادیوں میں ہر جگہ سبزہ زار نظر آتے ہیں۔ پھر اس عام وحدت کی موجودگی میں کیا بات ہے۔ کہ مشرقی زندگی کی موسیقی میں جو غم پایا جاتا ہے۔ وہ مغرب میں نہیں پایا جاتا۔ اور جو درد کی لذت اور الم سے محبت اس دنیا میں محسوس کی جاتی ہے۔ شاید اس عالم کے لوگ اس سے آشنا نہیں ؛

ایرانی طبیعت اور تصوّف

حقیقت یہ ہے۔ کہ اہل مشرق (اور خصوصاً اہل ایران) میں دُنیا کی

بے ثباتی کا یہ گہرا احساس کچھ ان کی فطرت کا ایک حصّہ ہے۔ تصوّف جس کی ہزاروں خوبیوں کا قایل ہونا پڑتا ہے۔ جہاں تریاق ہے وہاں زہر بھی ہے۔ انسانی سیرت اور کیرکٹر کی تعمیر میں ایرانی یا اسلامی تصوّف نے نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس سے بہت سے فوائد بھی حاصل ہوئے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کے بعض مسائل ایرانی فطرت کے ساتھ کچھ اس درجہ ساز گار ہیں۔ کہ اس سے ایرانیوں کے کیرکٹر میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ عربوں کے مقابلہ میں ایرانی منفعل طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں عمل کی بجائے غور و فکر کی عادت زیادہ ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہوا۔ کہ تصوّف نے انہیں فنا، ترک خودی اور عزلت کی طرف مائل کر دیا۔ اور اس روش[1] سے شکست، خوف، نا اُمیدی اور مایوسی کے علاوہ اور کس شے کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟

غلط نظریہ سیاست

لیکن اس سے بھی زیادہ ایشیا کا جامد نظریہ سیاست، عوام اور جمہور کی طبیعت کو ڈھالنے کا باعث ہوا۔ اسلام نے بے شک ایک جمہوری سلطنت کا تصوّر پیش کیا۔ جس میں قوم اور ملک کا ہر ہر فرد دلچسپی محسوس کرتا تھا۔ عرب کے دُور دراز قبایل کا ایک ادنےٰ صحرا نشین اس حکومت کو اپنی حکومت سمجھتا تھا۔ اور اس کے نظم و نسق سے اپنے آپ کو اسی طرح وابستہ پاتا تھا۔ جس طرح خلیفۂ وقت، لیکن رفتہ رفتہ اسلامی خلافت میں مطلق العنان بادشاہتوں کا سا رنگ آگیا اور عوام اور جمہور کو اس کی تشکیل میں کوئی خاص دخل نہ رہا۔

سیاسی تمناؤں کی بربادی

جماعتوں میں فطری طور پر سیاسی آرزوئیں

---

[1] Attitude

پیدا ہوتی اور فروغ پاتی رہتی ہیں - یہ آرزوئیں کہیں پوری ہوتی ہیں - لیکن کہیں کچل دی جاتی ہیں - مشرق میں صدہا سال سے جو انداز سلطنت کا رہا ہے اس نے ان آرزوؤں کو عوام کے سینے میں ابھرنے نہیں دیا - نتیجہ یہ کہ ایشیائی فطرت تقیہ اور ضبط بے جا کی عادی ہوگئی ہے - جس میں جرأت اور آزادی کھلم کھلا مقابلہ اور بالجہر احتجاج کی بجائے ریاکاری، تقیہ اور خوشامد کے امراض پیدا ہوتے رہتے ہیں ؂

سیاسی تمناؤں کی اس بربادی کے ساتھ ساتھ جلد جلد انقلابات رونما ہوتے رہے - انہوں نے ایشیائی ذہنیت پر بے ثباتی عالم اور بے مہری روزگار کے نقوش کو سختی سے منقوش کر دیا ؂

ذرا غور کیجیئے - آج صفاریوں کی حکومت ہے تو کل سامانیوں کی - آج غزنویوں کا دور ہے تو کل غوریوں کا - کل جو صاحب تاج وتخت تھے - آج وہ گدائے شہر ہیں - کل جن کی ایک ایک بات پر درست اور بجا کے غلغلے بلند ہوتے تھے - آج لکد کوب حوادث سے خون کے آنسو رو رہے ہیں امیر خسرو کو دیکھئے - کم وبیش تین چار خاندانوں کے مدّاح اور قصیدہ گو رہے اور فارسی شاعری کے تذکروں میں صدہا شعرا ایسے ملیں گے - جنہوں نے اپنی عمر میں بے شمار انقلابات دیکھے اور ابھی ایک کی مدح نہ کرنے پائے تھے - کہ نظام درہم برہم ہوگیا - خیام نے اسی سے متاثر ہو کر لکھا ؎

این کہنہ رباط را کہ عالم نام است
آرام گہ ابلق صبح وشام است
بزمے است کہ واماندۂ صد جمشید است
قصرے است کہ تکیہ گاہ صد بہرام است

خیام کو دنیا کے ذرّے ذرّے میں انسانی خون۔ پوست اور ہڈیاں نظر آتی ہیں اور اس کے چپّے چپّے میں سینکڑوں عظمتیں مدفون معلوم ہوتی ہیں ؎

خاکے کہ بزیر پائے ہر حیوانے است
زلف صنمے و عارض جانانے است
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے است
انگشت وزیرے و سر سلطانے است

پے در پے سیاسی انقلاب

بہر حال ان پے در پے سیاسی تبدیلیوں نے قوم میں قناعت اور ترک دنیا کے خیالات کو تقویت دی۔ اس کے علاوہ بادشاہی کو دردسر اور تکلیف لاحاصل خیال کرتے ہوئے تجرید اور ترک تعلقات کی طرف شدید میلان پیدا ہوگیا۔ مال اور سرمایہ سے عام مخالفت پیدا ہوئی اور اس کا حصول وبال جان خیال کیا جانے لگا۔ شعراء نے اس مضمون کو کئی طریقوں سے باندھا۔ مثلاً

منعم از آسیب دوراں بیشتر دارد خطر
کشتیٔ پُر بار از طوفانِ دریا بشکند

مال کی کثرت باعث ازدیاد ملال ہوتی ہے

بود ملال بمقدار مال ہر کس را
بقدر روغن خود ہر چراغ می سوزد (صائب)

جہاں تک ممکن ہو بادشاہی اور اس کے ہنگاموں سے علیحدہ ہو کر اس میں سوائے دردِ سر کچھ حاصل نہیں ؎

بادشاہاں را میسّر نیست بر بالائے تخت آن بزرگیہا کہ در گہوارہ کودک میکند (صائب)

ابن یمین کے تمام اخلاقی قصیدے سعدی کے پند و نصائح، کمال اسمٰعیل کی ساری موعظت اسی ایک مرکزی خیال کے گرد جمع ہوتی ہے۔ کہ سلطنتوں کے کاروبار سے الگ رہنے میں ہی آرام ہے۔ غالباً اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کہ سلطنت اور بادشاہی کے خلاف یہ جذبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا۔ کہ احساس اور دردر کھنے والی طبایع کے نزدیک سیاسیات، اخلاص اور دیانتداری کا مشغلہ نہ تھا۔ ملکداری کا سارا نظریہ غلط اصول پر چل رہا تھا۔ شخصی سلطنتیں جمہوری احساس کی پرورش کی سخت مخالف تھیں اور غافل ایشیا ابھی تک جمہور کی طاقت سے آشنا نہ ہوا تھا۔ بچارے شاعر سمجھتے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔ لیکن کچھ تو ان کی فطرت صاف احتجاج سے نامانوس تھی اور کچھ یہ کہ انہیں ان امراض اور ان خرابیوں کا علاج نظر نہ آتا تھا +

اجتماعی احساس کی کمی

سلطنت بغداد پارہ پارہ ہوگئی۔ لیکن سعدی کے قصیدہ کے بغیر کھُلے احتجاج کی کوئی شکل نہ نکل سکی۔ قوم منگولوں کے سیلاب فتوحات میں بہہ گئی۔ لیکن کبھی اس عظیم الشان حادثہ کے اسباب پر غور نہ کیا گیا۔ جلال الدین محمد خوارزم شاہ نے منگولوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کیا۔ لیکن اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑتا +

بچارا انسان جن تکالیف میں مبتلا تھا۔ اس کے خلاف کبھی کوئی آواز نہ اُٹھی اور کیونکر اُٹھتی اس لئے کہ درباری شاعر اس زمانے میں بادشاہوں کے پراپاگنڈا کا فرض انجام دیتے تھے۔ سعدی نے انکیانو وغیرہ کو نصیحت کے ضمن میں مظلوموں اور بیکسوں کی دلجوئی کرنے کی تلقین کی لیکن مظلوموں کی آہوں نے کبھی کوئی اجتماعی صورت اختیار نہ کی۔ حالانکہ سب اچھی طرح

جانتے تھے۔ کہ بادشاہ رعایا کا خادم ہوتا ہے۔ اور اس کے سامان تعیش کے پیدا کرنے میں مزدور اور کسانوں کے خون کے چھینٹے رونق پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ انوریؔ کی زبان سے ایک مزدور نے عرصہ ہوا اعلان بھی کیا تھا ؎

درّ و مروارید طوقش اشک اطفال منست
لعل و یاقوت ستامش خون ایتام منست

اگرچہ مسلمان بادشاہوں کے عدل و انصاف نے رعایا کے آرام و آسایش کے لئے پوری پوری کوششیں کیں۔ اور علم و فضل کی ترویج میں جو جو کام کئے ان سے کتابوں کے اوراق لبریز ہیں۔ لیکن غلط نظریہ سیاست کی وجہ سے نت نئے انقلابات کا سدباب نہ ہوسکتا تھا۔ مذہب اور تصوف نے ان شخصی حکومتوں کی خرابیوں کو دُور کرنے میں بہت بڑا کام کیا اور یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ ان مطلق العنانیوں کے باوجود تصوّف نے ایشیائی سیرت کو پاک رکھنے میں عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا ۔

اب ضروری مسایل میں سے صرف ایک ہی بات ایسی رہ گئی ہے۔ جس میں ہمیں فارسی شاعری کا نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ فلسفی ہمیشہ سوال کرتا ہے۔ انسان کیوں پیدا کیا گیا ؟ تخلیق کا مقصد کیا ہے ؟ انسان کا آخری نصب العین اور مستقبل کیا ہے ؟

ان سوالات کے جوابات کے بارے میں فارسی شاعری بیشتر تصوّف کی رہین منّت ہے۔ صوفیانہ تعبیر یہ ہے کہ انسان ذات باری سے متحد تھا۔ شوقِ ظہور کائنات کے وجود کا باعث ہوا۔ چنانچہ دنیا معرضِ ظہور میں آئی۔

اور حضرت انسان کو اس کی حکمرانی عطا ہوئی لیکن ربانی فضا میں جو سرور اور محویت تھی۔ وہ اس جدائی میں کہاں ؟ انسان کو پھر جذب اور وصال کی خواہش ہوئی۔ لیکن اب ملاپ بڑی کوششوں سے ممکن ہوگا کیونکہ بقول نظیری ؎

برحمت اتّصال افتد چو پیوندے برید از ہم
بفرصت قطرہ دریا می شود چوں قطرہ شد دریا

اس جدائی[1] میں حضرت انسان سوز و گداز اور درد و کرب میں مبتلا ہیں۔ ہر لحظہ انتظار، عدم اطمینان اور بے قراری، دنیا کی کسی چیز سے تسلی نہیں ہوتی اس لئے کہ ایک گم گشتہ شے کی ہوس ہے۔ جو رومی کے بقول گلی گلی کوچے کوچے پھراتی ہے۔ لیکن اس کا ملنا بہت دشوار ہے ؎

سینہ دارم شرحہ شرحہ از فراق
تا چہ گویم شرح دردِ اشتیاق

اب اس "فردوس گم گشتہ" تک پہنچنے کے لئے عشق کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔ جو زندگی کا ایک مسلک ہے۔ اس میں مس وجود کو بالکل گداختہ کرنے کی تلقین کی جاتی ہے ؎

غش وجود باکسیر عشق زایل کن
کہ زر شود مست از کیمیای احمر ما

جب تک وجود ہے۔ محبوبِ حقیقی کا وصال ناممکن ہے۔ اس کو مٹانے اور

---

[1] جامی فرماتے ہیں ؎

چندا روزے کہ پیش از روز و شب	فارغ از اندوہ و آزاد از طلب
متحد بودیم با شاہِ وجود	حکمِ غیریت بکلّی محو بود
ناگہاں در جنبش آمد بحرِ جود	جملہ را از خود زخود پیدا نمود الخ

فنا کرنے کے لئے قوانین ہیں۔ جن میں عشق، ترک تعلق، فنا، ریاضت اور
خدمت ضروری قواعد ہیں ؛

عشق کے تمام مراحل و مقامات میں تصوّف کے وجد و حال اور دوسری
روحانی کیفیتیں پیشِ نظر ہیں۔ اس بارے میں فارسی شاعری گویا فقر کی منظوم
تفسیر ہے۔ اس کا اثر حقیقی سالکین و عارفین پر تو قدرتی طور پر ظاہر اور واضح
ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس نے عوام الناس کے تصوّر پر بھی بہت گہرا
اثر ڈالا ہے ؛

فارسی شاعری میں عوام النّاس کی تربیت کے لئے جو اصول موجود
ہیں۔ ان میں بیشتر مذہب سے متعلق ہیں لیکن بے شمار قواعد و شرائط ایسے
ہیں۔ جن میں خالص صوفیانہ اثرات کار فرما ہیں۔ علم الاخلاق میں اعمال کا
مقصد ایک اہم باب ہے۔ اس معاملہ میں دو گروہ بہت نمایاں ہیں۔ بعض
لوگوں کے نزدیک اعلےٰ اخلاق مسرت اور خوشی پیدا کرنے کا باعث ہوتے
ہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک اس سے مقصود محض نیکی ہے۔ اور خدا کی
رضا جوئی ؛

فارسی شاعری کے نزدیک بھی اخلاق کا مقصد خدا کی رضا جوئی ہے۔
اور نیکی خود اپنی جزا ہے۔ سعدی نے تربیت اور تعمیر اخلاق کا جو فلسفہ پیش
کیا ہے۔ وہ بہت حد تک کانٹ[1] کے اصول تربیت سے مشابہ ہے۔ تواضع،
انکسار، قناعت، سرمایہ سے اجتناب، مجلس امیر و وزیر سے علیحدگی، ہمدردی
درویشی اور فقر کی نصیحت، نیک نیتی، خلوص اور صداقت اور اس طرح کے
مکارمِ اخلاق کی تعلیم فارسی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے ؛

---

[1] Kant

عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے۔ کہ فارسی شاعری توکّل اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے۔ جس میں قوم میں بے کاری اور بے عملی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ فارسی شاعری کے عروج کا زمانہ قوم کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس میں لوگوں کا عام رجحان درباداری اور ملازمت شاہی کی جانب تھا۔ جس میں کامیابی ہونے کے لئے ہر قسم کے قبایح ومفاسد میں پڑنے کا احتمال تھا۔ اس لئے حکمائے اخلاق نے عوام الناس کو ان سیاسی قباحتوں سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ سچ یہ ہے۔ کہ قوم کو اس زمانے میں قناعت کی طرف بلانا پاکیزگی اخلاق کی طرف بلانے کے مراوف تھا۔ اسی طرح توکّل بھی وہ چیز نہیں۔ جو سمجھی جاتی ہے۔ یہ دراصل خداوند تعالیٰ پر اعتماد اور پھر اپنی خداداد قوّت پر اعتماد کا دوسرا نام تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ارباب کمال نے ہمیشہ لوگوں کو توکّل اور قناعت کی تلقین کی ؎

پائے ارباب توکّل بر نمے گردد ز بحر
خضر این وادی کجا محتاج کشتی یا پل است　　(سالک)

اسی کے ساتھ ساتھ گمنامی اور عزلت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور اس پرآشوب دور سیاست میں اس سے بہتر کیا سبق ہوسکتا ہے ؎

نیست از سیل گران سنگ حوادث خطرم
خانہ در کوچۂ گمنامی عنقا دارم　　(صائب)

شاہی طلبوں کو بتلایا کہ شاہی اور درویشی میں بہت معمولی فرق ہے ؎

یک پردہ بیش نبود در فقر و سلطنت فرق
طبل شہی است کشکول ار پوست کندہ گویم　　(سرخوش)

ایشیائی ضابطۂ اخلاق کے بعض پہلو ایسے ہیں۔ جن کا صحیح مفہوم جدید

لوگ سمجھ نہیں سکتے۔ مثلاً قدیم تواضع اور انکسار جو انتہائی اخلاق اور شرافت کے لوازم سمجھے جاتے تھے۔ جدید لوگ غالباً اس کو ذلت اور خواری سے تعبیر کرتے ہوں لیکن درحقیقت یہی وہ اعلےٰ کیرکٹر تھا۔ جس پر قدیم زمانہ کو ناز ہو سکتا ہے۔ پرانے لوگ افتادگی اور خاکساری کو کمال کی اولین سیڑھی خیال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صائب فرماتے ہیں ؎

شبنم بآفتاب رسید از فتادگی
بنگر کہ از کجا بہ کجا می تواں رسید

کلیم کو کنج خاکساری میں گنج کمال ملتا ہے ؎

کدام گنج کہ در کنج خاکساری نیست
رواز زمین بہ طلب آنچہ آسمان ندہد

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ فارسی شاعری آزادی، طلب، جدوجہد اور عزت نفس کی تعلیم نہیں دیتی۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ فی الحقیقت عزلت اور خاکساری کی تعلیم کے ضمن میں ہی آزادی اور خودداری کی تلقین ہے۔ فارسی کا کوئی بڑا شاعر ایسا نہ ہوگا۔ جس نے یہ قیمتی اسباق قوم کو نہ دیئے ہوں گے۔ طلب۔ مشقت۔ اور جانفشانی کا جو تصوّر فقر کی اصطلاحوں میں پیش کیا گیا ہے۔ خود وہ بھی سیرت اور کیرکٹر کو ایک رجحان بخشنے میں کافی تاثیر رکھتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ عام دنیاوی طرز تخاطب میں بھی طلب وغیرہ کی پُرزور تلقین کی گئی ہے۔ قدیم زندگی میں جو کشمکش اور آویزش حصول مقصود کے لئے ضروری ہوا کرتی تھی۔ اور جس طرح وہ لوگ اپنے مدعا میں سعی وعمل کو کام میں لایا کرتے تھے وہ بذات خود اس بات کا ایک ثبوت ہے۔ کہ قدیم تصوّر زندگی میں پیہم کوشش کو کیا درجہ حاصل تھا۔

بہ ہجر و وصل و ملال و نشاط اگر کینم
وراں دمے کہ طلب ہست آرمیدن نیست (نظیری)

نظیری کے نزدیک ناکامی کوشش کی کمی کا نام ہے ؎

مگو کہ رفتم و قسمت نبود دریا بم
کہ نارسیدن سالک نشان بے طلبی ست

عرفی کے نزدیک راستے کی درازی مانع طلب نہیں ہونی چاہیئے ؎

پیمان سعی مکسل اگر کار مشکل است
راہ رو ملول گر نشود راہ دراز نیست

کلیم کے خیال میں زندگی کے لئے ہنگامۂ عمل اور پیچ و تاب ضروری ہے ؎

نخوردہ پیچش و تابے بکامِ دل نرسی
گہر برشتۂ بے تاب جا نمی گیرد

مقصود کا ہما بیضۂ فولاد سے حاصل ہوتا ہے ؎

دامنِ دولت بآسانی نمی آید بدست
این ہما از بیضۂ فولاد می آید برون (صائب)

بچے کو اگرچہ شیر مادر مل ہی جاتا ہے۔ لیکن بہر حال پستانِ مادر کو چوسنے کی ضرورت تو ہے ہی!

چوں شیر مادر است مہیّا اگرچہ رزق
این جہد و کوششِ تو بجائے مکیدن است (صائب)

ترقی کے لئے حرکت، سفر، اور تکالیف اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پاکیزہ تر از آب نباشد چیزے
لیکن چو کند مقام گندیدہ شود (؟)

آپ اپنی مدد کا اصول کامیابی کی کلید ہے ؎

زود می آید بسر دورانِ آں کوتاہ بیں
کز فروغ عاریت چوں ماہ می بالد بخویش (صائب)

جو آدمی اوروں پر تکیہ کرتا ہے ناکام رہتا ہے ؎

دست بگرفتۂ مخلوق بجائے نرسد
اُفتد آنکس کہ بامداد کسے برخیزد (آصفخان جعفر)

طلب میں ایک لذّت ہے۔ اور طالب، مقصود پا کر بھی بے کار نہیں بیٹھتا ؎

ہلاک ہمت آں تشنہ ام بوادیٔ عشق
کہ گر بہ چشمہ رسد حمل بر سراب کند (سالک)

اہلِ ہمت اپنی ہی قوتِ بازو سے جیتے ہیں ؎

اہلِ ہمت را نباشد تکیہ بر بازوئے کس
خیمۂ افلاک بے چوب و طناب استادہ است (علی سرہندی)

کاہلی اہلِ طلب کے مذہب میں کفر ہے ؎

کاہلی کفر بود در روشِ اہلِ طلب
من چرا کارِ خود امروز بفردا فگنم (سالک)

طالب کو شوقِ طلب سے قطرہ کی طرح بے خوف سمندر میں کود پڑنا چاہیئے ؎

کمتر مشو از قطرہ کہ در جستنِ دریا
داماں خود از شوق دویدن بمیاں زد (قلی سلیم)

طلب دوام کی اس تائید و ہدایت کے ساتھ انتہائی خودداری اور
آزادی کی طرف بھی رہنمائی کی ہے ؎

آبے ست آبرو کہ نیاید بجوے باز
از تشنگی بمیر و مریز آبروے خویش　(صائب)

خسیسوں کے دروازوں پر مت جاؤ۔ کیونکہ ان کا حلقۂ در مثل
سانپ کے ہے ؎

بر حلقۂ درہای خسیساں نزنی دست
زنہار بپرہیز کہ آں حلقۂ ماریست　(سالک)

یہی بے نیازی مور کو سلیماں بنا سکتی ہے ؎

بے نیازی ست کہ تسخیر کند عالم را
مور اگر بگذرد از دانہ سلیماں گردد　(سالک)

تنگ ظرفوں سے سوال کرنا اپنی آبرو کو کھونا ہے ؎

بادہ گرمی نوشی از دست تنگ ظرفاں منوش
رو دہاں بر خم گذار و منت ساغر مکش　(سالک)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فارسی شاعری روزی کمانے اور کسب معاش
سے روکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی شاعری میں استغنا کو بہت
بڑی منزلت دی گئی ہے۔ اور اس کسب مال سے جو آبرو اور خودداری کو
فروخت کرنے سے ہوتا ہو۔ بہت ڈرایا گیا ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں بیان
ہو چکا ہے۔ طلب معاش کے لئے دربار شاہی اور محل امرا کا طواف کرنا پڑتا
ہے۔ جس میں ایک خوددار آدمی کو اپنی عزت نفس کی بہت سی قربانی کرنی
پڑتی ہے۔ اس لئے اہل دل اور ارباب کمال ایسے معاش سے پرہیز کرنے کا

تلقین کیا کرتے تھے۔ ورنہ افلاس، اور بے زری ہمیشہ ایک لعنت سمجھی جاتی رہی ہے اور مال او ر دولت جس کے ذریعے آدمی کو بہت سی نیکی کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ خُدا کی ایک خاص بخشش خیال کی جاتی رہی ہے۔ صائب کی نگاہوں میں راستی اور صداقت تنگدستی کی وجہ سے بے اعتبار ہو جاتی ہے ؎

راستی از تنگدستی می شود بے اعتبار
راستی بر جا نماند تیر چوں بے پر شود (صائب)

بیدلؔ کے خیال میں ناداری سے بر سر دار ہونا بہتر ہے ؎

کسے مبادا اسیر شکنجۂ افلاس
کہ آدمی بسر دار بہ ز ناداری

جب تک روپیہ موجود ہوتا ہے سب لوگ مدح خوان ہوتے ہیں ؎

ہزاراں ہمچو بلبل مدح خوانند
چو گل تا در کفت مشت زرے ہست (اثر)

اس کے علاوہ فروتنی، عاجزی، عام ہمدردی، خلوص وغیرہ فارسی شاعری کے عام مضامین ہیں۔ جن کا مطالعہ کرنے کے لئے شعر العجم اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اس علم تبصرہ کے بعد یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ فارسی شاعری سے مستقبل کے لئے پیغام حاصل کرنے کے لئے نئی تعبیر و تفسیر کی ضرورت ہے۔ بلا خوف اعتراض یہ دعوےٰ کیا جا سکتا ہے۔ کہ قلبِ انسانی میں تسلی اور طمانیت کی شمع کو روشن کرنے کے لئے اِس سے بہتر روشنی کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ شاعری جس کا نصب العین

روحانی ہو۔ اور جو دنیا میں ایک مخلص اور صادق انسانوں کی سوسائٹی بنانا جانتی ہو۔ اور جس کے سامنے موت محض اس سے بہتر زندگی کے لئے ایک خوشنما دروازہ ہو۔ اس کا مطالعہ بالیقین موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے مژدۂ امید بن سکتا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ قدیم طرز سیاست نے مشرق میں اس شاعری سے خاطر خواہ نتایج پیدا نہیں ہونے دیئے اور اگرچہ لوگوں کی نظروں میں یہ گریز[1] کی شاعری ہے۔ جس کے لکھنے والوں نے مسایل و مشکلات انسانی کے بہادرانہ حل سے اعراض کیا ہے۔ لیکن اس کے اندر گزشتہ ہزارہا سال کے تجربۂ انسانی کا جو فلسفیانہ نچوڑ ہے۔ وہ آج بھی ایک زبردست کلچرل تریاق بن سکتا ہے۔ اور اس سے اب بھی انسانی سیرت کی تعمیر اور تکمیل کا کام لیا جا سکتا ہے۔ فارسی شاعری اپنی موجودہ بے قدری کے پیش نظر پکار پکار کر کہہ رہی ہے ؎

نہ آں جنسم کہ از قحطِ خریدار از بہا اُفتم
ہماں خورشید تابانم اگر در زیر پا اُفتم

(صائب)

سیّد محمّد عبداللہ

---

[1] Escape.

"روحانی"

سلطان شمس الدین التتمشؒ کے شعرا میں ہم روحانی تخلص کے دو شاعروں سے متعارف ہوتے ہیں۔ جنہیں تذکرہ نگاروں نے ایک ہی شخص قیاس کیا ہے۔ اور ان کے متعلق واقعات کو اس قدر خلط ملط کر دیا ہے۔ کہ ہمیں مجبوراً ان کی جداگانہ شخصیتوں پر قلم اٹھانا پڑا۔ روحانی دراصل دو ہیں۔[1]

پہلا وہ جو ابو محمد بن محمد رشیدی سمرقندی کا شاگرد ہے اور سلطان یمین الدین بہرامشاہ بن مسعود غزنوی دم ۵۴۷ھ) کے مداحین میں داخل ہے۔ روحانی کے اکثر قصائد اسی بادشاہ کی مدح میں ہیں اور بہرامشاہ کی وفات کے بعد ملک جلال الدین اتسز خوارزمشاہ (م ۵۵۱ھ) کے دربار میں کتابت کے عہدے پر مامور کیا جاتا ہے۔

ہفت اقلیم میں اس شاعر کو صرف "امیر روحانی" لکھا گیا ہے اور اس کا ایک طویل قصیدہ بھی بہرامشاہ غزنوی کی تعریف میں موجود ہے۔ جس کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:-

زہی بفکرت روشن ذہاب چشمۂ جان [ز] آفرینش عالم دلت معما خوان

توئی توئی کہ اگر خوانت عطارد من برین سخن نبود خلق را مجال گمان

دوم ادیب پریشان سخن کہ پیوست ہزار بار بسینہ ہمہ دبیرستان

سیوم رشیدک وطواط ژاژخای کہ ہست چو کلخ گندہ دماغ وچو کلک بستہ دہان

. . . .

---

[1] بسلسلہ "سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں علمی و ادبی تحریکات"۔

ہمین دولت بہرامشاہ بن مسعود — کہ آفتاب ملوک است وسایۂ یزدان

. . . .

مکوش چند بن خاموش باش روحانی — دریغ بیتو مقولات غیروسع گمان

اگر بگاہ سخن جادوی کنی دعوی — ہمین قصیدہ بسنداست مرترا برہان

سزا بود کہ برین شعر آفرین گوید — چراغ روضۂ مسعود سعد بن سلمان

یہ شاعر دوسرے روحانی سے بہت قبل گزرا ہے۔ یہاں ہم فی الحال اسی بیان پر اکتفا کر کے دوسرے شاعر کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔

دوسرا شاعر وہ ہے جو چنگیز خانی حملوں سے بے وطن ہو کر ہندوستان کا رُخ کرتا ہے اور سلطان شمس الدین التتمش کے دربار میں پہنچتا ہے، جیسا کہ تذکرہ نگار کہتے ہیں یہ رشید وطواط (م ۵۷۸ھ) کا شاگرد معلوم ہوتا ہے اور اپنے ہم تخلص کے مقابلے میں "حکیم روحانی" کے نام سے مشہور ہے۔

ہمارے پاس اس روحانی کو روحانی اول سے ممیز کرنے کے لئے یہ بعض وجوہ ہو سکتے ہیں :-

پہلے یہ کہ مسبوق الذکر روحانی تو چھٹی صدی ہجری کے آغاز کا شاعر ہے۔ کیونکہ بہرام شاہ غزنوی کا مداح ہے اور موخر الذکر اسی صدی کے اختتام کا۔

دوسرے یہ کہ اگر اس کو مسبوق الذکر کا شاگرد مانا جائے تو شاگرد کو استاد پر بلحاظ زمانہ تقدم لازم آجاتا ہے۔ نیز یہ کہ خود استاد کے متعلق اس کی زبان سے ایسے اشعار کا ادا ہونا نہایت نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رہے کہ تذکرہ نگار روحانی اوّل کو رشیدی سمرقندی کے

تلامذہ میں شمار کرتے ہیں ؛

تیسرے یہ کہ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رشید وطواط کے معاصرین میں سے ہے۔ وہ رشید کی ہجو کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس سے بلند پایہ شاعر سمجھتا ہے۔ لہذا رشید وطواط کا سابق الذکر شاعر کے بارے میں استاد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ؛

تاریخی کتب میں سب سے پہلے ہم طبقاتِ اکبری میں روحانی ثانی سے روشناس ہوتے ہیں ؛

صاحب تذکرۂ لباب الالباب[1] اس کو "الاجل الافضل تاج الحکماء عطارد الثانی ابوبکر محمد بن علی الروحانی" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور اس کی خداداد طبیعت اور موزونیِ سخن کی تعریف کرنے کے بعد اس کا ایک قصیدہ نقل کرتا ہے جو بقول مصنفِ تذکرہ :۔

" از زبان سلطان یمین الدولہ بہرامشاہ گفتہ است این شعر" اور جس کا مطلع ہے :۔

منّت خدا را کہ جہان در پناہ ماست
سجدہ گہ ملوک زمین بارگاہ ماست

یہ بہرامشاہ غالباً یمین الدین بہرامشاہ بن تاج الدین حرب[2] بادشاہِ سجستان ہے جو ۶۱۲ سے ۶۱۸ھ تک حکومت کرتا ہے۔ اس کی مدح میں حکیم روحانی نے بہت سے قصائد لکھے۔ لباب میں اس کے چند اشعار مندرج ہیں ؛

تذکرۂ ریاض الشعرا علی قلی خان والہ داغستانی کی فہرست مطالبات میں

---

[1] لباب الالباب جلد دوم ص ۲۸۲ تا ۲۸۶ ، [2] مندرجۂ لباب جلد اول ،

جو فہرست نگار نے مرقوم کی ہے صفحہ ۵۴ پر ہمیں ۱۹۳۹ء کے ذیل میں دو روحانی نام ملتے ہیں - ان میں ایک کا نام ابوبکر محمد علی غزنوی ہے اور دوسرے کا اصیل الدین - پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ ناکمل ہے - لیکن پروفیسر شیرانی مدّظلہٗ کے نسخے میں اس شاعر کا ذکر بدیں الفاظ موجود ہے [۱] -

"حکیم ابوبکر محمد علی الروحانی ولادت وی در غزنین شدہ و توطنش در بخارا و نشو و نماش در سمرقند بودہ از شاگردان استاد رشیدی و مداح بہرامشاہ ہست - قصیدہ از زبان شاہ مذکور در مدح وی گفتہ کہ مطلعش است

منّت خدا را کہ جہان در پناہ ماست
سجدہ گہ ملوک زمین بارگاہ ماست

والحق این قصیدہ را بسیار خوب گفتہ است و این ابیات عالی نیز از وست

" . . . .

"اصیل الدین روحانی نقی اوحدی در تذکرۂ خود چند بیتی ازو نوشتہ است و گفتہ کہ در نسخہ قدیمی بنظر رسید معلوم نیست کہ ہماں روحانی ست یا غیر او - راقم حروف این دو بیت را ازان ابیات انتخاب نمودہ بر می نگارد -

این [ ] کنہ محققان راہند — بر مسند فقر بادشاہند
در رزم یلان بی تبر اند — در بزم سران بی کلاہند

روحانی کے ہندوستان میں وارد ہونے کا مذکور ہمیں طبقات اکبری

[۱] ریاض الشعرا قلمی ص ۱۷۴ ،

تاریخ فرشتہ (جلد اول صـ ۲۶ نولکشور) منتخب التواریخ، تحفۃ الکرام اور روزِ روشن وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔

روحانی کا وطن بخارا ہے۔ وہ مغلوں کی یورش سے تنگ آکر اپنے پیارے وطن کو خیرباد کہتا ہے۔ اور ایک عرصہ سیستان میں گزارنے کے بعد جہاں وہ بہرامشاہ بادشاہ سجستان کی تعریف میں قصائد لکھتا ہے ہندستان آتا ہے اور دہلی کا رُخ کرتا ہے۔ اور ۶۲۴ھ میں سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں پہنچتا ہے۔ لیکن علی شیر قانع اور مظفر حسین صبا رقمطراز ہیں۔ کہ وہ ۶۲۳ھ میں سلطان کی درگاہ میں پیش ہوا۔ میں اصل عبارت یہاں نقل کئے دیتا ہوں:۔

"افصح الکلام امیر روحانی . . . . در تاریخ صبح صادق نوشتہ کہ در ثلث وعشرین وستمائہ سلطان شمس الدین التمش صاحب دہلی زنتھبور [رامحاصرہ؟] کرد وبگرفت۔ پس بمندور رفت و استیلا یافت۔ حکیم روحانی از بخارا بخدمت او پیوست و قصیدہ گذرانید صلۂ جزیل یافت۔"[1]

"روحانی . . . . در سنہ ثلاثہ وعشرین ہنگامے کہ سلطان شمس الدین التمش زنتھبور را فتح کردہ شہر مانڈو [منڈور] رامخیم جاہ وجلال ساخت روحانی از بخارا بحضور سلطان رسید . . . . "[2]

طبقات[3] ناصری سے پتہ چلتا ہے۔ کہ سلطان اس سال کوہ سوالک کے حدود میں قلعہ مندور کو سر کرنے کے لئے نکلتا ہے اور ۶۲۴ھ میں

---

[1] تحفۃ الکرام مطبوعہ جلد دوم صـ ۳۱۱، [2] روزِ روشن مطبوعہ صـ ۲۶۱، [3] طبقات ناصری صـ ۱۷۲،

واپس پایۂ تخت پہنچتا ہے۔ شعراء اس مہم کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور قصائد تہنیت لکھتے ہیں۔ جن میں روحانی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا ہے اور اس قصیدے کے طفیل انعام واکرام حاصل کرتا ہے۔ اس کے چند اشعار طبقاتِ اکبری سے منقول ہیں۔ جنھیں دوسرے مصنفین نے بھی نقل کیا ہے۔ اشعار مذکور یہ ہیں:[1]

خبر باہل سما برد جبرئیل امین — ز فتحنامۂ سلطان عہد شمس الدین
کہ اے ملائکۂ قدس آسمان برین — بدین بشارت بندید کلۂ و آئین
کہ از بلاد ملاحد شہنشہ اسلام — کشاد بار دگر قلعۂ سپہر آئین
شہ مجاہد غازی کہ دست و تیغش را — روان حیدر کرار میکند تحسین

مؤرخ ملّا عبدالقادر بدایونی قلم کی ردیف والا ایک قصیدہ بھی روحانی ثانی کی طرف منسوب کرتا ہے۔ جس کا مطلع ہے:-

قصّۂ خویش از زبانِ قلم — کردہ ام یاد در بیان قلم

مجمع النفائس[2]۔ مخزن الغرائب۔ آتشکدۂ آذر۔ مجمع الفصحاء[3]۔ تذکرۃ الشعراء میں بھی ہمیں ایک روحانی شاعر کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے مراد ہمارے خیال میں سابق الذکر شاعر ہے۔ اگرچہ تذکرہ نگار اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ جس نام سے روحانی ثانی مشہور ہے۔

روحانی اسمش ابوبکر محمد از شاگردان رشید وطواط است مداح سلطان محمد خوارزم شاہ بودہ۔ این قطعہ از وست:-

مرد آزادہ بگیتی نکند میل دو کار — تا ہمہ عمر ز آفت بسلامت باشد
زن نخواہد اگرش دختر قیصر بدہند — وام نستاند اگر وعدہ قیامت باشد[4]

---

[1] طبقات اکبری جلد اول ص ۵۹، [2] مجمع النفائس قلمی ص ۲۲۴، [3] مجمع الفصحا جلد اول ص ۲۲۰، [4] آتشکدۂ آذر ص ۲۴۵

یہ رباعی ہفت اقلیم۔ مجمع الفصحا اور مجمع النفائس میں بھی پائی جاتی ہے ؛

ذکر حکیم ابوبکر محمد علی الروحانی ۔ تاج الحکماء ارشد القدماءست
از سمرقند بودہ مثل خواجہ رشیدی از دامن تربیت او برخاستہ
ہمیں بزرگے اوبسنداست ۔ ملا عوفی ذکر وی نمودہ ۔ این
چند اشعار آبدار از نتائج طبع وقاد اوست :۔

سنبلت بر صفحۂ گل مشکباری میکند
عارضت دو کشور خوبی خدائی میکند [1]

" " " " " " " "

یہ اشعار لباب الالباب میں موجود ہیں ۔ اور والہ داغستانی نے بھی نقل کئے ہیں
مندرجہ بالا بیان سے ثابت ہو جاتا ہے ۔ کہ اوّل ۔ شاعروں کے
ان دو ممدوحین یعنی بہرامشاہ غزنوی اور بہرامشاہ بادشاہ سجستان کے دور
حکومت میں ایک صدی کا نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے ؛

دوم ۔ یہ کہ اگر ایک روحانی غزنہ میں ہے تو دوسرا دہلی میں ۔

سوم ۔ یہ کہ ایک کا تذکرہ ۵۴۷-۵۵۱ھ میں ملتا ہے اور دوسرے کا
۶۲۴ھ میں ؛

پس ظاہر ہے کہ روحانی تخلص کی دو جدا جدا شخصیتیں ہیں ۔ جو اشتراک
تخلص کی بنا پر غلطی کا موجب ہوئیں ؛

آغا عبدالستار خاں ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ او ۔ ایل

---

[1] مخزن الغرائب قلمی ،

عربی طلبہ کی چند ایک اہم ضروریات[1]

عربی زبان کے طلبہ کے لئے سب سے پہلے ایک ایسی عربی گریمر کی ضرورت ہے۔ جس میں صرف و نحو کے قواعد منطقی طریق پر ایک سلجھے ہوئے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہوں۔ یہ سچ ہے کہ مشرقی زبانوں میں عربی صرف و نحو پر بہت سی کتابیں موجود ہیں اور مغربی زبانوں میں بھی اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جو بالعموم مشرقی تصانیف پر مبنی ہیں۔ مگر افسوس کہ اُن میں سے اکثر اپنے طرز بیان اور مضامین کی ترتیب کے لحاظ سے تسلی بخش اور زمانۂ حال کے طلبہ کے مناسب نہیں۔ کچھ عرصہ ہُوا مجھے درس کے لئے ایک کتاب کو استعمال کرنے کا اتفاق ہُوا۔ جس میں نحوی قواعد کو حسب ذیل ترتیب سے بیان کیا گیا تھا:۔

سب سے پہلے حروفِ عاملہ سے بحث تھی۔ اس کے بعد منصرف اور غیر منصرف سے اور اس کے بعد مرفوعات، منصوبات اور مجرورات کا بیان تھا مگر تجربہ سے جلد ظاہر ہو گیا کہ اس ترتیب کی پیروی کرنے میں اشکال ہے مثلاً غیر منصرف کی حیثیّت قواعد اعراب کی رُو سے محض استثنائی ہے۔ یعنی جب غیر منصرف الفاظ بحالت جرّ استعمال میں آئیں تو اعراب کے عام قواعد جن کی رُو سے اُن پر کسرہ آنا چاہیئے، باطل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر مذکورہ بالا ترتیب مضامین کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو اعراب کے اساسی اصول کا بیان

---

[1] مختصر ترجمہ ایک انگریزی مقالہ کا جو ڈاکٹر عنایت اللہ نے پنجاب یونیورسٹی عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کے اجلاس منعقدہ ۲۸ مارچ ۱۹۴۰ء میں پڑھا۔

غیر منصرف کے بعد آئے گا - اور ظاہر ہے کہ مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ سے
پہلے بیان کرنا ایک بے معنی بات ہے - یہی قول حروف عاملہ پر بھی صادق
آتا ہے - کیونکہ حروف عاملہ پر بھی صادق آتا ہے - کیونکہ حروف عاملہ بھی صرف و
نحو کے اساسی اصول کو معطل کر کے اجزاء جملہ کے اعراب اصلی میں طرح
طرح کی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں - بدیں وجوہ میں نے اپنے درس میں
مذکورہ بالا ترتیب کو بالکل بدل دیا - سب سے پہلے میں نے مرفوعات، منصوبات
اور مجرورات سے بحث کی اور دکھلایا کہ رفع، نصب اور جرّ تینوں حالتوں
میں اسماء پر بالعموم کیا حرکات آتی ہیں - اور ان قواعد کو اعراب کے اساسی
اصول قرار دیا - اس کے بعد منصرف اور غیر منصرف کو زیر بحث لایا گیا - اور
دکھلایا کہ غیر منصرف الفاظ کی حیثیت محض استثنائی ہے - اس کے بعد
حروف عاملہ کی مختلف اقسام سے بحث کی گئی اور دکھلایا گیا کہ یہ حروف بھی
صرف و نحو کے اساسی اصول اعراب میں مختلف طرح کی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔
یہ محض ایک مثال ہے - اس امر کی کہ کس طرح تھوڑے سے غور و فکر
سے منتشر اور بے ترتیب مواد کو با ترتیب اور منظم بنایا جا سکتا ہے اور اسے
منطقی طریق پر مرتّب کر کے طلبہ کے لئے زود فہم بنایا جا سکتا ہے - اس سے
میرا یہ مقصود نہیں کہ موجودہ کتابیں تمام کی تمام یکسر بے کار ہیں - وہ کم و بیش
اپنی جگہ مفید ہیں - مگر انہیں کلیتہً بے خطا نہیں کہا جا سکتا - اُن میں ابھی
اصلاح کی بہت گنجائش ہے اور وضع اصول اور ترتیب مضامین کے لحاظ
سے بہتر بنایا جا سکتا ہے - بعض فضلاء نے اس طرف توجہ مبذول کی ہے
مثلاً مولانا شبلی نے اپنے بعض مضامین میں مروّجہ کتب درسی کے بعض
بیان کردہ قواعد پر نکتہ چینی کی ہے - اور قواعد زبان کو بہتر صورت میں پیش

کرنے کے متعلق قابلِ قدر مشورے دیئے ہیں۔ اُن کے علاوہ ڈاکٹر لائٹنر (Dr Leitner) نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے عربی صرف ونحو کے چند موٹے موٹے اور سادہ قواعد کے استنباط کی کوشش کی ہے۔ مگر اُن کا رسالہ موضوع کی وسعت کے لحاظ سے ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر آرنلڈ کے متعلق بھی کہا جاتا ہے۔ کہ وہ جدید طرز پر ایک عربی گریمر لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر افسوس کہ اجل نے انہیں مہلت نہ دی ؛

دوسری اہم ضرورت عربی طلبہ کی ایک جامع عربی لغات ہے۔ جو تاریخی اصول پر مرتب ہو۔ عربی لغت کی جو کتابیں اس وقت موجود ہیں۔ وُہ اپنے اپنے دائرہ کے اندر کم وبیش مفید ہیں۔ مگر اُن میں بالعموم اُس کتابی (کلاسیکل) زبان سے اعتناء کیا گیا ہے جو عربی ادبیات کے دَورِ اول میں مستعمل تھی۔ زمانہ مابعد کے ارتقاء لسانی پر توجہ نہیں دی گئی۔ نیز غیر زبانوں سے جو الفاظ آکر دخیل ہوئے ہیں۔ اُن کے اصل ماخذ کے متعلق بھی اکثر اطلاعات صحت سے دُور ہیں۔ عربی انگریزی کتبِ لُغت میں لین صاحب (Lane) کی لغات سب سے جامع تسلیم کی جاتی ہے۔ مگر افسوس کہ وہ بھی مکمل نہ ہو سکی اور اس کا اخیر حصّہ ناقص ہے۔ ہالینڈ کے مشہور مؤرّخ اور عربی دان پروفیسر دوزی (Dozy) نے مروّجہ کتبِ لغت کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک تتمّہ لغات عربیہ دو ضخیم جلدوں میں مرتّب کیا تھا۔ جس میں انہوں نے دَورِ اوّل کے بعد کے ارتقاء لسانی اور غیر معروف الفاظ پر خاص توجّہ دی تھی۔ اور دخیل اور معرّب الفاظ کی خوب تحقیق کی ہے۔ یہ مجموعہ لغات فضلاء مغاربہ

An Introduction to a Philosophical Grammer of Arabic By G. Leitner. Lahore 1871.

کی تصانیف کے سمجھنے میں خاص طور پر مفید ہے۔ مگر فرانسیسی زبان میں مرتب ہونے کی وجہ سے ہندوستانی طلبہ کے لئے اس کا فائدہ محدود ہے ؛

ہمیں ضرورت اس امر کی ہے کہ اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری کی طرز پر عربی زبان کی ایک جامع لغت تاریخی اصول کے مطابق مرتب کی جائے۔ اصول تاریخی سے یہ مراد ہے کہ ہر ایک لفظ کے متعلق یہ تحقیق کی جائے کہ مختلف زمانوں میں اس کا محل استعمال کیا رہا ہے، اور وقتاً بعد وقتٍ اس کے معنی و مفہوم میں کیا کچھ تغیّر و تبدّل ہوتا رہا ہے۔ اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری ان ہی اصول پر تیار ہوئی ہے۔ جس میں ارتقاء لسانی کو ہزارہا امثلہ کے ذریعہ سے واضح کیا گیا ہے۔ عربی کتب لغت میں بھی شواہد کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ مگر اُن میں ترتیب زمانی کا لحاظ نہیں رکھا گیا ؛

قاہرہ کے المجمع اللغوی الملکی نے جو جنوری ۱۹۳۴ء میں معرض قیام میں آیا تھا، عربی زبان کی ایک جامع لغات تیار کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے اور پروفیسر گب (جو اس مجمع کے ایک ممتاز ممبر ہیں) کے ایک مراسلہ سے معلوم ہُوا۔ کہ اس کام کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ مجمع کا خیال تھا کہ لائپزش (Leipzig) یونیورسٹی میں متعدد علماء کی سعی سے عربی لغات کے متعلق جو مواد کثیر مقدار میں جمع ہو چکا ہے، اس سے بھی استفادہ کیا جائے۔ مگر اب جبکہ جنگ چھڑ چکی ہے۔ جرمن علماء کا تعاون اور اشتراک عمل ایک غیر متعیّن مدّت کے لئے معرضِ التوا میں پڑ گیا ہے ؛

عربی طلبہ کی ایک دیگر اہم ضرورت عربی ادبیات کی تاریخ ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اُردو زبان میں اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ہندوستان میں جہاں کئی صدیوں سے سینکڑوں مدارس میں

علوم دینیہ اور علوم عربیہ کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ آج تک ادبیات عرب کی کوئی مسلسل تاریخ نہیں لکھی گئی۔ مجھے اس بات کی ضرورت نہیں کہ فضلاء کے اس مجمع کے سامنے میں ادبی تاریخ کی اہمیت اور ضرورت بیان کروں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ ہندوستان میں اس موضوع پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی خصوصاً اُن طلبہ کی طرف سے جو قدیم طرز کے درس نظامی کی پیروی کرتے ہیں۔ ہمارے مدارس میں جو نصاب تعلیم بالعموم مروّج ہے۔ اس میں ادب کا حصہ بہت کم ہے اور جو ادبی کتابیں مشمول ہیں وہ ایک مصنوعی اور پُر تکلف طرز انشا کا نمونہ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ علم النحو پر بہت سا وقت صرف ہوتا ہے۔ مگر چونکہ یہ علم پُرانی وضع کی کتابوں کے ذریعہ سے پڑھایا جاتا ہے اس لئے خود ادب کے لئے بہت کم وقت بچتا ہے۔ چہ جائیکہ ادبی تاریخ کے مطالعہ کے لئے وقت نکل سکے۔

بات اصل میں یوں ہے۔ کہ عربی نصاب تعلیم کے قدیم واضعین کا مقصد اوّل فقیہ اور عالم دین تیار کرنا تھا۔ بعد میں متاخرین نے اس نصاب میں کتب فلسفہ کی بھر مار کر دی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ خود ادب کی طرف توجہ بہت کم رہی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ادبیات کی تاریخ کے لئے کیسے گنجائش نکل سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس کے سند یافتہ اصحاب کا دائرۂ علم ادبی تاریخ کے اعتبار سے چند ایک شعراء اور انشا نگاروں کے اسماء تک محدود رہتا ہے۔ اور وُہ اس بات سے بہت حد تک بے خبر رہتے ہیں کہ فقہ اور نحو کی متداول کتابوں کے علاوہ بھی عربی زبان میں بیسیوں علوم کے انمول خزانے بھرے پڑے ہیں۔ مقام مسرّت ہے بلکہ محل تبریک و تہنیت کہ پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کے ارباب حل وعقد نے ادبی تاریخ کی اہمیّت کو

محسوس کرتے ہوئے اُسے عربی زبان کے نصاب میں داخل فرمایا ہے۔ امید واثق ہے۔ کہ ملک کے دیگر مدارس میں بھی اس عمدہ مثال کی تقلید کی جائے گی اور اطراف ملک میں اس اہم موضوع میں روز بروز دلچسپی بڑھتی جائے گی ؛

جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ صرف ایک ہندوستانی عالم نے فی زمانا عربی ادبیات کی تاریخ سے اعتناء کیا ہے۔ اور وہ مولوی محمود حسین خان ٹونکی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا۔ اُن کی معجم المصنفین کی پہلی تین جلدیں بیروت میں چھپ کر حیدرآباد دکن سے اشاعت پذیر ہوئی تھیں۔ اس تالیف کی ترتیب چونکہ حروف معجم پر ہے۔ اس لئے اس کو ادب عربی کی مسلسل تاریخ کہنا بجا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا کتب مراجعہ میں شمار ہوگا۔ یہ معجم تاحال نہ صرف نامکمل ہے بلکہ اس میں ایک بھاری نقص یہ ہے۔ کہ اس کی تالیف میں مغربی علماء کی قابلِ قدر تحقیقات سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ اب جامعہ عثمانیہ نے اس تالیف کو اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے۔ اور اس بات کا انتظام کیا ہے کہ جو جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ اُن پر مستشرقین کی تحقیقات کی روشنی میں نظر ثانی کی جائے اور باقی ماندہ جلدوں کو تالیف کر کے معجم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے ؛

مغربی زبانوں میں عربی ادبیات کی تاریخ پر متعدد تصانیف موجود ہیں۔ اور اگرچہ وہ اپنے طرزِ تالیف اور وسعت بیان کے لحاظ سے بہت حد تک متفاوت ہیں۔ تاہم ان کو پیشِ نظر رکھ کر اُردو زبان میں اس موضوع پر آسانی کے ساتھ ایسی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ جو طلبہ کے مفید مطلب ہو مصر میں بھی اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور اُن سے بھی اس بارے میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ مغربی تصانیف میں سے حسب ذیل

کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :-

(۱) پروفیسر گب (Gibb) کا مدخل الی الادب العربی (Arabic Literature: An Introduction) سنِ تصنیف ۱۹۲۶ء
انگریزی زبان میں تقریبًا ۱۲۰ صفحات کا ایک مختصر مگر مستند رسالہ ہے۔
اور مبتدیوں کے لئے بدرجہ غایت مفید ہے +

(۲) فرانسیسی پروفیسر ہیوار (Huart) کی تاریخ الادب العربی
جس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ مؤلف نے ہر عہد کے متعدد شعرا
اور مصنفین کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے طلبہ اور عام شایقین کے لئے بغرض
مراجعت خاصی مفید ہے +

(۳) پروفیسر نکلسن کی تاریخ ادب العرب جو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ
دوبارہ چھپ چکی ہے۔ ہیوار کی تاریخ کی طرح یہ بھی بلحاظ ضخامت اوسط درجہ
کا حکم رکھتی ہے۔ مگر لطافت بیان اور ٹھوس ادبی تنقید کے لحاظ سے اپنے
موضوع پر ایک بے نظیر تصنیف ہے۔ مصنف نے ہر عہد کے چند چوٹی
کے شاعر، ادیب اور مصنف انتخاب کر کے ان پر سیر حاصل بحث کی ہے
اور ساتھ ہی ہر تاریخی دَور کے سیاسی اور مذہبی حالات پر بھی روشنی ڈالی
ہے۔ جس سے اس دَور کے ادبی رجحانات کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے +

(۴) جرمن پروفیسر بروکلمن کی تاریخ ادبیات عرب۔ تقریبًا چالیس
سال ہوئے دو جلدوں میں شایع ہوئی تھی۔ مؤلف نے لٹریچر کی ہر شاخ کے
ساتھ اعتنا کیا ہے۔ اور ہر عہد کے مصنفوں کے حالات زندگی، اور اُن
کی مصنفات کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ موضوع کے استقصاء اور
اطلاعات کی فراوانی کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی مفصل ترین تالیف ہے

جرجی زیدان نے اپنی تاریخ آداب اللغۃ العربیہ میں بہت حد تک اسی کا چربہ اُتارا ہے۔ اب چند سال سے پروفیسر نذکر اپنی تاریخ کا ایک وسیع پیمانہ پر تتمہ لکھ رہے ہیں۔ جس کی دو ضخیم جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ اور تیسری جلد زیرِ طبع ہے ؛

سب سے آخر میں عربی طلبہ کے لئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو دیارِ عرب کے طبعی ماحول اور عربوں کی اقتصادی، معاشری اور سیاسی زندگی کو ایک عام فہم اور سلیس پیرایہ میں بیان کرے۔ اور اُن کے عادات و رسوم کو اس طریق پر واضح کرے جس سے اُن کے ادب کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ عربی لٹریچر میں عربوں کے عادات و اطوار، طرزِ تخیل اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ایسے اشارات کثرت سے ملتے ہیں۔ جو ہمارے طلبہ کے فہم سے اس لئے دُور ہیں کہ وُہ ایک دُور افتادہ قوم کی طرزِ معاشرت اور حالاتِ زندگی سے بہت حد تک ناواقف ہیں۔ مثال کے طور پر آپ قدیم عرب شاعروں کے کلام کو لیجئے۔ اس کا کماحقہٗ سمجھنا اس وقت تک دشوار ہے۔ جب تک ہم بدویوں کی معاشرت اور ذہنیت کے مختلف پہلوؤں سے اچھی طرح واقف نہ ہوں۔ مثلاً انہوں نے اپنی تشبیہات کو بالعموم اپنے طبعی ماحول یا اپنے گرد و پیش کی زندگی سے اخذ کیا ہے۔ اور جب تک ہمیں ان باتوں کا علم نہ ہو ان کی تشبیہات کو سمجھنا ناممکن ہے۔ عرب کے باہر بھی مدتِ دراز تک عرب اور غیر عرب شعراء ٹھیٹھ عرب شاعروں کے اسالیب بیان کا تتبع کرتے رہے۔ اور نثر نگار بھی ایسی زبان استعمال کرتے رہے۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کا نشو و نما بادیہ اور اہل بادیہ کے درمیان ہُوا ہے ؛

کیا ہمارے طلبہ عربوں کی معاشرت اور اُن کی زندگی کے مختلف مادی اور اخلاقی پہلوؤں سے واقف ہیں ؟ میری ناقص رائے میں وہ کما حقّہا واقف نہیں ۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ تقریبًا ہر ایک فرض شناس استاد اپنی اطّلاع اور لیاقت کے مطابق حسب موقعہ اِن امور پر روشنی ڈالتا ہے ۔ مگر ان باتوں کی تعلیم باقاعدگی کے ساتھ نہیں ہوتی اور وقتًا بعد وقتٍ طلبہ کو جو اطلاعات بہم پہنچائی جاتی ہیں ۔ اُن میں کوئی خاص ترتیب نہیں پائی جاتی ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ۔ کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ۔ جو مذکورہ بالا ضرورت کو پورا کرتی ہو ۔ اندریں حالات تعلیمی سال کے آغاز میں جب میرے پاس طلبہ کی نئی جماعت آتی ہے ۔ تو درسی کتابیں شروع کرنے سے پہلے میں چند اسباق میں دیار عرب کا جغرافیہ ، عربوں کے رسوم و عادات اور اُن کی اقتصادی اور معاشری زندگی کو بیان کرتا ہوں ۔ اس طریق پر طلبہ کے دل و دماغ کتب درسی کے سمجھنے کے لئے زیادہ مستعد ہوجاتے ہیں ؛

قرون گذشتہ کے فضلاء نے اپنے حالات اور ضروریات کے تقاضا سے درسی کتابیں تالیف کیں جو عرصہ دراز تک اپنا مقصد پورا کرتی رہیں ۔ زمانۂ حال کے اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ موجودہ ضروریات اور آج کل کے مقبول اصولِ تعلیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی کتابیں تیار کریں جو طلبۂ حال کے مفید مطلب ہوں ۔ ورنہ ہم اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں گے ۔ کہ وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائگی میں کوتاہی کر رہے ہیں ؛

عنایت اللہ

تبصرہ و تنقید

ترانۂ عشق حکیم الممالک حکیم عبدالباسط المتخلص بہ عشق کا دیوان ہے جس کے دو حصے ہیں۔ حصۂ اوّل میں فارسی غزلیات و رباعیات ہیں اور حصۂ دوم میں ان کا اردو کلام ہے کہ وہ بھی غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔

حکیم عبدالباسط صاحب عشق ارکاٹ (مدراس) کے رہنے والے تھے اور ایک ممتاز اور ذی علم خاندان کے فرد تھے۔ شاعری ان کو ورثے میں ملی تھی، ان کے والد مولوی مہدی واصف اور دادا مولوی عارف الدین رونق فارسی کے ذی رتبہ شاعروں میں سے تھے۔ اور دربار والاجاہی میں خاص عزت و منزلت رکھتے تھے۔ عشق کی پیدائش ۱۲۳۸ھ میں مدراس میں ہوئی اور ۱۳۰۲ھ میں حیدرآباد میں فوت ہوئے۔ علاوہ عربی اور فارسی ادب کے جس کی تحصیل گذشتہ صدی تک ہر طالب فضیلت کے لئے لازمی تھی۔ عشق نے زبان انگریزی میں بھی کمال پیدا کیا بلکہ میڈیکل کالج مدراس میں انگریزی طب کو بھی حاصل کیا اور جراحی (سرجری) میں خاص طور پر مہارت پیدا کی، لیکن چونکہ طبیعت کا میلان شاعری اور ادب کی طرف تھا لہٰذا ڈاکٹری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔

عشق کے فارسی اور اردو کلام میں خاصی پختگی ہے جس کو دیکھ کر ہمیں دہلی کے آخری زمانے کے شعراء کا کلام یاد آتا ہے لیکن انگریزی دانی کے باوجود فارسی اور اردو پر ایسی قدرت کا ہونا ایک نادر مثال ہے، پچھلی نسل کے بزرگوں کو عربی اور فارسی کی تعلیم کچھ ایسے صحیح طریقے پر ملتی تھی کہ انگریزی ان کے خیالات پر غالب نہیں ہونے پاتی تھی۔ اب حالت بالکل برعکس ہے۔

حضرت عشق کا دیوان ان کے پوتے محمد عبدالباسط صاحب نے مرتب کیا ہے اور شروع میں ۲۷ صفحے کا مقدمہ بھی لکھا ہے۔ تعداد صفحات ۱۴۲ جن میں سے ۱۰۶ صفحے حصہ اوّل اور ۳۷ صفحے حصہ دوم کے ہیں۔

مقام اشاعت: حیدرآباد (۱۳۵۹ھ)۔

سلطان محمود غزنوی - از مولوی محمد حبیب صاحب بی اے۔ آکسن - مترجمہ - سید جمیل حسین ایم - اے (علیگ) حیدرآباد سول سروس۔

یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی - جس کے مصنف محمد حبیب صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ہیں - سید جمیل حسین صاحب ایم - اے (علیگ) حیدرآباد سول سروس اب اس کا ترجمہ اُردو میں کر کے پبلک کی خدمت میں پیش کرتے ہیں - ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ایک کٹھن اور دشوار مہم مانی جاتی ہے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں ہوا کرتا مگر قابل مترجم نے اپنا فرض نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے - زبان نہایت صاف و رواں اور سہل و سادہ ہے اور سید جمیل حسین اس اعلےٰ ترجمہ کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ الہ آباد اکیڈمی نے اس کتاب کی نشر و اشاعت کی ہے مصنف نے اس کتاب کے دوران میں جا و بیجا موقع و بے موقع یہ رٹ لگائی ہے - کہ محمود لٹیرا اور ڈاکو تھا - وہ ہندوستان کے مندروں کی دولت لُوٹ کر لے گیا - علاوہ ازیں اس کے اخلاق اور چال چلن پر بھی چھینٹے اڑائے ہیں۔

محمود پر ڈاکٹر محمد ناظم کے فاضلانہ مقالے کے موجود ہونے کے باوجود حبیب صاحب کی اس کتاب کو ترجمہ اور اشاعت کے لئے انتخاب کرنا ہم کو عجیب معلوم ہوتا ہے - ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اکیڈمی نے ہیرے اور کنکر اور موتی اور پوتھ میں مطلق تمیز نہیں کی - بلکہ مسلمانوں کی دلآزاری کا بیج بویا ہے - اکیڈمی کو معلوم رہے کہ یہ کتاب بحیثیت کتاب تاریخ مستند نہیں مانی جاسکتی - محمود پر قدیم ماخذ عربی اور فارسی زبانوں میں محفوظ ہیں اور پروفیسر حبیب

ان دونوں زبانوں سے نابلد مطلق ہیں۔ ان کا دارومدار زیادہ تر ایلیٹ اور ڈوسن کے ان تراجم پر ہے۔ جو مؤرخین کی تاریخ ہندوستان میں درج ہیں۔ ان تراجم کے متعلق پروفیسر ہودیوالا کی قابل قدر تالیف "ہندوستانی تاریخ کی تنقید" پڑھنے کے بعد ہمارا اعتماد اٹھ جاتا ہے ؀

حبیب صاحب کا ایک اور ادبی کارنامہ حضرت امیر خسرو دہلوی کی خزائن الفتوح کا انگریزی ترجمہ ہے۔ جس پر اسی میگزین میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ بشرط فرصت ہم ارادہ کر رہے ہیں کہ حبیب صاحب کے سلطان محمود غزنوی پر بھی آئندہ کسی وقت مفصل تبصرہ کیا جائے؀

ہم اپنے میگزین کے ناظرین کی خدمت میں یہ ناخوشگوار اطلاع دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ نے حبیب صاحب کی اس فسادی کتاب کو حوالے کی کتاب کے طور پر اپنی فہرست کتب میں شامل کر رکھا ہے ؏

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

حیات جاوید (طبع جدید) ۔ " سر سید احمد خاں کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں۔ انہیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے۔ کہ وہ ہمارے لئے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں۔ جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے "؀

اسی تقاضا سے مجبور ہو کر انجمن ترقی اُردو نے سر سید احمد خاں کی مشہور آفاق سوانحِ عمری حیات جاوید جو مولانا حالی نے لکھی ہے۔ دوبارہ شایع کی ہے۔ حیات جاوید کا پرانا ایڈیشن کسی حد تک کمیاب ہو چلا تھا۔ اور اب ضرورت تھی کہ اس قیمتی اور مفید کتاب کو سہل الحصول بنانے کی کوشش کی جاتی۔ انجمن ترقی اُردو اس خدمت کے لئے مستحق شکریہ ہے ؀

کتاب کے شروع میں مولانا حالی اور سر سید احمد خاں کے فوٹو ہیں اور آخر میں

اسماء الرجال، اماکن اور کتب و مولفات کا انڈکس ہے، جس سے قدیم ایڈیشن کے مقابلہ میں یہ ایڈیشن زیادہ مفید ہوگیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا کچھ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ انڈکس کی ترتیب الفاظ کچھ سائنٹیفک نہیں۔ مثلاً بہتر ہوتا۔ کہ "خان بہادر برکت علی" کو "برکت علی، خان بہادر" لکھا جاتا۔ "مسٹر بدرالدین طیب جی" کی بجائے "بدرالدین طیب جی" یا "طیب جی، بدرالدین" مناسب ہوتا۔ بہر حال انڈکس کی موجودگی ان معمولی فروگزاشتوں کی تلافی کر دیتی ہے۔

اس ایڈیشن میں کتاب کے آخر میں پانچ ضمیمہ جات ہیں۔ اوّل سرسید کا نسب نامہ، دوم سرسید کی تصنیفات کی فہرست، سوم سرسید کے چند خواب، چہارم رسالہ اسباب بغاوت ہند، پنجم مصنف (حالی) کا مضمون متعلق بہ تفسیر القرآن۔

ان ضمیمہ جات سے کتاب کی افادی حیثیت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔

(س۔ م۔ ع)

مطبوعات انجمن ترقی اُردو

۱۔ تقویم ہجری و عیسوی۔ [سلسلہ انجمن ترقی اردو۔ نمبر ۱۲۲۔ صفحات ۵۰۷]

اگرچہ انگریزی زبان اور یورپ کی دوسری زبانوں میں ہجری اور عیسوی سنین کی تطبیق کے لئے بہت سی تقاویم موجود ہیں۔ لیکن اُردو زبان میں اب تک کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی۔ جو مستند ہونے کے علاوہ مکمل بھی ہو۔ اب جناب ابوالنصر خالدی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) نے بنظر ثانی مولوی محمود احمد خاں صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اُردو کی طرف سے یہ "تقویم ہجری و عیسوی" شایع کی ہے۔ جس کی بنیاد وسٹنفلڈ اور ماہلر صاحبان کی تقویم پر رکھی گئی ہے۔

جیساکہ مقدمہ میں مذکور ہے۔ عام جنتریوں میں یہ بڑی دقت پیش آتی ہے۔ کہ بہت سی ورق گردانی کے علاوہ علیحدہ حساب بھی کرنا پڑتا ہے.... لیکن اس اُردو تقویم میں یہ بات نہیں۔ اس سے ہم نہ صرف صحیح سنہ اور تاریخ معلوم کر سکتے ہیں۔ بلکہ

دل کامی ۔

جس طرح مالر کی تقویم میں دنوں کے لئے اشارات مقرر ہیں ۔ اس میں بھی اشارات مقرر ہیں ۔ مثلاً شنبہ = ش، یک شنبہ = ی وغیرہ ، اسی طرح عیسوی مہینوں کے لئے ایک، دو، تین، چار وغیرہ کے اعداد مقرر کئے گئے ہیں ۔

اس تقویم میں وستنفلد اور مالر کی تقویم کی طرح سلہ ہجری سے ۱۵۰۰ھ ہجری تک کی مطابقت دکھائی گئی ہے ۔

مالر کی تقویم کے آخر میں ترکی سنوں کے متعلق جو ضمیمے ہیں ۔ وہ اس میں موجود نہیں ۔

انجمن ترقی اُردو کی اس تقویم سے علمی تحقیق کرنے والوں کے کام میں بہت آسانی پیدا ہو گئی ہے ۔

طباعت و کتابت عمدہ ہے ۔ (س ۔ م ۔ ع)

(ب) تاریخ ادبیات ایران درعہد جدید ۔ (نمبر ۱۲۵) ص (تان ۶۷۷+)

پروفیسر براؤن کی مشہور کتاب " پرشین لٹریچر ان موڈرن ٹائمز" کا یہ اردو ترجمہ ہے جو سید وہاج الدین احمد کمنوری (جامعۂ عثمانیہ) نے کیا ہے اور جس کو انجمن ترقی اردو نے گذشتہ سال شائع کیا ہے ۔ انجمن نے پروفیسر موصوف کی تصنیف " تاریخ ادبیات ایران " کا مکمل ترجمہ شائع کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے ۔ جس کی یہ چوتھی اور آخری جلد ہے ۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اب صرف دوسری جلد کا ترجمہ ہونا باقی رہا ہے ۔ علمی دنیا انجمن کی اس خدمت کی بے حد ممنون ہے ۔

کتاب زیر تبصرہ کو ہم نے جستہ جستہ اصل انگریزی سے مقابلہ کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مترجم نے اس بات کا التزام نہیں کیا کہ ترجمہ بالکل " وفاداری " کے ساتھ کیا جائے بلکہ صرف اس بات پر قناعت کی ہے کہ مصنف جو کچھ کہنا چاہتا ہے ۔ اس کو بطریق احسن

ادا کر دیا جائے اگرچہ الفاظ کی پابندی نہ ہو۔ ہم اس بات کو کچھ ایسا قابل اعتراض نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہ ایک علمی کتاب کے ترجمے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ مصنف کے مفہوم کی ترجمانی کر دی جائے۔ ترجمے کی زبان پختہ اور صاف ہے۔ اور کتاب کی طباعت خاصی اچھی ہوئی ہے *

افسوس ہے کہ ترجمے میں اصل کتاب کی تصاویر کو حذف کر دیا گیا ہے ، اور تصویریں تو خیر لیکن ان میں بعض شعراء اور مصنفین کے خطوں کے نمونے بھی تھے جن کے فوٹو دیئے گئے تھے اور وہ قارئین کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہیں ۔ مثلاً مرزا صائب کے خط کا نمونہ اور اس کے علاوہ وصال، یغما، ملا محمد باقر مجلسی، ملا صدرا، بہاء الدین عاملی، ملا محسن فیض کے خطوں کے نمونے ہیں ۔ ان کے فوٹو کا ترجمے میں دیا جانا ضروری تھا *

ایک اور بڑی فروگذاشت انڈکس کی ہے ۔ جس کے بغیر ایک علمی کتاب اپنے فائدے اور اہمیت میں آدھی رہ جاتی ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ اشاعت آئندہ میں ان دو خامیوں کی تلافی کر دی جائے گی *

(ج) **فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں (جلد اوّل)** [سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو نمبر ۱۲۶ ۔ صفحات ۲۳۷ ۔ طباعت وکتابت عمدہ]

یہ کتاب جیسا کہ مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی (مؤلف) نے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے ۔ ہندوستانی پیشہ وروں اور صنّاعوں کی اصطلاحات کو جمع کرنے کی پہلی کوشش ہے ۔ درحقیقت یہ کام جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے ۔ کیونکہ لغات اور کتابوں سے اس بارے میں بہت کم مدد ملتی ہے ۔ اور اس کے لئے مؤلف کو مختلف پیشہ وروں اور صنّاعوں سے ملنے کی ضرورت پڑی ۔ چونکہ یہ پیشہ ور عموماً تعلیم یافتہ نہیں ہوتے ۔ اس لئے انہیں اصطلاحات کی بگڑی ہوئی شکل ہی یاد

ہوتی ہے۔ اور لفظ کی اصلی نوعیت معلوم کرنے کے لئے بہت چھان بین اور تدقیق کی ضرورت پڑتی ہے ؛

کتاب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل تیاری مکانات اور اس کے متعلق پیشے۔ دوسری فصل۔ تہذیب و آرایش عمارات اور اس کے متعلق پیشے ضمنی ترتیب باعتبار حروف تہجی کے ہے۔ کتاب کے آخر میں انڈکس (اشاریہ) ہے ؛

اس لغت یا فرہنگ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں تصاویر کے ذریعے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔ تو لغات اُردو میں ایک مفید جدت ہے۔ البتہ یہ بات محسوس ہو رہی ہے کہ تصاویر زیادہ خوبصورت نہیں۔ ان کو زیادہ خوبصورت بنانا چاہیئے تھا ؛

جہاں یہ کتاب نہایت مفید اور قابلِ قدر ہے۔ وہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض جگہ تشریح لغات میں کسی قدر بے احتیاطی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مثلاً ازارا یا اجارا (ص ۹۸) کے متعلق لکھتے ہیں کہ اجارا رختے کا تیار کیا ہوا ہے" حقیقت میں لفظ اجارا بھی ازار یا آزارا کا گنواری کا تلفظ ہے۔ ازار عربی میں اور پھر اس کے توسط سے فارسی میں ازبند، شلوار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ فارسی میں اس کے معنی بُن اور دامن کے بھی آتے ہیں (دیکھو فرہنگ اندراج) معلوم نہیں کہ مؤلف نے اس دوسرے تلفظ (اجارا) کو اصطلاحی شکل کیوں دے دی۔ اور علی الخصوص اجارا کے معنی "رختے کا تیار کیا ہوا" کہاں سے لئے ؛

لفظ مِنشار (بالکسر) عربی زبان میں ارہ کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن اس لغات میں بالضم لایا گیا ہے (ص۲۱) اس کا ہندوستانی تلفظ بھی یہی ہے۔ چنانچہ فرہنگ آصفیہ میں بھی بالکسر آیا ہے ؛

(ص۲) خلّاصی بہ تشدید لام عوام کا استعمال ہے۔ اس کی اصل شکل خَلاصی ہے (بہ تخفیف لام) جیسا کہ فرہنگ آصفیہ میں ہے۔ بُخاری (ص۱) " بخاری دراصل لکھوائی (یعنی دیوار کے پاکھے کے اندر خانہ داری کا معمولی سامان رکھنے کو بنائی ہوئی جگہ) کا بگاڑا ہوا ہے۔ جو کملمان کاریگروں میں زبان زد ہو کر عام فہم ہو گیا اور گنواری زبان میں باکھر، بکھار اور بکھاری کہلانے لگے" لیکن صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس کے ہندوستانی ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ بخاری کا لفظ فارسی میں بمعنی آتشدان

استعمال ہوتا ہے۔ فرہنگ اندراج میں لکھا ہے :-

" در بلاد سردسیر سرکشادہ مثل طاقے در دیوار خانہا سازند و آتش درآں برکنند تا خانہ گرم باشد۔ باقر کاشی ے

در بخاری مرغ برکف جام مے روزگار برف وباراں یاد باد"

اس میں شک نہیں۔ کہ پاکھا کا معنی پہلو اور بازو ہے (ملاحظہ ہو فرہنگ آصفیہ) اور اس لحاظ سے بخاری کے معنوں سے کچھ مماثلت سی پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ کہ لفظ بخاری ہندوستانی ہے اور پاکھا سے بگڑا ہوا ہے محل نظر ہے ؛

بعض اصطلاحات ایسی ہیں۔ جن کی مفصل تشریح آئین اکبری میں موجود ہے لیکن ہمارے مؤلف نے نہایت مختصر تشریح کرنے پر کفایت کی ہے اور آئین کی تفاصیل سے فائدہ نہیں اٹھایا مثلاً چوبیں راوٹی، دو آشیانہ منزل، زمین دوز، سراپردہ، خرگاہ، شامیانہ، منڈل، گلال باڑ (جسے مؤلف نے کلال بار یا کلاں بار لکھا ہے) یہ سب اصطلاحیں آئین میں موجود ہیں ؛

اُمید ہے کہ جلد دوم کی ترتیب میں تحقیق و تفحص کے ان پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جائیگا۔

ہماری رائے میں لغات اردو میں اس قابل قدر تصنیف سے ایک قیمتی اضافہ ہوا ہے جس کے لئے انجمن ترقی اُردو مستحق تحسین ہے ؛ (س ۔ م ۔ ع)

(د) **انجمن ترقی اُردو کی کہانی** (سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند نمبر ۱۲۹) مرتبہ مولوی غلام ربانی (سررشتہ آثار قدیمہ سرکار عالی) ۱۹۳۹ء۔

انجمن ترقی اردو ملک کا نہایت مشہور علمی و ادبی ادارہ ہے جس کی سرپرستی میں اردو کی بہترین تصنیفات قدیم وجدید شایع ہوئی ہیں ۔ رسالۂ ہذا میں جناب مولوی غلام ربانی اس انجمن کی تاسیس اور بعد کی سرگذشت کی کہانی سناتے ہیں۔ ۱۹۰۳ء کے دربار دہلی کے موقعہ پر جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ یہ انجمن وجود میں آئی۔ اس کے پہلے سکرٹری مولانا شبلی نعمانی مرحوم مقرر ہوئے ۱۹۰۵ء میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کا تقرر عمل میں آیا ۱۹۰۹ء میں مولوی عزیز مرزا کو یہ اعزاز حاصل ہوا ۔ ان کے انتقال پر قرعۂ انتخاب جناب مولوی عبدالحق صاحب موجودہ سکرٹری انجمن کے نام پر نکلا۔ جن کا زمانہ انجمن کی زندگی کا سنہری زمانہ کہا جاسکتا ہے ۔جب انجمن ترقی اردو حقیقی معنوں میں ترقی اردو بنتی ہے اور اب تو مولانا عبدالحق اور انجمن ترقی اردو

دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم بن گئے ہیں اور ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔
۱۹۱۳ء تک انجمن صرف چھ کتابیں شایع کر سکی تھی لیکن آج اس کی مطبوعات کی تعداد ڈیڑھ سو
کے لگ بھگ ہے۔ جن میں متعدد کتابیں کئی کئی بار چھپ چکی ہیں۔ اردو زبان کے دو بہترین
رسالے انجمن کے زیر اہتمام شایع ہوتے ہیں۔ پہلا رسالہ "اُردو" ہے جس نے گذشتہ بیس سال سے
اُردو کی لسانی وادبی خدمت میں حصہ لیا ہے۔ اس کے مضامین نہایت محققانہ اور انقلابی ہوتے ہیں
دوسرا رسالہ "سائنس" ہے جو محض علمی ہے اور اپنے دائرۂ عمل میں کامیاب خدمت انجام دے رہا ہے۔
نواب عماد الملک مرحوم کی تحریک پر ابتدا میں حضور نظام نے بارہ سو روپے سالانہ کی امداد انجمن
کے لئے منظور فرمائی۔ ۱۹۱۶ء میں سر اکبر حیدری کی کوشش سے یہ امداد پانچ ہزار روپے سالانہ کر دی گئی
علیا حضرت مرحومہ فرمانروائے بھوپال پچاس روپے ماہوار کی مستقل اعانت کرتی رہیں۔ اس کے علاوہ
اخراجات طبع کے سلسلے میں بھی یکمشت امداد فرمائی۔ گذشتہ سال کے آغاز میں سالانہ بیس نئی کتابیں
شائع کرنے کی شرط پر حضور سلطان العلوم نے چھ سال کے واسطے انجمن کو پینتالیس ہزار روپے سالانہ
کی بیش قرار امداد دینی منظور فرمائی ہے جس کے ذریعہ سے ہم امید کرتے ہیں اُردو ادبیات کو بہت کچھ
سرسبز اور بارور ہونے کا موقع مل جائے گا۔ آخر میں ہم انجمن کے دیرینہ سال کاروان سالار ڈاکٹر عبدالحق
کی درازی عمر کے لئے دعا کرتے ہیں تاکہ انجمن کا قافلہ بخیر وخیریت اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔
رسالہ کی قیمت ۴ ؍ ہے اور انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے ملتا ہے۔

(۵) خمسۂ کیفی ۔ [سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو نمبر ۱۳۰۔ ص ۰۷۔ قیمت ۴ ؍۔ طباعت کتابت عمدہ]
یہ جناب پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی کے تین مضامین اور دو نظموں کا مجموعہ ہے
جن کا تعلق بیشتر اُردو زبان اور ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات سے ہے۔ نظموں کے عنوان یہ ہیں
"ہماری زبان" اور "ترقی اُردو"۔ نثر کے مضامین یہ ہیں۔ "اُردو ہماری زبان"، "اردو لسانیات"، "ہندو مسلمانوں
کے کلچرل تعلقات"۔ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ فرقہ پروری کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ اور غیریت اور
بیگانگی کے اثرات ہندوستان کی متحدہ معاشرت کی فضا کو مسموم کر رہے ہیں۔ جناب پنڈت کیفی کا وجود
مغتنم ہے جو بلبل تنہا کی طرح اپنے نغموں سے اتحاد اور یگانگی کے پُرانے دور کی یاد تازہ کر رہے ہیں
پنڈت جی فرماتے ہیں: "اُردو کیا ہے؟ دو مختلف معاشرتوں، دو مختلف مذہبوں، دو مختلف کلچروں کے
شیر وشکر ہونے اور ارتباط کی یادگار (ص۱۰) لیکن افسوس ہے کہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کے بڑھتے ہوئے
جذبۂ انفرادیت نے اس شیریں یادگار کو بھی نیست ونابود کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پنڈت کیفی اسی کی

وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "میں ہندی اور ہندی والوں کو دیکھتا ہوں اور سنتا ہوں لیکن اُردو والوں کو سمجھتا ہوں۔ اور بلا خوف اختلاف کہتا ہوں کہ اگر یہ ساٹھ برس میں نے اُردو کے پیچھے اور اُردو والوں میں بے فائدہ ضائع نہیں کئے۔ تو میں جانتا ہوں کہ اُردو والے جو واقعی اُردو کے کفیل اور وکیل ہیں ان کو یہ سانسا نہیں۔ کہ اُردو کے ساتھ دین اسلام اور ملّت بیضا پست ہو جائیں گے۔ اُن کو اور مجھ کو رونا ہے تو یہ کہ اُردو کی مخالفت جس جوش و خروش کے ساتھ اب شروع ہوئی ہے اور جو غلط پراپگنڈا کیا جا رہا ہے اس کا زہریلا اثر وطنیت اور صدیوں کی بنائی ہوئی کلچر کو ملیامیٹ کر دے گا اور ہمارے ہندوستانی تمدّن اور معاشرت کی وجاہت کا خون اپنی گردن پر لے گا۔" پنڈت جی نے مؤثر اور زوردار پیرایہ میں اہل ملک کو جو نصیحت کی ہے۔ وہ اس قابل ہے۔ کہ توجہ کے کانوں سے سُنی جائے ۔

پنڈت جی نے اپنے مضمون "ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات" میں لکھا ہے کہ "ایک حقیقت ہے جو اس سوال اور اس کی اہمیت سے بالاتر ہے۔ وہ ہے کلچرل ہم آہنگی۔ مغربی اتّصال نے چاہے کوئی شکل اختیار کی ہو۔ کلچرل یونٹی جو ہم میں پہلے سے موجود ہے اس کے رنگ کو مدھم نہیں پڑنے دینا چاہیئے" راقم الحروف کے خیال میں پنڈت جی کو مغربی اتّصال کے متعلق جو حُسن ظن ہے۔ وہ کچھ بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ہندی اُردو کے جھگڑے بیشتر اسی مغربی اتّصال کی پیداوار ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ جماعتوں میں جب سے غلبہ اور اقتدار حاصل کرنے کا احساس پیدا ہُوا ہے، پرانی کلچرل یونٹی اور قدیم اتحاد اسی دن سے رخصت ہے، اور یہ الفاظ صرف سیاستدانوں کی فریب دہ اور تصنّع سے لبریز اصطلاحوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر کلچرل اتّحاد واقعی عزیز چیز ہے تو اس کے لئے ہمیں مخلتی دَور کے اساس و اصول پر جمع ہونا پڑے گا۔ ورنہ ڈر ہے کہ یہ سب باتیں صدا بہ صحرا ہو کر رہ جائیں گی ؛

اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق پنڈت جی نے ایک بیان دیا ہے۔ کہ "ہندوستان میں اسلامی حملوں اور فتوحات سے پیشتر اُردو کی داغ بیل پڑ جانا قرین قیاس ہے" ص ۹۔ افسوس ہے کہ پنڈت جی نے اپنے اس قیاس کے لئے کوئی شواہد پیش نہیں کئے۔ اگر اُردو کی داغ بیل پڑنے سے مُراد یہ ہے کہ اسلام سے قبل ہندوستان کی مقامی زبانوں پر ایرانی زبان کا اثر پڑتا رہا اور اس وجہ سے دیسی زبانوں میں ایرانی زبان کے عناصر کی آمیزش ہو گئی ہے تو پنڈت جی کا ارشاد قابل تسلیم ہو سکتا ہے لیکن اُردو جسے ہم اُردو کہتے ہیں ہندو مسلمانوں کے میل جول کی یادگار ہے جیسا کہ پنڈت جی نے اپنے اس مضمون میں متعدد مرتبہ فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میل جول پُر زور طریق پر محمود غزنوی کی سیاسی فتوحات سے شروع ہوتا ہے۔ جس کے بعد پنجاب میں اردو کی تخلیق کی ابتدا ہو جاتی ہے جیسا کہ 'پنجاب میں اردو' کے فاضل مصنف

پروفیسر شیرانی صاحب نے عمدہ اور وزنی دلائل سے ثابت کر دیا ہے۔

پنڈت جی اپنی دلیل کے طور پر منشی قمرالدین کی کتاب "تحقیق اللسان" سے ایک حوالہ دیتے ہیں:
"پیش از سلطنت اسلام نیز رایان و راجگان ہند با سرِ آرایان ایران و افغانستان نامہ ہا و مکاتب بہ زبان پارسی می نوشتند و پیغامہا بہ زبان سفیر پارسی می گذاشتند"۔ (خمسہ صـ۹)

ہمارے خیال میں منشی قمرالدین کا یہ بیان مبہم ہے بلکہ کسی حد تک اصلاح طلب ہے کیونکہ فارسی سے عام طور پر وہ زبان مفہوم ہوتی ہے جو اسلامی عہد کی یادگار رہے اور یہ کہنا کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ رایان ہند فارسی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ ہاں اتنی بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ قدیم راجگان ہند شاہان ایران سے اس وقت کی ایرانی زبان میں خط و کتابت کرتے ہوں گے۔ متعارف فارسی زبان اسلامی زمانے میں معرض وجود میں آئی اس کا ارتقا ایران پر اسلامی فتوحات کے بعد ہی ممکن معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان سے فارسی بولنے والی اقوام کا پہلا اختلاط غزنویوں کے بعد ہوا۔ یا پھر بقول ابن حوقل اور اصطخری کے اہل مکران (جو خود ایران ہی کا حصہ ہے) فارسی اور مکرانی زبان بولا کرتے تھے لیکن حاشا اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ راجگان ہند قبل از اسلام متعارف فارسی زبان میں خط و کتابت کیا کرتے تھے۔

ہمارے پنڈت جی نے اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ "البیرونی نے جو ہندوستان میں پنڈتوں سے سنسکرت پڑھی۔ تو درس و تدریس کی زبان کیا تھی؟ کوئی مشترک زبان ضرور ہوگی ورنہ استاد شاگرد کو درس کے معنی اور مطلب کس طرح سمجھا سکتا" (خمسہ صـ۹) پنڈت جی کا اندازہ ہے کہ غالباً فارسی یا اردو زبان ہی اس معاملہ میں کام آتی ہوگی لیکن کیا اس کام کے لئے شمال مغربی ہندوستان کی پراکرتیں موجود نہ تھیں قرین قیاس یہ ہے کہ انہی زبانوں سے ہی البیرونی نے کام لیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندو شاہیوں کے عہد میں خود افغانستان میں ہی سنسکرت کا اور اس کے علوم میں رسمی استعداد کا پیدا ہونا البیرونی کے لئے ممکن ہو سکا ہو جس کی تکمیل اس نے بعد میں ہندوستان میں رہ کر کی ہو۔ ناظرین کرام کو معلوم ہی ہے کہ ہندو شاہیہ کی سلطنت افغانستان اور صوبہ سرحدی اور پنجاب کے بعض حصوں میں قائم تھی اور سبکتگین اور محمود نے ان علاقوں کو ان سے فتح کیا۔

ہمارے خیال میں پنڈت جی کا یہ خیال کہ ہندوستان میں اسلامی تسلط سے پیشتر فارسی کا علم کم و بیش موجود تھا محتاج بحث ہے اور نہ یہ بات درست ہے۔ کہ "جبھی تو چند کوی کی نظموں میں فارسی الفاظ اور کہیں کہیں فارسی مرکبات ملتے ہیں جو محققوں کو چونکاتے ہیں" (خمسہ صـ۱۰) اس لئے کہ چاند کوی کی پرتھی راج راسا پروفیسر شیرانی صاحب کی فاضلانہ تحقیق کی رو سے مغلیہ دور کی تصنیف ہے۔ بایں ہمہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے پنڈت جی کے علمی نتائج اور مخلصانہ خیالات دلوں میں اردو زبان کے متعلق پُرجوش خلوص پیدا کرتے ہیں۔ ان کی خدمات زبان اردو کے سلسلے میں بیش بہا ہیں اور انجمن ترقی اردو کی فرض شناسی کی ہم داد دیتے ہیں کہ کیفی صاحب کے اس مجموعۂ مضامین کو زیور طباعت سے آراستہ ہونے کا موقعہ ملا۔ (س۔ م۔ ع)

اردتك ان تُضحى وزيراً فلم اجد　　　　له سَبَبًا يُوليك ذاك سوى العَرَج

يشير الى انّ اكثر ارباب الدّولة بهم داء المفاصل وينقلون في مِحَفَّةٍ ؛

(۲۰۶) مجد الدين اسماعيل بن ابى بكر بن عبد اللطيف الأزجىّ المقرى

سمع على الشيخ مفيد الدين عبد الرحمن بن سلمان ابن عبد العزيز بن المجلّج سنة تسع وتسعين وستّمائة ؛

(۲۰۷) مجد الدين اسماعيل بن الحاج داوود بن ابى الخليل الدُّورِىّ

سَمِع من مشائخنا ؛

(۲۰۸) مجد الدين اسماعيل بن عبد الرحمن الماردينىّ نزيل دِمَشق

(۲۰۹) مجد الدين ابو محمّد اسماعيل[2] بن كمال الدين

---

[1] المتوفّى سنة ۷۰۰ هـ؛ وترجمته فى تاريخ العراق (۱: ۳۰۸) والشذرات (۵: ۴۵۷)

[2] فى بيانه شبهةٌ اذ لم يذكر احدٌ غيرهٗ اسم اسماعيل فى اولاد عمر ابن العديم ؛ وقال السيوطى فى حسن المحاضرة (۱: ۱۹۸): ولده (ولد كمال الدين عمر بن العديم) مجد الدين عبد الرحمن كان عالمًا بالمذهب . . . وهو اوّل حنفىٍّ خطب بجامع الحاكم . . . ولد سنة ثلاث عشر وستّمائة ومات فى ربيع الآخر سنة سبع وسبعين واذا قارنّا به انّ وفاة عمر بن العديم سنة ۶۶۰ هـ وهى السنة التى يقول المصنّف انّه مات فيها اسماعيل ؛ كانت مظنّة قويّة للشكّ فيما يقوله المصنّف ؛

عمر بن احمد بن ابی جرادة المعروف بابن العدیم العُقَیلیّ الحَلَبیّ الخطیب

من بیت العلم والفضل والرئاسة اشتغل وحصّل و وانتقل من الشام الی مصر ورتّب خطیبًا بجامعها ، ومن شعره :—

ما اسمٌ اذا نصبتهٗ رفعت ما تنصبُ به
ولا یتمُّ رفعه الّا بجرّ سببه

توفّی بمصر سنة ستّین وستّمائة ؛

(۲۱۰) مجد الدین اسماعیل بن لولو البغدادیّ الصیدلانی

کتب الیّ من بغداد الی تبریز .—

اذا ما حلت من نور وجهك بلدةٌ فلا امتزّ یومًا للسرور لها ثغرُ
ولا اخضرّ منها العود بعد جفائه ولا جاد فی اطلالها ابدًا قُطْرُ

(۲۱۱) مجد الدین اسماعیل بن محمّد بن علیّ القوصیّ الفقیه

کان القوصیّ من الفقهاء الافراد العلماء وله سماعٌ بالحدیث وکتب الکثیر بخطّه ؛

(۲۱۲) مجد الدین اسماعیل بن محمّد بن لولو البغدادیّ المتطبّب الصیدلانیّ

من اعیان الاطبّاء والعلماء ، من الجماعة الذین عُیّن علیهم فی الاشتغال بتصنیف المخدوم الفاضل الوزیر الکامل رشید الدین فضل الله بن ابی الخیر بن عالی بالمدرسة

التی انشأها ابالغزانی بباب الظفریة سنة ثلاث عشرة وسبع مائة ؛

(۲۱۳) **مجد الدین اسماعیل بن محمد بن نجار الدجیلی**[1]

سمع معنا علی شیخنا عفیف الدین عبد السلام بن مزروع سنة احدی وتسعین وستمائة ؛

(۲۱۴) **مجد الدین اسماعیل بن محمد بن یاقوت السلامی التاجر**

(۲۱۵) **مجد الدین** ابو محمد اسماعیل بن المطهر ابن نصر التعویذی الشابرخواستی الصوفی

ذکره الحافظ ابوطاهر احمد بن محمد السلفی فی کتاب معجم السفر، وقال: حدثنا بشابرخواست عن الفقیه ابی القاسم مکی بن الفرج بن محمد بن زید القرمیسینی ؛

(۲۱۶) **مجد الدین اسماعیل بن مکی بن عبد الرحمن الماردینی**

رأیته[2] اخذ فی الحکمة[3]* سنة ۶۹۶ ؛

(۲۱۷) **مجد الدین** ابوالفدا **اسماعیل بن موسی**

---

[1] المتوفی سنة ۶۹۶ھ؛ الشذرات (۵: ۴۳۵ بما بعدها) [2] انظر تاریخ العراق بحسب الفهرس؛ [3] هکذا قرأنا الجملة بعد صعوبة فی قراءتها لازمة لسرعة الکتابة، ولا نتیقن بصحة القراءة بعدُ؛

بن ابراهيم البومارى[1]

روى عن القاضى ابى الفتح محمّد[2] بن احمد بن المندائى الواسطى، روى لنا عنه شيخنا تقى الدين ابو الحسن علىّ[3] ابن عبد العزيز بن محمّد الاربلى المقرى بمدينة السلام سنة تسع وسبعين وستّمائة؛

(۲۱۸) **مجد الدين** ابو القاسم اسماعيل بن نصر الرازى المعدّل

روى عن الامام ابى الفضل عبيد الله بن محمّد الحِميَرى روى عنه الحافظ ابو طاهر السِلَفى؛

(۲۱۹) **مجد الدين** ابو ابراهيم اسماعيل بن افضل الدين نيكروز بن فضل الله السيرافى الشيرازى قاضى القضاة بشيراز

قاضى القضاة كان من اعيان القضاة والحكّام وافراد ائمّة الاسلام، سمع صحيح البخارى على الامام علاء الدين ابى سعد ثابت بن محمّد بن ثابت الخُجَندى، عن ابى الوقت عبد الاوّل بن عيسى بن شعيب بسنده، روى لنا عنه ولده قاضى القضاة ركن الدين يحيى بن اسماعيل؛

---

[1] نسبة الى بُوْمَارِيَة وهو - كما قال ياقوت - بليد من نواحى الموصل قرب تل يعفر؛

[2] م ٦٠٥هـ؛ الشذرات (٥: ١٧) بتصحيف المندائى الى الميدانى؛ [3] ولد سنة ٦١٠هـ ترجم له الجزرى فى غاية النهاية (١: ٥٥٠) وقال: وقال ابن الفوطى مات فى خامس رجب سنة ثمان وثمانين وستّمائة؛

(٢٢٠) **مجد الدين** ابو محمّد اسماعيل بن ابى القاسم هبة الله بن ابى نصر بن ابى الفضل الحربىّ المحدّث

ذكره الحافظ ابو عبد الله محمّد بن سعيد بن الدُّبيثى فى تاريخه، وقال: كان يُعرف بابن الدقيقه، سمع ابا القاسم عبد الله بن احمد بن يوسف، سمعنا منه، وتُوفّى يوم عاشوراء من سنة خمس وتسعين وخمسمائة؛

(٢٢١) **مجد الدين** ابو ابراهيم اسماعيل بن ركن الدين يحيى بن اسماعيل الشيرازىّ القاضى الفاضل

حفيد المتقدّم ذكره، قدم فى خدمة والده ركن الدين الى حضرة سلطان الوقت غازان بن محمود بن ارغون[1]، ونزل بالمدرسة المستنصريّة سنة ثمان وتسعين وستّمائة، وولى قضاء قُضاة شيراز بعد وفاة والده، و رأيته بالسلطانيّة سنة سبع وسبعمائة، وهو فاضل عالم، لادب والفقه والاصول والمعانى والبيان، وله رسائل واشعار فصيحة مليحة؛

(٢٢٢) **مجد الدين** ابو الفخر اسماعيل بن يوسف اللمطى المتولّى على قوص

كان اميراً عادلاً، وولى الاعمال السلطانيّة بمصر ونواحيها وهو الذى مدحه بهاء الدين زهير المصرىّ[2]، ويهنّيه

---

[1] ذكر قدومه على السلطان الجايتو بقراباغ فى تاريخ العراق (١: ٣٠٨) وذكر قصّة عجيبة فليراجع؛

[2] هو الوزير البهاء زهير (٥٨١ - ٦٥٦ هـ) ترجم له فى الوفيات و بروكلمن (١: ٢٦٤) وشهرته تغنى عن التعريف به؛

بولاية الاعمال القوصية بقصيدة فريدة اولها[١] :-

تمليّته يا ابن الاعزّ ملبسا وهنّيته يا غارس المجد[٢] مغرسا
قد منت تدوم الغيث للروض انّها به اشرقت حسنا وطابت تنفسا

منها :-

غمام همى بحر طمى قمر اضا حسام مضى ليث تسابحل[٣] رسا

منها :-

سما بك مجد الدين بن مجد[٤] محتد وعرض[٥] نماه الدين ان يتدنسا
لقد شرفت منك الصعيد[٦] ولاية فاصبح واديه[٧] به قد تقدّسا

(٢٢٣) مجد الدين ابو محمد اسماعيل بن يونس بن احمد المقدسي الكاتب

انشد لابن[٨] الرومي في الخمر :-

وعاتقة زفّت لنا من قرى كوثى تلقّب ام الدهر بل بنتها الكبرى
رأت نار ابراهيم ايام اوقدت وحازت من الاوصاف اوصافها الحسنى
حكت نورها في بردها وسلامها وبانت بطيب لا توارى ولا تخلى
عمرنا بها الايام في ظل ماجد له الرتبة العليا والمثل الاعلى

(٢٢٤) مجد الدين ابو الوضاح اشرف بن اياد بن اشرف الايادي الابهري الفقيه

---

[١] انظر ديوان البهاء طبع قمبرج (١: ١٢٢)؛ واسم الممدوح فيه مجد الدين بن اسماعيل اللمطي؛ قالها سنة ٦٠٠هـ وهي اول مديحه؛ [٢] في الديوان - الجود؛ [٣] في الديوان: مجدا و محتدا وعرضا؛ [٦] في الديوان. واديها؛ [٨] لم نجده في الديوان المطبوع لابن الرومي بعد؛

قدم بغداد مدينة السلام بعد حجّة الاسلام سنة عشرين وسبعمائة؛

(۲۲۵) **مجد الدين** ابو عيسى الياس بن محمّد بن علی الرومیُّ المحدّث

روی بسنده عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلّی الله عليه وسلّم: الارواح جنود مجنّدة فما تعارف منها ائتلف، وما تناكر منها اختلف؛ وفی رواية عن عبد الله بن عمر رضی الله عنهما: قال رسول الله صلی الله عليه وسلّم: الارواح جنود مجنّدة، فما كان فی الله ائتلف وما كان فی غير الله اختلف؛ وفی رواية سلمان رضی الله عنه انّ النبیّ صلّی الله عليه وسلّم قال: الارواح جنود مجنّدة فما تعارف منها فی الله ائتلف وما تناكر منها فی غير الله اختلف؛ وفی رواية عبد الله بن مسعود انّ النبیّ صلّی الله عليه وسلم قال: الارواح جنود مجنّدة تلتقی فتشامّ كما تشام الخيل فما تعارف منها ائتلف وما تناكر منها اختلف، فلو انّ رجلاً مؤمناً جاء الیٰ مجلسٍ فيه مائة منافق، وليس فيه الّا مؤمن واحد لجاء حتّی يجلس اليه، ولو انّ منافقاً جاء الیٰ مجلس فيه مائة مؤمنٍ وليس فيهم الّا منافق لجاء حتّی يجلس اليه؛ ومعناه انّ رُوح المؤمن تألف روح المؤمن وتتنكر المنافق و بالعكس؛

(۲۲۶) **مجد الدین الیاس بن محمد المراغی**

کان ممّن صَحِبَ مولٰنا نصیر الدین بخراسان و اشتغل علیه ؛

(۲۲۷) **مَجدُ الدین** ابوبکر **بشر** بن کریم **الحُوَیزیّ** رئیس الحُوَیزة

لستُ اعرف شیئًا من حاله ، وسمعتُ بعضَ اصحابنا یقولون انّه کان یرفق بالرعیّة ؛

(۲۲۸) **مجد الدین** ابوسعد **بشرٰی** بن عمدة الدین علیّ بن صالح الجهرمیُّ الکاتب

کان من الامراء العلماء ، سمع الحدیث علی الشیخ الحافظ المحدّث رشید الدین ابی الفضائل محمّد بن ابی بکر احمد بن ابراهیم الخالدیّ الشَّبَذیّ ، ومن جملة مسموعاته الاحادیث الثمانیة تخریج الحافظ جمال الدین احمد بن محمد المالکی بسماعه علی الشیخ نجم الدین الکبراء ابی الجناب احمد بن عمر الخیَوَقیّ سنة ستّ واربعین وستّمائة ؛

(۲۲۹) **مجد الدین** ابوبکر بن جمال الدین عبد الکافی بن عبد الرحمٰن المختاریّ التبریزیّ [62b 63a]

ممّن ورد بغداد فی صحبة الصاحب فخر الدین احمد فی شهر رمضان سنة تسع عشرة وسبعمائة للنظر فی احوالها واخذ الحساب من نُوّابها ؛

(٢٣٠) مجد الدين ابو بكر[1] يستى عبد الله ـ ابن معالى ابن احمد الرّيانى البغدادىّ الشاعر

قرأت بخطّ العدل نور الدين عبد اللطيف من بورنداز: اخبرنا الشيخ مجد الدين ابو بكر الريّانى بقراءتى عليه فى شهر ربيع الآخر من سنة عشرين وستّمائة بمنزله بالريّان مجاور مسجده، قال: اخبرتنا شهدة بنت احمد الإبَرى؛ وذكر حديثاً، قال: وانشدنا:—

اذا لم تُسامح فى الامور تعسّرت
عليك فسامح وامزج العُسر باليُسر
فلم ارَ اوقى للبلاء من التُقى
ولم ارَ للمكروه اشفى من الصبر

(٢٣١) مجد الدين ابو بكر[2] بن عبد الله يعرف بابن الداية الحلبىّ المُتولّى على حلب

ذكره العماد الكاتب فى كتاب البرق الشامى، وهو من بيت الرياسة والحكم بحلب واعمالها، وكان شجاعاً له فى الفرنج الحملات المشهورة.

---

[1] كان المصنف عرف اسمه بعد ترتيب الكتاب، وكانت وفاة الريانى سنة ٦٢٧ (الشذرات ٥ : ١٢٢) والريّان محلة ببغداد ذكرها ياقوت فى معجم البلدان؛

[2] توفى سنة ٥٦٥ وتولّى بعده اخوه شمس الدين على ابن الداية ولهما اخ آخر اسمه بدر الدين حسن بن الداية؛ راجع تاريخ الكامل (١١ : ١٣١) والوفيات ترجمة السلطان صلاح الدين يوسف؛

(٢٣٢) مجد الدين ابوبكر بن محمّد بن القاسم التُونسي النحوي[1]

كان اديبًا عارفًا بالنحو والادب، قرأت بخطّ بعض تلاميذه: انشدنا الشيخ مجد الدين:-

حديثٌ له حلو بما ذا اقيسُهُ ... فقد جاز حدّا لوهم والفهم الصِفَه

فهل ينبغى الّا كلّ الى مقالهُ ... يمرّ بذكره الريق والثغر والشفه

(٢٣٣) مجد الدين بهرامشاه بن [فروخشاه بن] شاهنشاه بن ايوب الشامي[2]

تقدم ذكره فى قافية [كذا] الهمزة؛

(٢٣٤) مجد الدين ابو المظفر بهزاد بن بدل بن اسماعيل الهَسَوىّ الشاعر النديم

كان شيخًا مهيب الصورة حسن الشيبة، جميل الملتقى مليح النظم بالفارسيّة، اقام ببغداد مدّةً فى خدمة الملك شهاب الدين سليمانشاه بن برجم الإيوائى[3]، نظم كتاب شاهنامه وذيّل عليه، ولمّا اُخذت بغداد سلِم مع من سلِم، واستوطن مراغة، وكان يتردّد

---

[1] توجد ترجمته فى الدرر الكامنة (١: ٦١) وبغية الوعاة ص ٢٥٦ ولد سنة ٦٥٦ﻫ وتوفّى سنة ٧١٨ﻫ؛ [2] هو الملك الامجد مجد الدين بهرامشاه من سلالة البيت الايوبىّ كان فيه فضل وله ديوان شعر قتله مملوكه فى داره سنة ٦٢٨ﻫ؛ راجع الوفيات (١: ٢٢٣) [3] من امراء المستعصم قتل مع الدواتدار وابنه سنة ٦٥٦ﻫ وعلّقت رؤسهم بالموصل؛ تاريخ العراق (١: ١٧٧)؛

الى حضرة مولانا السعيد نصير الدين ، وكان كثير المحفوظ
كتبت عنه ، وتوفى بمراغة سنة ست وستين وستمائة،
ويَسْوَى التى ينسب اليها من اعمال مراغة مما يلى [اشنو](١)

(٢٣٥) **مجد الدين** ابو الفضل ثابت بن محمد بن عمر الجغميني الخوارزمي الاديب

ذكره العماد الكاتب فى كتاب ذيل الخريدة وسيل الجريدة ، وانشد له :-

ضمانٌ على الايام ان تبلغ المدى وان ترغم الاناف من زمر العدى

منها :-

ايا ذا الندى لولاه ما من سعدا لكان العُلى فوضى ودين الهدى سدى
يحوط حمى الاسلام منك مدبرٌ تأزر بالمجد المؤثل وارتدى

(٢٣٦) **مجد الدين** ابو المعالى جعفر بن رشيق الخلاطى وزير ارمينية

لما مات شاه ارمن بخلاط سنة (٢) ثمانين وخمسمائة
لم يكن له ولد يرث ملكه ، ويقوم مقامه بعده وكان
البهلوان (٣) صاحب اذربيجان قد زوج شاه ارمن ابنته على
كبر سنه طمعا ان يأخذ البلاد ويستولى على القلاع بعده ،
فلما مات شاه ارمن استولى سيف الدين بكتمر على خلاط

(١) مقطوع بعضه فى التجليد والتكميل من معجم البلدان ؛ (٢) ذكر ابن الاثير وفاة شاه ارمن فى حوادث سنة ٥٨١ هـ؛ الكامل (١١ : ٢٣٢)؛ (٣) هو شمس الدين محمد البهلوان بن ايلدكز صاحب اذربيجان وغيرها توفى سنة ٥٨٢ هـ؛ انظر تاريخ الكامل حوادث سنة ٥٨٢ هـ؛

كما ذكرناه، ولمّا تمّ له[1] ما اراد حَبَس مجد الدين جعفر، وقال، هو كان السبب فى مكاتبة البهلوان، ولم يزل محبوسًا الى ان استولى[2] تقىّ الدين عمر بن شاهنشاه بن ايّوب فاطلق مجد الدين من حبس خلاط سنة سبع و ثمانين وخمسمائة؛

(۲۳۷) **مجد الدين** ابو منصور الحارث بن عبد الله ابن محمّد البَهْنَسِىّ الكاتب

كتب فى جواب رقعةٍ جاءته من صاحب له :—

وقفت على خطٍّ كأنّ سطوره عقودٌ من الدُّرّ الثمين لمنضدِ
فقبّلته الفًا ومازلتُ ناشرًا فضائله فى كلّ نادٍ ومشهدِ
فكان الى قلبى وقد شفّه الضنا الذّمن الماء الزلال المبرّدِ

(۲۳۸) **مجد الدين** ابو الحسن الحارث بن ابى المحاسن المهلّب بن الحسن بن بركات بن علىّ بن المهلّب بن غياث بن سليمان بن القاسم البَهْنَسِىّ المهلّبىّ الكاتب وزير الملك الأشرف[1]

من كلامه : اسعد الله الخدمة بقدوم السنة المباركة المجدّدة له طولَ الاعمار بمحمّد وآله الاطهار وصحبته الاخيار، والعبد فان كان بأرع المنطق جزل الالفاظ

---

[1] لم يأخذ تقىّ الدين الخلاط بل توفى محاصرًا لها. امّا مجد الدين فكان محبوسًا فى قلعة بقرب خلاط فقبض عليها تقىّ الدين فاطلقه (راجع تاريخ الكامل ۱۲ : ۳۰)؛ [2] هو مظفر الدين موسى بن العادل المتوفّى سنة ۶۳۵م؛ راجع لترجمته الى الوفيات (۲ : ۱۳۰ بما بعدها)؛

فصیح اللسان لا یهتدی الی شکر مولٰنا الذی انعمه فانّه انعم وزاد وبلغ المراد، ومهّد لعبیده اکناف رأفته وعنایته وحاطهم بشریف نظره ورعایته؛ وکان والده نحویًّا، ذکره یاقوت فی معجم الادباء[1]، وقال: توفی سنة سبعین وخمسمائة وانشد له فی صبیّین کانا یتعاشران ویقرآن فی کتاب الجُمَل[2] فی النحو

رأیت خِلّین محبوبین قد اُلِفا | بینًا من النحو فی باب من الجُمَل
بعد الثلاثین بابًا منه وانعکفا | علی قراءته بالقول والعمَل

یرید باب الفاعلین المفعولَین الذین یفعل کلّ واحد منهم بصاحبه ما یفعل به الآخر؛

(۲۳۹) مجد الدین ابو محمد الحسَن بن ابراهیم ابن یوسف البَعْلَبکّی المُنَجِّم

کان عارفًا بالنجوم وعمل المواليد وعلم الهیئة، قال بعض الاصحاب: رأیت بخطّ مجد الدین فیما یکتب علی الرّبع الذی یُرْصَدُ به:—

انا رُبع دائرة الفلك | طوبٰی لمن مثلی مَلَكْ
بی تُدْرَكُ الاوقاتُ حقًّا | ویقینًا دون شكْ

قلت: وهذان البیتان انشد نیهما مولٰنا

---

[1] لم نجده فی المطبوع من کتاب معجم الادباء وترجم له السیوطی فی بغیة الوعاة (ص ۲۹۹)؛ [2] للشیخ ابی القاسم عبد الرحمٰن بن اسحاق الزجاجی المتوفی سنة ۳۳۹؛ انظر کشف الظنون (۱: ۴۰۳)؛

محی الدین المغربی بالرصد سنۃ اربع وستین وستمائۃ[۱]

(۲۴۰) مجد الدین ابو علی الحسن بن احمد بن محمد الحمصی الادیب

انشد فی وصف فاصد طبیب :—

کأنہ من نصیحۃ و تقی — لنفسہ دون غیرہ فاصد
ان جمد الطبع جل منہ وان — ذاب تخلا لآ عادۃ جامد
یبقی علینا دم الحیاۃ ولا — یخرج الا المخبل الفاسد

(۲۴۱) مجد الدین ابو محمد الحسن بن احمد بن ھبۃ اللہ ابن امین الدولۃ[۲] الحلبی

سمع جزء الحسن بن عرفۃ علی موفق الدین ابی المحاسن فضل اللہ بن عبد الرزاق بن عبد القادر [الجیلی[۳]]

(۲۴۲) مجد الدین ابو محمد الحسن بن الیاس الرازی الفقیہ

یروی عن الحسن قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "لیس شیئ خیر من الف مثلہ الا الانسان وعمر خیر من الف مثلہ"؛ وفی روایۃ جابر رضی اللہ عنہ قال : "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : "ما شیئ خیر من

---

[۱] ھو محی الدین یحیی بن محمد بن ابی الشکر المغربی الاندلسی ترجم لہ المصنف فی موضعہ؛ [۲] قال الحافظ ابن حجر فی الدرر الکامنۃ فی ترجمۃ ابراھیم بن عبد اللہ بن عبد المنعم بن محمد بن ھبۃ اللہ، ان امین الدولۃ لقب ھبۃ اللہ؛ [۳] مقطوع فی التجلید والتکمیل من الاصل (ص 56 b)؛

الفِ مثله ؟ قيل : ما هو يا نبيّ الله ، قال : " الرجل المسلم "
وقال الحسن ما ظننتُ انّ شيئًا يساوی الفًا مثله ،
حتّى رأيت عبّاد بن الحصين[1] ليلةً كابُل وقد ثلم العدوّ
فی الستور ثلمةً فكان يحرس ذلك الموضع الف رجلٍ
فانهزموا الليلةَ وبقی عبّاد وحده يدافع عن ذلك الموضع
الی ان اصبح ؛

والناس الفٌ منهم كواحدٍ وواحدٌ كالالف إنْ امرٌ عنا

(٢٤٣) مجد الدين ابو الحسين الحسن بن علیّ بن حاتم البَيْهَقِیُّ الاديبُ

كان اديبًا عاملاً متودّدًا محبًّا للاصحاب مشكور الطريقة
من الاخوان ، ذكره فی تاريخ بيهق[2] ؛ وانشد له فی
الافتخار بالاخلاق الحسنة :-

كم اخٍ كان لی عدوًّا امبينا فهو اليوم لی صديق وخِلّ
كان فی قلبه هجيرٌ من الحقد فقد عاد فيه برد وظلّ

(٢٤٤) مجد الشرف الحسن بن علیّ بن ابی المعالی الحسنیّ النسّابة

[73b 74a]

من عهد كتبته ، وأمره بصون هذا النسب الذی
طهّره الله وكرّمه وبوّأه مقرّ الشرف النبویّ وحرمه

---

[1] هو عبّاد بن الحصين الحنظلیّ فارس تميم ، انظر لهذه الرواية كتاب المعارف (ص ١٨٢) ؛ [2] ص ١٢٣ ؛ ولم نجد انشادة هذا انيه ؛ انما ذكر اسمه فقط فی الحاشيين
وذكر البيهقیّ انّه مات ابنه ابو سعد سنة ٥٥٥ ھ ؛

عن دعوى الدُّخلاءِ وانتحال الادعياء فانّ ادّعى منه احد باطلاً وطوّق جِيْدَهُ بما اصبح من نحرهِ عاطلا ولم يكن له دليل فی کتاب الشجرة ولا برهانٌ يشهد له بصحّة ما ذكره قابلهُ بما يستحقّهُ والحق به من المؤاخذة ما يشهد معهُ كذبهُ وفسقهُ ، واعلن سرّهُ اعلاناً يشيع بين الادنى والابعد خبره وحاله ، ويَضيق معهُ الى العود الى انتحال ماليس بحقّ مجاله ، فان عاود الدعوى وراجعها ورافق الجماعة على الباطل وبايعها جعل على جبينه وسماً وابقى له بذلك فی الغابرين اسماً ، إِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ٥

(۲۴۵) مَجد الكُفاة الحسن بن فارس الخُراسانیّ الاديب

كان اديباً فاضلاً ، انشد فی عكس قول الحريریّ [۱] :-

لا تَزُرْ مَنْ تُحِبّ فی كلّ شهرٍ　　غيرَ يومٍ ولا تزده عليه

فقال :-

اذا ما صحّ ودٌّ من خليل　　فزُرْه ولا تخف منه ملالا

وكن كالشمس تطلع كلّ يوم　　ولا تك فی زيارته هلالا

(۲۴۶) مجد الدين تاج الاسلام ابو محمّد الحسن بن محمّد بن احمد الرشيدیّ النقيب

[هو] الرشيدیّ ابو محمّد الحسن بن محمّد بن احمد بن

---

[۱] آخر المقامة الخامسة عشرة من كتاب المقامات ؛

علیّ بن محمّد بن الحسین بن علیّ بن عبد الواحد بن
علی بن محمّد بن عبد الله بن علیّ بن اسحٰق بن علیّ بن
ابی جعفر هارون الرشید بن محمّد المهدیّ بن ابی
جعفر المنصور عبد الله بن علیّ بن عبد الله بن العبّاس ؛

(۲۴۷) مجد الدین الحسین بن علیّ بن احمد بن الخوارزیّ الصدر الکاتب

من اعیان الزمان واکابره ؛

(۲۴۸) مجد الدین الحسین بن تاج الدین علیّ بن نظام الدین هبة الله بن الداوامی البغدادیّ

من البیت المعروف بالتقدّم والریاسة والفضل والمعروف
وکان من حجّاب الدیوان وتأدّب وسمع الحدیث علی
جدّه وغیره، وکان قد حصّل وتأدّب، وله شعر ملیح
رأیته لمّا قدمتُ بغداد وکتبت عنه، وتوفّی[1] فی اوائل
شهر رمضان سنة ثلاث وثمانین وستّمائة، وحُمل
الی مشهد علیّ علیه السلام، ومولده فی شعبان سنة
عشرین وستّمائة ؛

(۲۴۹) مجد الدین ابو المظفّر الحسین بن عزّ الدین محمّد بن فخر الدین ابی طالب احمد صاحب الدیوان الدامغانیّ البغدادیّ الحنفیّ المعدّل المدرّس

من بیت الریاسة والتقدّم والفضل والعدالة والقضاء والعلم،

---

[1] ذکرت وفاته فی الحوادث الجامعة (ص ۴۴۴) ایضاً ؛

شهد عند قاضي القضاة عزّ الدين النيلي ، وصحب مولنا محي الدين ابن المحيا مدرّس الحنفيّة وتفقّه عليه و على القاضي تاج الدين عليّ بن ابي اليمن ابن السبّاك ، وتولّى المدرسة التُتُشيّة على طريقة آبائه واجداده ودرس بها وشُكِرت سيرته ، وذكر لي مجد الدين ابن الدامغانيّ انّ مولده في المحرّم سنة احدى وثمانين وستّمائة ؛

(٢٥٠) مجد الدين ابو المعالي الحسين بن محمّد بن الحسين بن عليّ بن عبد الرحيم البغداديّ المعدّل نسيب ابن الدامغاني

شهد عند قاضي القضاة ابي القاسم عبد الله بن الحسين بن الدامغاني في ربيع الآخر سنة تسع وستّمائة وتوفّي في شهر ربيع الآخر سنة اثنتين وعشرين وستّمائة ؛

(٢٥١) مجد الدين ابو عمارة حمزة بن احمد بن اسماعيل بن حمزة البغداديّ الاديب

كان اديبًا فاضلاً عارفًا بالتواريخ وامور الناس ، انشدنا بعض الاصحاب :–

وكنّا نُرَجّي ان نرى العدل ظاهرًا	فاَعقبنا بعد الرجاءِ قنوطُ
متى تصلُح الدنيا ويصلُح اهلها	وقاضي قضاة المسلمين يلوطُ

---

١ ترجم له عبد القادر القرشي في الجواهر المضيئة (١ : ٢٨١) ولم يذكر سنة وفاته ؛

(٢٥٢) مجد الشرف ابو الحارث حمزة بن سالم بن زيد العلوي المدائني النقيب

كتب اليه النقيب الطاهر: امّا بعد ارشدك الله مؤيّداً واسعدك مسدّداً كما جعلك رفيع القدر نبيه الذكر عالي الفخر طيّب النشر، طاهر الاخلاق زكيّ الاعراق، فاضل الادب كامل الحسب مهذّب الخصال محمود الفعال، شريف الخلال؛

منها: فانّي تأمّلت وجوه ما يتصرّف الناس في ايّام مهلهم ومدّة اعمارهم وما يبتغا في كلّ صنف، وكان النقيب عن كلّ هذا بمعزلٍ لاشتغاله بالطلب ودرس الادب والاهتمام بما ينفع في الآخرة من تقديم الاعمال الصالحة و الفضائل الراجحة والله يُوفّق؛

(٢٥٣) مجد الدين ابو العزّ خليل بن محمّد بن عليّ العراقيّ الصوفي

كان اديباً عالماً، من شعره في صبيّ يقال له: ابراهيم:-

يا سميّ الذي اُجيرمن النا ـــ رِ ببَردٍ من حرّها وسلام
فعلتْ مُقلتاك بالقلب منّي كفعال الخليل بالاصنام

(٢٥٤) مجد الدين ابو سليمان داود بن محمّد بن ابراهيم الاربليّ الصدر الرئيس

ذكره الصاحب شرف الدين ابو البركات المبارك بن احمد الاربليّ المستوفي في تاريخه، وقال: كان كريماً ممدّحاً؛

قراءت فی کتاب معجم البلدان لیاقوت[1] قال : وقد اشتهر شعر انوشروان البغدادی المعروف بشیطان العراق فی ذم اربل[2] ، ومدح مجد الدین داود [بقصیدة] اوّلها :—

تبّاً لشیطانی وما سوّلا	لانّه انزلنی اربلا
مولای مجد الدین یا مالکاً	شرّفه الله وقد خوّلا
عبدك نوشروان فی شعرهٖ	ما زال للطیبة مستعملا
لولاك ما زارت ذُری اربلٍ	اشعارُهُ قطّ ولا عوّلا
ولو تلقّاك بها لم یقل	تبّاً لشیطانی وما سوّلا "

(٢٥٥) مجد الدّولة ابو طالب[3] رستم بن فخر الدولة علیّ بن رکن الدولة الحسن بن بُویه الدیلمیّ المتولّی علی بلاد الجبال

ذکره ابو الحسین بن ابی اسحاق الصابئ فی تاریخه ، و قال : وفی ذی القعدة سنة ثمان وثمانین واربعمائة خُلع علیه وکُنّیَ اباطالب ولُقِّب مجد الدولة وکهف الاُمّة ، وعُهد له علی الری واعمالها ، وعُقِد له لواء و حُمِل الیه الخِلَع والطوق والسوارات والحملان

[1] انظر مادّة اربل من معجم البلدان ؛ واسمهٗ هنالك نُوشروان بحذف الهمزة ؛ [2] وله فی الاربل قصیدتان احدهما فی الذم والاُخری فی المدح ؛ فالشعر الاوّل من الاشعار المذکورة ههنا من الهجائیة ؛ وبقیّة الاشعار من المدحیة ؛ [3] ذکرهٗ فی کتاب الکاف ایضاً حین ذکر لقبه کهف الاُمّة وذکر بعض ذکرهٖ ههنا ؛

بالمراكب الذهبيّة، ولم تزل والدته هي القيّمة بأمره والناظرة في امور جنده الى ان توفّيت، وفي جمادى الأُخرة سنة عشرين واربعمائة نزل يمين الدولة محمود بن سبكتكين الري وقبض على مجد الدولة وصادر امراء الديلم واستولى على ماكان بن نصر بن الحسن بن فيروزان خال فخر الدّولة وقرّر عليه الف الف دينار؛

(٢٥٦) مجد الدين ابو الحسن زيد بن الحسن بن زيد العلوي الاصفهانيّ النسّابة

ذكره الحافظ جمال الدين ابو عبد الله بن الدبيثي في تاريخه، وقال: هو ابو طالب (؟) زيد بن الحسين (؟) ابن زيد بن ابي الحسن ويعرف بانوجه بن حمزة بن الحسين بن محمّد بن الحسين بن علي بن عمر بن حسن الافطس بن علي بن علي زين العابدين بن الحسين بن علي بن (ابي طالب)، سمع ببلده من ابي بكر بن ابي ذر الصالحاني[١] ومن فاطمة بنت عبد الله الجوزدانية[٢]؛ قال: وقدم بغداد حاجًّا وحدّث بها بعد عوده من الحجّ سنة سبع وسبعين وخمسمائة، قال: وقد اجاز لنا وسمع منه جماعة من الطلبة، وتوفّي باصبهان سنة تسع وسبعين وخمسمائة؛

---

[١] محلّة من محالّ اصفهان؛ [٢] جوزدانية قرية كبيرة على باب اصفهان؛

(٢٥٧) مجد الدين ابو القاسم زيد بن محمد البيهقي الاديب

ذكره في تاريخ بيهق[1]، وانشد لابي المكارم عبد السيد بن علي بن نصر بن خشام الخوارزمي المعروف بالمطرز في مدحه :-

تصدت جناب مجد الدين زيد
كنبي المصطفى في سبزوار
بدا فيها وشخص الغي كاس
وجسم الحق عن ثوبيه عاري
فالبسه لباساً من علاء
واعري شخصه من كل عار

(٢٥٨) مجد الدين ابو الحارث سعد بن احمد بن اسماعيل النيريزي[2] الخطيب

كان من الادباء الافاضل والخطباء الاماثل ؛

(٢٥٩) مجد الدين ابو المعالي سعد بن مسعود بن ابي سعد السعيدي المقري

[74 b / 75 a]

كان من القراء الاخيار وله معرفة بالتفسير و الحديث ، ومن رواياته : قيل للحسن البصري

---

[1] لم اجد هذا في المطبوع من تاريخ بيهق ؛ [2] نيريز بلدة قرب شيراز من اعمال فارس ؛

وقد اشتد جزعه على اخيه سعيد[1] :- انت تنهى عن الجزع وقد صرت منه الى غاية ؟ فقال : سبحان من لم يجعل الحزن عاراً على يعقوب ؛ فجعل جوابه احتجاجاً ، يريد "وابيضّت عيناه من الحزن فهو كظيم ٥"[2]

(۲۶۰) **مجد الدين** ابو الخير سعيد بن محمد بن سعيد الدُبَيْثي[3]

[قال :] قال الصلت ، سمعت عطا[ء] السَّلِيمي يقول عند الموت : اللهمّ ارحم فى الدنيا غُربتى ، وارحم عند الموت صَرْعتى ، وارحم فى القبر وَحْدَتى ، وارحم مُقامى بين يديك يوم النشور ؛

(۲۶۱) **مجد الدين** ابو المعالى سعيد[4] بن يحيى بن على بن الحجاج يعرف بابن الدبيثى المقرى ذكره ولده العدل جمال الدين ابو عبد الله محمد بن سعيد فى تاريخه ، وقال يُنسب الى قرية دُبيثى[5] قرية من باكسايا ، قدم بغداد مع اخيه ، وسمع بها الحديث من ابى الحسن سعد[6] الخير بن محمد الانصارى ،

---

[1] توفى بين السنة المائة والثامنة بعد المائة ؛ انظر ترجمته فى تهذيب التهذيب (۳، ۳۴) [2] القرآن الكريم سورة يوسف (۱۲) الآية (۸۴) ؛ [3] فى الوفيات فى ترجمة ابنه محمد بن سعيد ؛ [4] المتوفى سنة ۵۴۱ھ ؛ [5] ترجم له ياقوت فى معجم البلدان مادة بلنسية ؛

وعاد الى واسط ونزلها الى حين وفاته، وقد اجاز له القاضي ابو علي الحسن بن ابراهيم الفارقي، وتوفي ليلة الجمعة يوم عيد الاضحى سنة خمس وثمانين وخمسمائة؛

(٢٦٢) **مجد الدين** ابو الربيع **سليمان بن ابراهيم** بن قُرَيش العُقَيلِيّ الكاتب

[رأيت بخطّه :] وكان قدوم الركاب المولوي للدنيا واهلها جُنّةً من نوائب الحدثان فاحيى بوجوده البلاد واغنى بجوده العباد، فلا برحت بدوام ملكه منيرةً، والمواهب بمكارمه غزيرة ؛

(٢٦٣) **مجد الدين شاهنشاه بن عليّ بن كامكار** الميشقيّ[٢] الامير

كان من الامراء المعروفين والاكابر المشهورين وله اخبار لم تقع اِلَيّ فأُورِدَها ؛

(٢٦٤) **مجد الدين** ابو سعد **شرف بن المؤيّد** بن ابي الفتح بن غالب البغدادِيّ الخوارزميُّ الحكيم الصوفي

ذكره الامام رشيد الدين ابو الفضائل محمد بن احمد

---

[١] المتوفّى سنة ٥٢٨ هـ؛ انظر الوفيات (١ : ١٣) والاجازة رسميّة حيث كانت ولادة سعيد سنة ٥٢٠ هـ كما في الوفيات ؛ [٢] نسبة الى ميشه قرية بجرجان ؛

الخالدى الشبَدَنى فى مشيختهِ التى رواها لنا عنه ولدهُ شمس الدين ابوا لمجد ابراهيم ، وقال: مجد الدين كهف الطريقة شيخ الصوفيّة كان اوحد زمانه فى السخاء والمروّة ، وله اليد الطولى فى علم العربيّة والنحو ، وخصوصاً فى الطبّ وغيره من فنون العلم ولد بخوارزم ونشأ بها ، وكان فى حياة والده فى خدمة السلطان تكش بن ايل ارسلان ولمّا وصل ميهنة وزار قبر الشيخ ابى سعيد بن ابى الخير رجع عمّا كان فيه وترك جميع ماله ، وتزهّد وتعبّد وصنّف ومات شهيداً فى سلخ جمادى الاخرة سنة سبع وستّمائةٍ والقبوه فى جيحون ، ومولدهُ سنة اربع واربعين و خمسمائةٍ ؛

(۲۶۵) مجد الدين ابو محمد **شعيب** بن علىّ بن عبد الرزّاق الشاذياخىّ[1] الصوفى

كان من ظرات الصوفية وكبرائهم ، وانشد : ـ

لمّا جفانى من كان لى اُنساً ... اَنست شوقاً ببعض اوابه
كمثل يعقوب بعد يوسفهٖ ... حنّ الى شمّ بعض اثوابه

(۲۶۶) مجد الدين شُقَير بن عبد الله المالكىّ الواعظ المدرّس

---

[1] شاذياخ مدينة نيسابور وقرية من قرى بلخ ؛

ذكره شيخنا العدل ظهير الدين علي بن محمد
ابن الكازروني في تاريخه، وقال: وفي سنة[1] احدى
وسبعين وستمائة تمت المدرسة العصمتية
بمشهد عبيد الله، واول من ذكر فيها الدرس
عز الدين ابو العز البصري للشافعية، وعفيف الدين
ربيع الكوفي للحنفية وشرف الدين داود الجيلي
للحنابلة ومجد الدين شقير للمالكية، وكان فقيها
فاضلاً منوّهاً؛

(٢٦٧) **مجد الدين** شكربك بن احمد بن عثمان
المراغي حاجب الامير حسام الدين قتلغ بوقا

(٢٦٨) **مجد الدين**[2] ابو الفضائل صالح بن محمد بن
منصور بن محمد بن احمد بن هبة الله بن احمد
بن هبة الله بن احمد بن عبيد الله بن عبد الله بن
عُتبة بن مسعود بن عرقل بن حبيب ابن الهذيل
الواسطي الملك صدر واسط وصدر اربل

كان من اعيان الكتاب والمتصرفين، رُتّب بعد الواقعة
وبعد قتل سراج الدين البجلي صدراً بالاعمال الواسطية
وخوطب بالملك، وهو الذي تقبا لصاحب علاء الدين

---

[1] ذكرت قصة بناءها في الحوادث الجامعة (ص ٢٧٢) ايضاً؛ [2] انظر ترجمته في تاريخ العراق حوادث سنه ٦٧٩ هـ وهي سنة وفاته بحسب الفهرس؛

انفه وجعل فيه خيطاً وطاف به فى الاسواق وذلك فى [سنة ...[1]].

(٢٦٩) **مجد الدين** ابو الفتح صَدَقة بن عبد الله بن الناقد البغدادي الحاجب

ذكره شيخنا تاج الدين علي بن انجب فى تاريخه، وقال: وفى رجب سنة اربع وعشرين وستمائة[2] رتب مجد الدين حاجباً بالمخزن ثم ناب فى الوكالة فى وزارة عمه[2]، وفى سنة اثنتين واربعين رتب وكيلاً فى وقوف ام الناصر وحج متولياً فى السبيل المختص بها، ورتب وكيلاً لباب عنبر ابنة الامام المستنصر بالله، ولم يزل على ذلك واضيف اليه وكالة باب الحجرة الى ان توفى يوم الجمعة الخامس والعشرين من ذى القعدة سنة اربع وخمسين وستمائة، ودفن فى تربة لهم بالمشهد؛

(٢٧٠) **مجد الملوك** ابو طالب بن تاج الملوك بوري ابن اتابك الدمشقي الامير

قرأت فى ديوان عرقلة يرثيه:—

يا راكب الحرّ فالا عجت منحرفاً ... بجلّق وابك قبراً ضمّن الشرفا

---

[1] بياض فى الاصل لا نستطيع تكميله؛ [2] نصير الدين احمد بن محمد ابن الناقد المتوفى سنة ٦٤٢هـ؛ انظر: الفخري بحسب الفهرس؛

مجد الملوك فتی الجود ابن تاجهم ۔۔۔ ومن یقصّر عن امثاله الخُلَفا
هلال وجنٍ تجلّی فی دُجی شعر ۔۔۔ ما قیل قد تمّ حتّی قیل قد کَسِفا

منها :۔

هذا ابو طالب عزّت مطالبُهٗ ۔۔۔ حتّی تردّی رداء الترب والتّحَفا

(۲۷۱) **مجد الدین** ابو الطیّب **طاهر بن جعفر بن ایّوب الحَمَوی الکاتب**

کان اصلهٗ من بلخ وسکنَ واسط واستوطنها و وُلِدَ اولاده النجباء بها ، وسکن ابو الشکر سعد بن مجد العراق بغداد وصحِبَ الشیخ صدقة بن وزیر الواسطیّ ، وسمعَ بافادته من جماعة ؛

(۲۷۲) **مجد العراق** ابو سعد **طاهر بن علی بن المؤیّد بن رضوان بن مشیّد بن شرف بن الظهیر ابن ......[1] البلخیّ الرّئیس**

کان رئیسًا فاضلًا عاقِلًا ، کان لهٗ مجلس یجتمع فیه الیه اعیان الفضلاء ، وکان یُملی علیهم الفوائد ولا یفارقونهٗ الّا بعد وضع الموائد ، ومن املائه قال ، کتب الاستاذ ابو العبّاس احمد ابن ابراهیم الضّبیّ الی ابی سعید الشبیبیّ : وصل کتاب شیخ الدولتین فکان فی الحسن روضة حَزْنٍ بل جنّة عَدْنٍ ، وفی شرح الصدور وانس القلوب

---

[1] انقطع فی التجلید ؛

قميص يوسف في اجفان يعقوب ؛

(۲۷۳) مجد الدّين ابو محمّد طاهر بن نصر الله ابن جهبل الحلبيّ الاديب

ذكره عماد الدين اسماعيل بن هبة الله بن باطيش الموصليّ في كتابه، وقال: كان عارفاً بمذهب الامام الشافعيّ ماهراً في علم الحساب والفرائض، سمع من عمر بن حمّويه الجُوَينيّ وصنّف لنور الدّين ابي القاسم محمود بن زنكي كتاباً في فضل الجهاد سمّاه كتاب النصح العام للخاص والعام، وكان زاهداً، ودرس بحلب بالمدرسة النوريّة بعد قطب الدين مسعود، وكان صاهره على ابنته، و خرج من دمشق، ودرس بالمدرسة الناصريّة بالبيت المقدّس وتخرّج به جماعة ومات بالبيت المقدّس في شهر رجب سنة سبع[2] وتسعين وخمسمائة[1]؛

(۲۷۴) مجد الأمّة ابو منصور طغرل بن عبد الله المحموديّ الكاتب

من كتاب له: ولقد كشف عن العراق ما كان عرض لها من الكرب والغمّ وحالفها من الضيقة

---

[1] توفي سنة ۵۵۵ھ، انظر طبقات الشافعيّة (۵ : ۱۵۱)؛

[2] وقال ابن العماد والزبيدي: مات سنة ۵۹٦ م؛ راجع تاج العروس (۸ : ۲٦۹) والشذرات (۴ : ۳۲۳)؛

والهمّ، واوردا هلها من موارد كرمه ومنا هل
نعمة التي إن قيست بالبحار فهي اغزر سجاماً
واكثر ركاماً؛

(۲۷۵) مَجدُالدین ابو الفوارس **طغرل بن عبد الله** الناصریّ مُقْطَع اللحف[1]

ذکره شیخنا تاج الدین فی تاریخه، وقال: کان
امیراً شجاعاً مقداماً ذو هیئة وهیبة واُقطع
اللحف سنة ثمانین وخمسمائة وکان عادلاً
فی رعیّته؛

(۲۷۶) مجد الدین ابو المظفّر **عاصم بن عیسی بن** احمد المرغینانیّ الفقیه

کان فقیهاً نبیهاً ادیباً عالماً بالفقه والخلاف و
الجدل والادب، وفیه یقول بعض العلماء:۔

بابی فقیهٌ فی نظام کلامه　　اُنس الوحید وسَلوة المحزون
ولواستطعت اذا سمعتُ کلامَهُ　　لحشوتُ فاهُ بلؤلؤٍ مکنون

(۲۷۷) مجد الدین ابو المحاسن **عَبّاد بن محمّد بن** اسماعیل یعرف بابن عَلجَة الاصفهانیّ الکاتب الرئیس

لهٗ نسب فی بنی لؤیّ بن غالب؛ ذکرهٗ محبّ الدین
محمّد بن النجّار فی تاریخه، وقال کان مجد الدین عبّاد

---

[1] اللحف صقع معروف من نواحی بغداد، معجم البلدان (۳:۳۵۳)؛

من اجلّ صدور اصفهان واعيانها فضلاً وعلماً وادباً ورياسةً وتقدّماً ، قال : اجتمعت به ، ودعاني للحضور الى داره بحضرته ، وكان جميل الهيئة حسن الاخلاق ، وله الشعر اللطيف باللغتين العربيّة و الفارسيّة ، قال : ولم ار فى عراق العجم اكمل منه قال : وكان ينوب عن السلاطين ، ومن شعره :-

من اعوزته وسيلة فوسائلى
بعد النبيّ اذا الصحائف تُنشرُ
بنت النبيُّ وزوجها وابناهما
وابن الحسين ومن نماه وجعفرُ
وكذاك موسى والرضا ومحمّد
وبعسكر الشيخان والمتستّرُ

(٢٧٨) مجد الشرف ابوالقاسم العبّاس بن عبد الله بن المأمون العبّاسىّ

كان مجد الشرف ابوالقاسم بن المأمون ممّن حضر املاك المستظهر بالله على امّه عصمة الدنيا والدين خاتون بنت ملك شاه كما ذكرناه فى ترجمتها من النساء ؛

(٢٧٩) مجد الدّين ابو محمّد عبد الله بن ابراهيم ابن عبد اللّطيف الواسطىُّ المقرى

قدم بغداد صحبة الشيخ تقىّ الدين عبدالرحمٰن

ابن عبد المحسن الواسطيّ في طلب [العلم] سنة
اثنتين وسبعمائة؛ من كلامه: فالناظر في هذا
الوقف المذكور؛

(٢٨٠) **مجد الدّين** ابو القاسم [او ابو محمّد] عبد الله
ابن ابراهيم بن نعمة الله الواسطيّ الحربويّ الكاتب
سمع معنا ثلاثيات البخاري على شيخنا الصدر
الكبير العالم جلال الدين ابي عبد الله محمّد بن
الصاحب تاج الدين ابي منصور معلّى بن ابي السعادات
بن علوان بن عقال الطائي ثم الداهي بسماعه جميع
صحيح ابي عبد الله محمّد بن اسماعيل البُخاريّ
على الشيخ ابي نصر احمد بن الحسين بن النرسي
بسماعه من ابي الوقت بسنده بقراءة الحافظ
شمس الدين ابي العلا الفرضيّ بدار المسمع على
شاطئ نهر عيسى من غربيّ بغداد في شهر رمضان
سنة تسع وسبعين وستّمائة؛

(٢٨١) **مجد الدين** ابو الفضل **عبد الله** بن ابراهيم
ابن محمّد التبريزيُّ يعرف بالدقيقي الفقيه
الأديب

كان من الفضلاء العلماء، رأيته بتبريز سنة اربع
وستّين وستّمائة في حضرة شيخنا العلّامة رشيد الدين
ابي طالب يحيى بن محمّد بن زيد المشهدي، وروى عنه

شيئًا من شعره، وكان مليح الخطّ صحيح الضبط
جميل الاخلاق، كتبت عنه، وكتب لي بخطّه اوراقًا
من شعر رشيد الدين المذكور؛

(۲۸۲) **مجد الدين عبد الله بن ابراهيم الامامى**
امام مسجد دار الشفا تبريز

روى عن قاضى القضاة بفارس مجد الدين اسماعيل
بن افضل الدين بن فضل الله الفالى الشيرازى؛
روى عنه شيخنا صدر الدين ابراهيم بن شيخ
المشائخ سعد الدين محمّد بن المؤيّد الحموىى
الجوينى؛

(۲۸۳) **مجد الدين** ابو الطيّب عبد الله بن احمد
بن الحسين بن سابور الخراسانىّ الصوفى
قال: لمّا ان حضر الحسنَ بنَ علىّ الموت بكى
بكاءً شديدًا، فقال له الحسين، ما يُبكيك؟
يا اخى! وانّما تقدّم على رسول الله صلّى الله عليه
وسلّم وعلى علىّ رض وفاطمة رض وخديجة رض وهم للدّ
وقد اجرى لك على لسان نبيّه [صلى الله عليه وسلم]
انّك سيّد شباب اهل الجنّة، وقاسمتَ اللهَ
مالك ثلث مرّات؛ قال: فما زاد الّا بكاءً و
انتحابًا، وقال: يا اخى! انّى اقدم على امرٍ عظيم
يهول لم نقدم على مثله قطّ؛

(٢٨٤) **مجد الدين** ابو الفضل عبد الله[1] بن ابی نصر احمد بن محمّد بن عبد القاهر الطوسیّ الخطیبُ نزیل الموصل

ذکرهٗ ابو عبد الله محمّد بن سعید بن الدُبَیثی فی تاریخه، وقال: هو بغدادیّ المولد والمنشاء، موصلیّ الدار والوفاة، تولّی الخطابة بالجامع العتیق بالموصل سنین کثیرةً، وسمع ببغداد ابا الحسین احمد بن عبد القادر بن یوسف وابا عبد الله الحسین ابن احمد بن طلحة النعالی، وابا الخطّاب نصر بن احمد بن البطِّیّ وابا محمّد جعفر بن احمد السرّاج، قال، ورحل الی نیسابور یسمع بها ابا نصر عبد الرحیم[2] ابن عبد الکریم القُشَیری وعاد الی الموصل، فحدّث بها واجازلنا، ومولدهٗ ببغداد فی صفر سنة سبع وثمانین واربعمائة، وتوفّی بالموصل فی شهر رمضان سنة ثمان وسبعین وخمسمائة، ودفن بمقبرة باب المیدان؛

(٢٨٥) **مجد الدین** ابو سعد عبد الله بن احمد بن محمّد الخوارزیّ الکاتبُ

---

[1] انظر ترجمته فی الشذرات (٤ : ٢٦٢) وطبقات الشافعیّة (٤ : ٢٣٣)؛ [2] توفّی سنة ٥١٤ھ؛ انظر ترجمته فی الانساب (ص ٤٥٣ ب) والشذرات (٤ : ٤٥)؛

[من كلامه :-] وقد انفذ ما تقدم به مما يشهد بصحة ولائه ويصرح بفاخم جزيل ثنائه ، راجياً من العواطف الجزيلة والعوائد الجميلة ان تحتو على ضعفه كما حنت على والده بعوارفها وكنفته بوارفها ؛

(۲۸۶) مجد الدين عبد الله بن اسماعيل يعرف بكيل الكرمانی قاضی کرمان

[76 b / 77 a]

من فضلاء الدهر واعيان العصر، مدح الصاحب السعيد سعد الدين محمد بن على الساوی سنة خمس وسبعمائة بقصيدة فريدة اولها :—

زان الربيع ارائك الاشجار	وجلا خدود عرائس الازهار
نشرت ذوائبها الصبا فلنشرها	طويت صحائف حونه العطار
ورمت لثام كمامها فتبسمت	عن لؤلؤ نظمت بسمط نضار
ابكار غيب يجتلين تظلماً	حبست وراء مسادل الاستار
بيض كرائم حاملات دراهم	ينترنها المغرد الاطيار
يقرأن ايات الكتاب عليك فی	صحف منشرة من الانوار
فانظر اليها منصتاً لكلامها	متدبراً لصنائع الجبار

فيها :—

واسمع ثناء الصاحب المحلوم من	خطباء فوق منابر الاشجار

---

[1] كتب فوقه : يحقق اسمه ونسبه ؛

(۲۸۷) **مجد الدین** ابو القاسم عبد الله بن ابی القاسم عبد الله بن حیدر بن ابی القاسم القزوینیؒ المحدّث

ذکرہٗ شیخنا القاضی کمال الدین احمد بن العزیز المراغی قاضی سراۃ، وقال: قرأت کتاب الاربعین الذی جمعه علی الشیخ العالم جمال الدین محمّد بن المرتحل الهمدانی بثغر جَنْزة بسماعه من مجد الدین المذکور، وسمع مجد الدین صحیح مسلم علی الامام ابی عبد الله محمد بن الفضل بن احمد الصاعدی الفراوی عن ابی الحسین عبد الغافر بن محمد الفارسی عن ابی احمد محمّد ابن عیسی بن عمرویه الجُلُودی عن ابراهیم بن سفیان عن مسلم؛

(۲۸۸) **مجد الدین** ابو طاهر عبد الله بن سعید بن عبد القاهر الدِمَشقیّ الصُوفیّ

رأیت بخط مجد الدین الدمشقیّ :-

لوکنت اجسر ان اقول لشفیت من نفسی غلیلا
لکن لسانی صَارم ملئت مضارِبُهٗ فُلُولا

(۲۸۹) **مجد الدین** ابو الفضل عبد الله بن عبد المحسن ابن عبد الله بن الطوسی خطیب المَوصِل

توفیّ عاشر جمادی الاٰخرۃ سنۃ ثلاث واربعین و

ل المتوفیّ سنۃ ۵۸۲ھ انظر ترجمتہٗ فی طبقات الشافعیّۃ (۴ : ۲۳۴)؛

ستّمائة ، ومولده سنة ثلاث وستّمائة ؛

(٢٩٠) **مجد الدين** ابو طاهر عبد الله بن علیّ بن
ابراهیم الفیروزابادیُّ الفقیه المتکلّمُ
کان من الفقهاء المتکلّمین والعلماء العاملین ، و
کان نقیّ الجیب امین الغیب دائم الفکر والمطالعة ؛

(٢٩١) **مجد الدین** ابو محمّد عبد الله بن علیّ بن
عبد الحمید العلوی الکوفیُّ النقیب
من اولاد النقباء السّادة النجباء العارفین
بالانساب وفنون الاداب ، وقد ذکرنا منهم
جماعة فی هذا الکتاب ؛

(٢٩٢) **مجد الدین** ابو القاسم عبد الله بن علیّ
ابن النفیس بن عَلیّ بن محمّد الانباریّ الخطیبُ
من بیت الخطابة والعدالة والرّوایة ، ذکره
ابن الدُّبَیْثیّ فی تاریخه ، وقال : سَمِعَ عَمَّ
اَبیْه ابا نصر یَحْییَ بنَ عَلیّ ، وقدم بغداد و
حدّث بها ، ومولده بالانبار فی جمادی
الاولی سنة احدی وثلثین وخمسمائة ،
وتوفّی بالموصل فی ذی الحجة سنة اثنتین
وستمائة ؛

(٢٩٣) **مجد الدین** زین الاسلام ابو سعد عبْدالله

له (٥٠٨ - ٦٠٠ ھ) انظر ترجمته فی الشذرات (٤: ٣٤٥) وطبقات الشافعیة (٥: ٨٨)

بن عمر بن احمد بن منصور بن محمد بن القاسم
بن حبيب بن عبدوس يعرف بالصغّار
النيسابوري الفقيه المحدّث شيخ خراسان،
روى عن جدّه لامّه شيخ الاسلام ابى نصر
عبد الوحيد بن ابى القاسم عبد الكريم بن
هوازن القُشَيري، روى لنا عنه شيخنا مجد[١] الدين
ابن بلدجي وتاج الدين بن الساعي، ورثاه
منتجب[٢] الدين سالم بن ابى الصقر [لقوله]:-

عليك فتى الصغّار في كل ليلة	صلٰوة[٣] من الرحمن دائمة تترا
اخذت الورى حيًا بعلمك والنهى	وزاروك ميتًا فاستفادوا بك الاجرا
ومضيت وابقيت الشهاب[٤] اخا التقى	ففارقنا حبرًا وابقى لنا حبرا

(٢٩٧) مجد الدين ابو سعد عبد الله بن عمر بن تقي
الدين محمّد بن امام الدين عمر بن شمس الدين
محمّد بن بهاء الدين الحسين الشريفيّ التبريزيّ
القاضي تبريز

من اعيان القضاة العلماء الحسينيّ، وهو شيخ فاضل
له هيبة وهيئة جميلة وكان من المقرّبين في

---

[١] عبد الله بن محمود الآتي ذكره. [٢] هو سالم بن احمد بن سالم،
ترجم له المصنّف في ص ب ١٨٧ - ١٨٨ - الف من مخطوطة هذا الكتاب.
[٣] اضبطه المصنّف هكذا منصوبًا [٤] يريد ابنه شهاب الدين القاسم
ابا بكر بن الصغّار (٥٣٣ - ٦١٨ھ)، انظر ترجمته في طبقات الشافعية (٥: ١٤٨)

حضرة رشيد الدين، رأيته فى حضرة مولٰنا
وشيخنا الوزير رشيد الدين فضل الله بالسّلطانيّة
سنة ستّ و سبع مائة، وكتب على كتاب التوضيحات
الرشيديّة؛
وذكر انّ له نسبًا لم يستصحبه معهٗ، وسألنى عن
مشتجر الانساب، ولم يكن النسب عندى
فوعدته بان يكتب لى نسبه لاذكره فى كتابى؛

(۲۹۵) مجد الدين ابوطاهر عَبْدُ اللهِ بن عيسى
بن المُظَفَّر السّمنانىّ الاديب

كتب فى رسالةٍ لهٗ:-

كم لى اُنبّهُ منك طرفًا راقدًا يُبدى سُباتًا كلّما ايقظتُهٗ
فكأنّك الطفل الصّغير لمهدهٖ يزداد نومًا كلّما حرّكتهٗ

(۲۹۶) مجد الدين ابومحمّد عبد الله بن القاسم
بن عبد القاهر الدمشقىّ الكاتب

قرأت بخطّه فى كتاب كتبهٗ الى بعض الاصحاب:-

لئن كان من نال السلام عليكم يُعدّ صديقا فالصديق كثير

وفيه ايضًا:-

قد اطلت الكتاب والشوق مُمْلٍ ليس يرضى فى القول بالميسور

(۲۹۷) مجد الدين عبد الله بن قُثَم النقيب بن طلحة
النقيب الرافقى بن الزينبىّ النسّابة

كان عارفًا بالانساب:-

(۲۹۸) مجد الدین عبد الله[1] بن محمد الطبری نزیل الحرم الشریف بمکة المجاور المحدث

کتب لنا الاجازة من الحرم الشریف سنة تسع و سبعین وستمائة، واجازنی فی جماعة کتبها فی اجازة جامعة، وکان السفیر فی ذلک شیخنا العدل الثقة رشید الدین ابو عبد الله محمد بن عمر بن ابی القاسم المقری المحدث

(۲۹۹) مجد الائمة ابو المطهر عبد الله بن محمد بن عبد الله المعدانی الاصفهانی الفقیه،

کان اماما فاضلا مدحه زین الاسلام محمد بن منصور الهروی بقوله:-

ائمة دهرنا طرحوا الائمة   لدرة تاجهم مجد الائمة
وکانوا ناقصین لدی المعالی   فصار جماله لهم تتمة

(۳۰۰) مجد الدین ابو طالب عبد الله بن ابی عبد الله محمد بن علی بن المعمر الحسینی النقیب

ذکره الادیب ابو الفتوح عبد السلام بن یوسف التنوخی فی کتاب انموذج[2] الاعیان من تألیفه،

---

[1] کان المکتوب اولا احمد بن عبد الله بن محمد فی موضعه (قبل ترجمة مجد الدین احمد بن عبد الله بن المسلم الدمشقی) ثم صححه المصنف فاخرنا ترجمته الی هذا الموضع رعایة لترتیب الکتاب اظن انه عبد الله بن محمد بن محمد بن ابی بکر الآتی ذکره، [2] وفی کشف الظنون (۱: ۱۶۰): انموذج الزمان فی شعراء الاعیان، ووقع ذکره استطرادا فی معجم البلدان (۷: ۱۱۹) مادة قصر قضاعة،

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
إلّا	البَهازِرُ	كامل	٥	١٥٣
وَرَأَتْ	ثابِرُ	"	٥	١٦٧ (ر= ١٧: ٣٥٠)
إِذْ	حائِرُ	"	٥	٢٣٥
هَلَّا	حَضاجِرُ	"	٥	٢٧٨
واذا	مُخامِرُ	"	٥	٣٣٩
زعَمَ	مُدابِرُ	"	٥	٣٦٠ (ر= ٦: ٣٤)
راو مسافرُ				
نَقَلُوهُ	زَواخِرُ	"	٥	٤٠٨
ولقدْ	السَّتائِرُ	"	٦	٧
خَلَتَ	صافِرُ	"	٦	١٣٤
يَحْمِلْنَ	كالمَطاهِرِ	"	٦	١٧٧ (ر= ١٨: ٢٦)
ظَأَرْتُهم	طائِرُ	"	٦	١٨٧
مَن	عَباهِرُ	"	٦	٢١٠
سَلْمَى	كالعَراعِرِ	"	٦	٢٣٥
وتَجَمَّعَ	العَسابِرُ	"	٦	٢٤٢ (ر= ٩: ٣١١)
كنِعاجِ	ناجِرُ	"	٧	٣٤٧ (ر= ١٠: ٣٧)

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
أُطلال	فاجِرُ	كامل	١٠	٤٠١
الفائِقُونَ	المعاشِرُ	"	١١	٢٨٥
وحَلَبْتُ	ماضِرُ	"	١٢	٢٧٧
إِذْ	جازِرُ	"	١٢	٢٨٦ (ر= ٣٤٨)
ولقد	آخَرُ	"	١٣	٣١١
أَيْقَنْتُ	صائِرُ	"	١٤	١٤٣
وغَرَرْتَني	تامِرُ	"	١٧	٢٥٧
قِفْ	زائِرُ	"	١٨	٢٦٧
حَتَّى	الجبائِرُ	"	٢٠	٢٧٦
فَلَثَمْتُها	العَقِيرُ	"	٦	٢٧٦
عَفا	فالغَمْرُ	هزج	٣	٤٤
فَعُوقٌ	قَفْرُ	"	١٢	١٥٤
وقد	النَّثْرِ	"	٥	١٥٨
وقد أرى	العُفُرِ	"	١٣	٣٠
حاجِبَيْكِ	الشِّعْرِ	"	١٨	٢٨٨
قالَتْ	وذُعُرُ	رجز	٥	٣٣ (ر= ٢٣٩)
أَدْمِي	بُجُرُ	"	٥	١٠٣ (ر= ٢٣٣)
أَلْبَيْتُ	وحَبَدُرُ	"	٥	١٨٢

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
ومشيهن	مَوْرُ	رجز	٥	٤٢٤
قد	تَزَبْزَرُ	"	٦	٤٢٩ (= ١٩: ١٤٧)
ليس	قِمَطْرُ	"	٦	٤٣٠
نوائرٌ	مَهْرُ	"	١٠	٣٥٧
إنْ	فَصُرَّهَا	"	٦	١٢٥
اذا	تُذْكَرُ	"	٣	١٩
نبط	أَقْمَرُ	رجز	٥	١٤٢
تحفهم (او تحفها)	جَمْعَرُ	"	٥	٢١٩
أُقْسِمُ	تَدَرْدَرُ	"	٥	٣٦٩
ليست	دَوْسَرُ	"	٥	٣٧١ (= ١٢: ١٩٨، ١٧٧)
ودُونَ	سَمَهْدَرُ	"	٥	٤٢٣ (= ٦: ٤٧، ٢٥١)
جاءَ	القُبَّرُ (او القُنْبُرُ)	"	٦	٤٠ (= ٣٧٧، ١٣: ١٠٥)

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
جاموسةٌ	وخنزرُ	رجز	٦	٨٧
وقل	الضُّمَّرُ	"	٦	٤٢٨
رأيتُ	تُسْعَرُ	"	٧	٧٨
إنْ تك	نَهْرُ	"	٧	٩٧
بكلّ	أُخْضَرُ	"	٧	١٢١
وإذْ	مَنْخَرُ	"	١٥	٧٩
ذكرتَ	المُضْمَرُ	"	٢٠	١٧١
قُومُوا	مَفْخَرُ	"	٢٠	٣٧٣
إنَّ	مَفْخَرَهْ	"	١	١٦٩ (= ١٨: ٢١٣)
هل	تُوجَرَهْ	"	٦	٢٤٣ (= ١٧: ٧٨)
أَسْوَد	أُخْضُرَهْ	"	٦	٢٨٥ (= ٩: ٥٤)
وجامل	عَكَرَهْ	"	١٣	١٣١
فذلك	تَجَرَهْ	"	١٧	٥٦
قال	كِبَرَهْ	"	١٧	٤٥٠
مَنْ	شاعِرُ	"	٥	٤٠٧
كيفَ	الجزائرُ	"	٥	١٦٣ (= ٦: ٣٢٢)

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة	صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
نولا	الغرائر	رجز	٦	٦٣					١٠٢،)
انى	ضمائر	"	٦	١٦٥	أخشى	أمير	رجز	٦	٢٩٦
ردون	عامر	"	٧	٩٨	طلح	جشير	"	٧	٨٩
يردن	طائره	"	١١	٣٢٥(=	أنجعل	تدبير	"	٥	١٢٦
				١٤: ١٣٣،	عن	سور	"	١٠	٢٠٠
				١٥: ١٤٧،)	تقدمها	جسور	"	١٧	٣٧٥
لا	اضطرار	"	٣	١٧١	يا قصبا	الدبور	"	١٨	٢٢٢
ولم	البيطار	"	٥	٢٢١(=	والغرب	كبير	"	١٨	٣٠٢
				٨: ٣٨٠،)	ها انها	الصدور	"	٢٠	٣٧١
لنا	مجبار	"	٥	٢٣١	تقول	عتوره	"	٦	٢١٠
قلت	دارها	"	١	٥٣(=	هتافة	يديرها	"	٦	٣٠٢
				١٦: ٣٥،	أنت	مجيرها	"	٦	٣١٦
				١٤٧،	قد علمت	خورها	"	٧	١٢٩
				١٨: ٢١٥،)	مضبر	زئبره	"	٣	٣٣٧
				٢٠: ٣٣٠،)	مالك	عمرو	"	٢	١٣٣
كيف	صغارها	"	٣	٣٧٩	مازال	الدهر	"	٢	٣٠٧(=
جارية	خمارها	"	٦	٢٥٣					١٧: ٣٩٠،
تبدى	خمارها	"	٦	٣٣١(=					١٨: ١٨٧،)
				٩: ٢٥٥،)	دار	الستر	"	٣	٣٢
نجار	نجارها	"	٧	٣٥(=	أشبعت	اليهبر	"	٣	٣٨(=

ـ١ انظر ايضاً (٧: ٢٤") -

صدرالبيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
				۷: ۸۷،
				۲۰: ۳۸۵)
فجعتهم	العكركر	رجز	۶	۲۷۸ (=
				۹: ۵۲،)
تهوى	القحّر	"	۶	۳۸۲
حتى	تقرر	"	۶	۳۹۲
انّى	تقطّرى	"	۶	۴۲۰
أرسل	يقفر	"	۶	۴۳۳
لو	يبسّر	"	۶	۴۵۹
تركتهم	كالأصغر	"	۷	۲۲
وصرت	قرقر	"	۷	۱۲۴ (=
				۶: ۲۴۳،)
ليس	هقوّر	"	۷	۱۲۷
ثمّ	الأصفر	"	۹	۱۴۴
اعمد	تأخّر	"	۱۱	۲۶۵
ويحك	تبربرى	"	۱۱	۳۵۶
صاح	الضيطر	"	۱۲	۳۵۵
لا	صرصر	"	۱۸	۴۴
كيف	أدّرى	"	۱۸	۲۷۸
الأكل	القمر	"	۱۹	۱۲۱

صدرالبيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
أجمع	أبهرى	رجز	۱۹	۲۷۲
دعها	برى	"	۱۹	۲۹۴
يقلب	الأعسر	"	۲۰	۱۰
إن	محورى	"	۲۰	۵۳
أظلّ	الأخضر	"	۲۰	۶۶
متى	الكرى	"	۲۰	۱۵۴
غرّك	أباعرى	"	۲	۱۵۹
لاهمّ	المسافر	"	۴	۱۵۸
نحن	عامر	"	۴	۴۱۶ (=
				۲۰: ۱۰۶،)
تعرف	البشائر	"	۵	۱۲۸ (=
				۶: ۶۲،
				۱۱: ۲۸۶،
				۱۶: ۱۵۷،
تستلّ	الحاجر	"	۵	۱۸۸
دبزّة	حاذر	"	۵	۲۴۸
يا أمّ	محاورى	"	۵	۳۰۲
فهنّ	قاصر	"	۵	۳۰۳
ترى	الآبر	"	۵	۳۴۱
وذكرى	المحاور	"	۵	۴۱۱

صدر البیت	قافیہ	بحر	مجلد	صفحہ
جَمَعْتُہا	غِزارِ	رجز	۱۱	۷۵(= ۱۳۴:۲۰)
لاھُمَّ	الدّارِی	"	۱۶	۳۰(= ۲۷۸:۱۸)
قد	الطِّرارِ	"	۱۶	۲۰۵
جَمَعْتُہا	خیارِ	"	۲۰	۱۰۵
اَعْطَیْتُ	کارِھا	"	۲	۱۴۴
نَحْنُ	دارِھا	"	۳	۳۳۳(= ۲۱:۶)
ولا	حِذارِھا	"	۵	۱۴۹
صُورِیَّۃُ (او صُورِیَّۃُ)	باشْنِھارِھا	"	۶	۱۶۶(= ۳۲۱:۱۱، ۸۹:۱۲، ۱۸۷:۱۴، ۴۱۶:۱۷)
عالَیْتُ (او غالَیْتُ)	الکُورِ	"	۱	۲۶۴(= ۲۹۵:۳، ۳۲۴:۱۹)
عاثُور	عاثُورِ	"	۱	۳۵۸
کأَنَّ	المَنْثُورِ	"	۲	۳۰۹(= ۲۶:۵، ۳۶۳)

صدر البیت	قافیہ	بحر	مجلد	صفحہ
فی	یَخْمُورِ	رجز	۴	۱۳۷(= ۶:۷، ۶۹:۹)
فَقَدْ	تَعْذِیرِ	"	۴	۱۳۸
واللہِ	الاَمیرِ	"	۵	۱۵۸(= ۱۵۵، ۲۰۲:۹)
اَعُوذُ	بالاَمیرِ	"	۵	۱۵۸(= ۲۰۳:۹)
علی	عَیْسَجُورِ	"	۵	۱۹۶
اذا	بالجُعْرُورِ	"	۵	۲۱۰
بالخُشُبِ	الیَخْضُورِ	"	۵	۳۲۶
اذا	مَسْسُورِ	"	۵	۳۴۸
کأَنَّ	الزَّرْزُورِی	"	۵	۴۱۰
جارِیَ	عَذْبَرِی	"	۶	۱۹۱(= ۲۲۲، ۲۱۴ص، ۳۳۵:۷)

صدر البیت	قافیہ	بحر	مجلد	صفحہ
مقتدر	تسخیرها	رجز	٣	٥٠٦
خدية	تخصيرها	"	٥	٢٤٧
يزينها	سفورها	"	٥	٢٤٧
وأنت	بعيرها	"	٥	٣٣٨ (ر= ٦: ٣٠٣، ٢٠: ٣٨)
لاقت	ساهورها	"	٦	٥٠
اذ ازرت	قعورها	"	٧	٢٢٥
كأن	خصورها	"	٦	٣٧٨ (ر= ٧: ٢٦٥)
وفى	ميسورها	"	٨	٦٠
ولاحت	درورها	"	٢٠	١٠٨
إني	برا	"	١	٣٩ (ر= ٥: ٣١٣)
جاءوا	جرا	"	٢	٢٠ (ر= ١٥: ٩٥)
تمنا	عظيرا	"	٢	٣٦٣ (ر= ٦: ١٤٦، ١٧: ٣٣٦
شربن	مرا	"	٢	٤٨١ (ر=

راوبينرين (١٥: ١٦٦)

صدر البیت	قافیہ	بحر	مجلد	صفحہ
يا أم	شرا	رجز	٣	٣٦٤
لا	عشرا	"	٤	٢٥٤
لتجدني	برا	"	٤	٤٥٠ (ر= ٧: ٣٨٧، ٨: ٣٠٢، ١١: ١٦٦)
بلت	مرا	"	٥	٧٣
قد	نكرا	"	٥	٩٣
إن	حرا	"	٥	١٩٦
لا	جرا	"	٥	١٩٨ (ر= ٦: ١٣٢)
لطالما	جرا	"	٥	٢٠١
إنك	والقسرا	"	٥	٢٠٨
يا ناق	زورا	"	٥	٣٢٩ (ر= ٤٢٧)
رأت	دثرا	"	٥	٣٣٦
قد	عسرا	"	٥	٣٧٣
اذا	واسكرا	"	٦	٦
إني	سطرا	"	٦	٢٨ (ر=

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
لَنْ	مُسْفَرَا	رجز	٥	٢٦٠ (=ر ٦: ٣٣)
لَنْ	حَزَوَّرَا	"	٥	٢٦٠
يا رَبَّنا	يَكْبُرَا	"	٥	٣٠٦
تَظَلُّ	مُزْعَفَرَا	"	٥	٣٣٢ (=ر ١٣: ٢٣٧)
أَلْعَتْ	خَنْزَرَا	"	٥	٣٤٤
قد	الأَزْوَرَا	"	٥	٤٢٧
أَعْدَدْتُ	هَجَّرَا	"	٦	٣٢
قامَتْ	عَبْهَرَا	"	٦	٢١٠
عَنْداً	مُعْتَمَرَا	"	٦	٣١٠
فما	تَسْخَرَا	"	٦	٤٢٥
سَلْمُ	أَنْ وَرَا	"	٧	١٢٣
يَدَ نَفْسُ	نَظَرَا	"	٨	١٩٢
مِنْ ياسِم	أَحْمَرَا	"	١٦	١٣٤
لا	الأَبْهَرَا	"	١٦	٢٥٢
باتَ	الأَنْدَرَا	"	١٩	١٢٢
وقال	مُنْكَرَهْ	"	١	٣٨١
كُلُّ	حِرَّهْ	"	٣	٢٥٧
أَنا	الحَيْدَرَهْ	"	٥	٢٤٦ (=ر او حَيْدَرَهْ) ٦: ٣٤٨)
أَلْعَتْ	خَنْزَرَهْ	رجز	٥	٣٤٤
قد	بِالسَّمَرَهْ	"	٥	٤٢١
رُبَّ	شَهْبَرَهْ	"	٦	١٠٣ (=ر ٣٩٩، ٩: ١١١)
ما	كالحُمَّرَهْ	"	٦	١٩١
يُنْجِدُ	عُنْقَرَهْ	"	٦	٢٩٠
عِبادَك	المُغْبَرَّهْ	"	٦	٣٠٧
فِداكَ	مُحَجَّرَهْ	"	٦	٤٢٦
شَدَّ	مِئْزَرَهْ	"	٧	٩ (=ر ١٦: ١٥٠)
إِنَّ	كَعَشَرَهْ	"	٧	٤٤
إِنِّي	الهُدَرَهْ	"	٧	١١٨
فكانَ	العَيْثَرَهْ	"	١٠	٢٧٨
يا مَنْ	بَيْذَرَهْ	"	٢٠	١٣
إِنَّ	الجازِرَا	"	٢	٢٤٩
بِهازِراً	مازِرَا	"	٥	١٥٣ (=ر ١٠: ٣٧٦)
فابتغ	عَيازِرَا	"	٦	٢٣٨

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
كانت	قواصِرَا	رجز	٦	٣١١
حَيثُ	الكُمَاتِرَا	«	٦	٣٦٨
كأنّ	كُنادِرَا	«	٦	٣٦٩
تَمّا	المُعاوِرَا	«	١٨	٦٩
لا	حازِرا	«	٢٠	١٩٨
إنّ	فُناخِرَهْ	«	٦	٣٥٦ (= ٣٧٣)
أقدِمْ	الأساوِرَهْ	«	٧	١٥ (= ١٥: ٦٠)
تَوَرّدتْ	حِرارا	«	٣	٤٤
أعطى	دارا	«	٣	٢٣٩ (= ٢٠: ٣٠٩)
أوسَرَ	الأبصَارَا	«	٥	١٦
تَرى	المتخَارَا	«	٥	٧٢
بالقَتْلِ	يَسارَا	«	٦	٧٢
وكُلُّ	أحجارَا	«	٦	١٥١
وإنْ	مُعارا	«	٦	٣٠٢
حتى	الأعمَارا	«	٦	٣٣٦
ما إن	أغارا	«	٦	٣٣٥ (= ٧: ١١٧)

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
				١٥٥)
				(١٦: ١٧٨)
واللهُ	الأنصارا	رجز	٧	٦٦
تعرّضتْ	جُرجارا	«	٧	١٣٢
يا قوم	نوارا	«	٩	٣٠٢
تُماشِقُ	والحُضّارا	«	١٢	٢٢١
يا ابنَ	الوبارا	«	١٣	٨١
لاقوا	والإصحارا	«	١٨	١٦٦
فاعتانِ	فاختارَها	«	١٧	١٨١
أنا	دارَهْ	«	٥	٣٨٧
خَلّوا	سَيّارَهْ	«	٦	١٥٦ (= ٧: ١٩١)
عُلِّقَ	مِعطارَهْ	«	٦	٢٥٩
كأنّها	شَارَهْ	«	١٢	٢٣٢ (= ١٨: ٢١٢)
تَسمَعُ	استحيرا	«	٤	١٨٧ (= ٥: ٣٠٧)
وتأكرتْ	نميرا	«	٥	٨٣
تمّا	النَّفيرا	«	٦	٤٥
لا	شَطيرا	«	٦	٧٦

صدر البيت	قافیه	بحر	مجلد	صفحه
ولكنت	قمطريرا	رجز	۶	۴۵۵
فشرب	سورا	″	۷	۲۰
قلن	النميرا	″	۷	۱۱۹
أنت	جرجورا	″	۸	۳۶۲
أنتم	جرجورا	″	۸	۳۶۲
يحملن	عنقفيرا	″	۱۰	۳۱۸ (= ۱۲: ۱۴۹، ۱۸: ۲۹۱)
لا	المحفورا	″	۱۱	۸۱
ويطحن	والقتيرا	″	۱۴	۲۲۹
أنعت	كبيرا	″	۱۵	۹۵
ان	يضيرا	″	۱۵	۱۷۵
لاهم	الكسيرا	″	۱۷	۳۵۹
لاهم	عميره	″	۱	۶۲۶ (= ۱۱: ۳۴۴)
يا قوم	غفيره	″	۶	۳۳۰
فابعث	قاشوره	″	۶	۴۰۵
إني	المسموره	″	۷	۷۸
أذنتنا	الدبر	″	۲	۴۶۵
جامع	جبر	″	۵	۲۲۷
سنابك	الأيد	″	۶	۳۱۳

صدر البيت	قافیه	بحر	مجلد	صفحه
من	أفر	رجز	۶	۳۸۳
أنا	أبو عمر	″	۱۱	۳۴۸
تفيأت (او تفيآت)	والخفر	″	۱	۱۲۱ (= ۱۳۱)
حتى	النجر	″	۲	۲۴۲
أقسم	عمر	″	۲	۲۶۳ (= ۶: ۳۵۴)
لقد	الكبر	″	۲	۳۱۱
الحمد	الخير	″	۲	۳۲۳ (= ۶: ۵۹)
أصوت	التنور	″	۳	۲۷
أقدم	نكر	″	۳	۱۸۷
لما	عجر	″	۳	۲۵۷
فأصبحوا	السرر	″	۳	۲۶۱
لو	جرس	″	۳	۳۰۵
يبكي	بجر	″	۳	۳۰۴
أظل	الأخضر	″	۴	۲۷
عن	دسر	″	۴	۳۲
جبة	بالإبر	″	۴	۲۰۶
فأصبحا	ضرر	″	۵	۷۷

صدر البيت	قافيته	بحر	مجلد	صفحة
نَحْنُ	قَتَرْ	رجز	٥	١٩٥ (= ٦: ٣٨٠)
دِغِلْمَتِي	وبَجِرْ	»	٥	١٠٨ (= ٦: ١٥، ٧: ١١٤)
	(او وسَجِرْ)			
غَمَّ	بَهَرْ	»	٥	١٣٨ (= ٤٢١)
	(او عَتَمْ)			
ضَوْبًا	آفَرْ	»	٥	١٦٤
يَارَبِّ	بالسُّوَرْ	»	٥	١٨١ (= ١١: ١٥٠)
مَنْ	اجْتَبَرْ	»	٥	١٨٤
لَبِنَ	القَدَرْ	»	٥	٢٠٩
كأنَّما	جَهَرْ	»	٥	٢٢١ (= ٧: ١٤٩، ٢٠: ١٢٩)
تَحْمِلْ	جَسَرْ	»	٥	٢٦٣
وانهم	المُحْتَفَرْ	»	٥	٢٧٦
نجيبات	البُهَرْ	»	٥	٣٠١ (= ١٢: ٢١٩)
اعوذ	حِيَرْ	»	٥	٣٠٥

صدر البيت	قافيته	بحر	مجلد	صفحة
لا	لَسَحَرْ	رجز	٥	٣١٣
يَحْمِلْنَ	دُعَرْ	»	٥	٣٧٢
رَجَبْلاً	فانْحَرْ	»	٥	٣٧٨ (= ١٣: ١٠٢)
لِمُصْعَبِ	انْقَشَرْ	»	٦	٧٢
وعَدَدَ	اشْتَغَرْ	»	٦	٨٦
والشَّدْنِيَّاتُ	النُّغَرْ	»	٦	٩٥
بِحَاجِبٍ	ازْبَأَرْ	»	٦	٩٥
لَقَدْ	اعْتَمَرْ	»	٦	١٥٠ (= ٢٨٣)
والشَّدْنِيَّاتُ	النُّعَرْ	»	٦	١٧٠
تَقَضِّيَ	كَسَرْ	»	٦	١٩٠
تَقَارُبُ	البَصَرْ	»	٦	٢٧٧
أنت	البَشَرْ	»	٦	٣٠٦
وعاصِماً	الغَدَرْ	»	٦	٣٠٧
فَرَجْتَ	الغُبَرْ	»	٦	٣٠٧
حَنْدَلِسُ	البُكُرْ	»	٦	٣٥٥ (= ٧: ٩٦)
ويأمر	يَغْتَلِرْ	»	٦	٣١٤
قد	الغَفَرْ	»	٦	٣٣١

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
مِنْ	أُخَرْ	رجز	١٢	٦٨
يَوْمَ	قَدَرْ	«	١٢	٦٩
اتم	أمرْ	«	١٢	٧٦
ما الشرب	فالصَّدَرْ	«	١٢	١٢٧
كأنما	حَجَرْ	«	١٢	٢١٢
تخالها	تَطَرْ	«	١٣	٢٢٥
وذو	الحُجَرْ	«	١٣	٢٨٠
وأصبحت	قِدَرْ	«	١٤	١٠٧
هَلْ	خِيَرْ	«	١٤	٢٣٣ (= ٢٣٤)
نطعمها	الشَّجَرْ	«	١٦	٨
فأحسنوا	وبرْ	«	١٦	١٦١
وبها	ذَكَرْ	«	١٧	٣٦٢
فإن	حَسَرْ	«	١٨	١٠٣
كأنه	المُحْتَضَرْ	«	١٨	١١٦
هلا	هَجَرْ	«	١٩	٣٣
حتى	بسَحَرْ	«	١٩	٢٨٨
وإن	أو العَكَرْ	«	١٩	٣٧٩
وحدثتني	المُسْتَمَرْ	«	٢٠	١٣٣
أرخى	اليَسَرْ	«	٢٠	٢١٠

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
بَيْنَ	الشَّعَرْ	رجز	٢٠	٣٦٥
فى	شَعَرْ	«	٢٠	٣٥٣
نار	الغَوَاضِرْ	«	١	٢٨٥
كأنها	وإيقارْ	«	١	١٣٧ (= ٧: ١٥١، ١٥: ٢٨٨، ١٦: ١٩٣)
ولم	البَيْطَارْ	«	٢	١٨٠
لا	القِسْبَارْ	«	٦	٣٠٣ (= ٣٠٥)
كأنها	واستيقارْ	«	٧	١٤٠ (= ١٥٣)
أشكو	الجَبَّارْ (او الغَفَّارْ)	«	٩	٢٥٦ (= ٩: ٥٧)
قد	كالأشبارْ	«	١٠	٣١٩
الله	الجَبَّارْ	«	١٢	٣٧٩ (= ١٥: ١٣٢)
لا	بالأغبارْ	«	٢٠	٧٣
هَلْ	القُوَرْ	«	٣	٢٨٢ (= ١٦: ٤٣٥،

صدر البیت	قافیته	بحرہ	مجلد	صفحة
				۴۶۴،)
هَلْ	الْمُوْرُ	رجز	۴	۶۲
ان	مُنْشِيْرُ	″	۴	۱۱۱ (=
				۱۲:۴۷۴،)
أكُلُّ	مَمْدُوْرُ	″	۵	۳۷۲
سَاقِي	الْمَخْمُوْرُ	″	۱۹	۹۳
وليَ	الْكُبُرُ	رمل	۶	۴۳۵
خالِقِ	بَيْهرُّ	″	۱۱	۳۷۵
دِيمَةٌ	تَدُرُّ	″	۱۵	۱۰۴ (=
				۱۸:۱۸۹،)
حَيْثُمَا	وُفُرُ	″	۱۹	۱۴۹
مُلْكُنَا	خِيَارُ	″	۴	۴۲
حَتْمَ	وجبارُ	″	۵	۱۸۶ (=
(راوحَكَمَ)				۱۱:۱۲۷،)
ورُكوبُ	اجْمرارُ	″	۵	۲۱۹
ولقدْ	الصُّفارُ	″	۶	۱۳۵
بَيْنَمَا	نَغَارُوْا	″	۲۰	۳۱۴
لا	بُحُرِّ	″	۵	۲۵۵
لا	لِضُرِّ	″	۱۱	۵

صدر البیت	قافیته	بحرہ	مجلد	صفحة
فرماها	عُقُرِهْ	رمل	۶	۲۷۳
يرهيشِ	شَرَرِهْ	″	۸	۱۹۷
مُطْعَمُ	كِبَرِهْ	″	۱۵	۲۶۰
أجَلْ[1]	بِأزَارِ	″	۱	۱۵۱ (=
				۵:۷۵،
				۱۳:۱۲،
				۱۶:۲۵۱،)
مُحْسِنُ	الْكِبارِ	″	۱	۱۸۱
ومَلاهِ[2]	عِذارِي	″	۶	۱۰۳ (=
				۱۶:۱۴۸،)
لو	اعتِصَارِي	″	۶	۲۵۶،
				۸:۳۲۸،
				۱۲:۴۴،)
أبْلِغِ	وانْتِظارِ	″	۱۲	۲۷۲
ولقدْ	مَلَكَارا	″	۵	۳۷۱
رُبَّ	الْغَارَا	″	۶	۳۴۰
ولها	نِقْصَارا	″	۶	۴۱۳
وهُمُ	الْجُزُرْ	″	۱	۲۱
طَيِّبُوا	وَعِرُ	″	۱	۳۱

[1] انظر ایضاً (۲ : ۱۸)، [2] انظر ایضاً (۵ : ۴۰۴،)

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
شُدَّتْ (او شُنُدخ)	طِمِرّ	رمل	۱	۱۰۸ (= ۵۰۹:۳، ۳۱۶:۸، ۷۰:۱۱، ۸۶)
ولَئِن	عُفُر	"	۱	۱۰۸
شَنِنٌ	الإبَر	"	۱	۱۷۶
نَحنُ	یَنتقِر	"	۱	۲۰۱ (= ۸۸:۷، ۱۲۱:۱۳)
نَهَبانُ	فَیَصِرّ	"	۱	۲۲۷
واذا	الخَفِر (او اُثُر)	"	۱	۲۸۶ (= ۴۰۳)
ولِعَیْلِ	زُهُر	"	۲	۱۸۵
لَهَبانُ	فَیَصِرّ	"	۲	۲۴۰
مِنْ	العُذُر	"	۲	۲۸۴
کبناتِ	الخُفُر	"	۳	۱۴۹ (= ۳۲۷:۵، ۶:۷، ۱۳۹:۹)

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
اِنْ	طِمِر	رمل	۳	۱۵۵ (= ۲۳۰:۲۰)
فتنازتُ	الوَتَر	"	۳	۴۸۶
فی	مُضَر	"	۴	۴۳
نَحسَبُ	المُسْبکِر	"	۴	۴۲۶
تُظهِرُ	تَعتکِر	"	۴	۴۷۰
وعَلَی	مُسْبکِر	"	۴	۴۷۳
تَخرُجُ	تَشتکِر	"	۵	۱۲۷ (= ۹۴:۶)
ولِی	المُؤتَبِر	"	۵	۵۷
باجِرِیٌّ	وهَرّ	"	۵	۱۰۹
یَکشِفُونَ	المُبِرّ	"	۵	۱۱۹
جَرَّرَ	بُکُر	"	۵	۱۴۴
قادِحُ	یَنتَغِر	"	۵	۱۷۲
قَدْ	حَبِر	"	۵	۲۳۰
مَنْ	جُحُر	"	۵	۲۴۳
بَیْنَ	حُرّ	"	۵	۲۵۷
ما	یَحسِر	"	۵	۲۶۲
نَعَتَتْها	حَکِر	"	۵	۲۸۵
وبلادُ	الخَدِر	"	۵	۳۱۳

صدر البیت	قافیته	بحرہ	مجلد	صفحة
جَاذَتِ	خَدِرُ	رمل	۵	۳۱۴ (= ۲۶۲:۶، ۲۹۱:۱۳)
رُبَّ	الخَصِرُ	"	۵	۳۲۶ (= ۱۸۰:۹)
كُلُّ	قَطَرُ	"	۵	۳۷۱ (= ۱۲۴:۱۳)
فَهُوَ	يَزْبَرُ	"	۵	۴۰۵ (= ۴۰۲، ۱۵۸:۱۷)
سَادِراً	بِقُرُ	"	۶	۱۹
إِذْ	الشَّبَرُ	"	۶	۵۹
فَتَرَى	الشُّفَرُ	"	۶	۸۹
وتَسَاقَ	كالشَّقِرُ	"	۶	۱۹۰ (= ۱۱۴:۱۹، ۳۲۲)
بِجِفَانِ	الصِّنَّبِرُ	"	۶	۱۴۱
هَلْ	عَبَقُرُ	"	۶	۱۴۱ (= ۲۰۷)
قل	الغُمُرُ	"	۶	۱۶۲

صدر البیت	قافیته	بحرہ	مجلد	صفحة
ظَلَّ	المُدَّكِرُ	رمل	۶	۲۴۳
ولَئِنْ	مُعْتَشِرُ	"	۶	۲۵۰
تَهْلِكْ	يَعْتَفِرُ	"	۶	۲۶۰ (= ۲۸۰:۱۸)
فَلَئِنْ	عُفُرُ	"	۶	۲۶۵ (= ۲۵:۸)
فَهُوَ	الغَبِرُ	"	۶	۳۰۹ (= ۶۰:۷)
وإذا	فَقِرُ	"	۶	۳۶۹ (= ۲۷۱:۱۷، ۳۴۶)
حِينَ	قُطُرُ	"	۶	۳۷۹
فَلَئِنْ	القَفِرُ	"	۶	۴۲۲
هِذْرِيَانٌ	نَزِرُ	"	۷	۴۲ (= ۲۳۶:۲۰)
وحَشَوْتُ	كالنَّقِرُ	"	۷	۸۹ (= ۱۶۵:۱۳، ۱۹۶:۱۸)
فَهُيَ	هَيْدَكُرُ	"	۷	۱۱۹
وهمُ	الجُرُزُ	"	۷	۱۶۱

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
أزرق	يُبُسْرْ	رمل	٧	١٦٣
ألِزْ	يَسْتَغِرْ	"	٧	١٧٢
أعَرَفْتَ	عَبَقُرّ	"	٧	٣١
أو	حُشُرْ	"	٨	١٦٣
ولِعَبْدِ	ذُكُرْ	"	٨	٣٢٧
ونشاصٍ	قُصِرْ	"	٨	٣٦٦
يَخْبِطُ	سُمُرْ	"	٩	١٥٠
وسَقُوهُمْ	فَيُرْ	"	٩	١٥٦
نَلَ	المُحْنَفِرْ	"	٩	٢٢٢
رافه	مُسْبَكِرْ	"	١٠	٢٣٣
قد	مُمَرّ	"	١٠	٣٥٦
غَيَّرَ	المَطَرْ	"	١١	١٣٢ (= ٣٣١)
ثُمَّ	الأزُرْ	"	١١	٢٢٥ (= ١٢: ١٠٤)
وأنافت	القُشُرْ	"	١١	٢٥٦
دُلُقٌ (او ذُلُقٌ)	نَمِرّ (او نَفِرْ)	"	١١	٣٩١ (= ١٣: ٣٥)
دِيمَةٌ	تَدُرّ	"	١٢	٧٩ (= ١٤: ٢٢٣)

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
عَبِقَ	القَمَرْ	رمل	١٢	١٠٤
اعَرَفْتَ	عَبَقُرْ	"	١٢	٢٧٩
نَطْرُدُ	بِقُرّ	"	١٢	٣٥٦
اتنى	جَارْ	"	١٣	٦
مَلَكَا	وحُرْ	"	١٣	٤٢
أبْلِغْ	ومُضَرْ	"	١٣	٢٧٨ (= ١٥: ٨١)
ألِزْ	يَسْتَقِرْ	"	١٣	٣٦٣
إنْ	بالظُهُرْ	"	١٤	٢٠٧
ما أفلَتَ	المُسْبِرّ	"	١٦	٦٠
بَنَوا من	الخَفِرْ	"	١٦	٢٠٣
الن	يَسْتَنْفِرْ	"	١٦	١٩٠
وترى	نَعْفِرْ	"	١٦	١٩٥
ثُمَّ	المُدَّخِرْ	"	١٦	٢٩٠
قد	حَبَرْ	"	١٥	٢٠٣
لم يَكُ	بالسَّرَرْ	"	١٧	٢٢٥ (= ٢٢٦ ص)
فالتِنَتْ	والثُوَرْ	"	١٧	٢٥٣
لايَكُنْ	بَحْرْ	"	١٧	٣٢٣
ثُمَّ	فَيَيْسُرْ	"	١٨	٢٦

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
عَبهَرَةُ	الطاهِرِ	سریع	۴	۷ ر=
	(او الظّاهِرِ)			۶: ۲۱۰،
اب	الآثِرِ	″	۵	۶۱
فی	الحاسِرِ	″	۵	۲۶۱
فانظُر	ضائِری	″	۶	۲۴
عَضَّ	الغابِرِ	″	۶	۳۰۶ ر=
				(۹: ۵۱،
ولَستُ	للکاثِرِ	″	۶	۴۴۶ ر=
				(۸: ۱۹۹،
کدُمیةٍ	مائِرِ	″	۷	۱۷
اِنَّ	النّاظِرِ	″	۷	۳۴ ر=
				(۴: ۸۰،
				۸: ۲۷۴،
				۱۷: ۱۴۶)
حتی	النّاشِرِ	″	۷	۶۱
قدقلتُ	للنافِرِ	″	۷	۸۴
والدُّرُّ	التّصاوِیرِ	″	۷	۴۲۰
فرُکنُ	الحائِرِ	″	۸	۱۳۵
لَیسَتْ	داعِرِ	″	۸	۳۲۲
فی	والحاسِرِ	″	۱۱	۱۵۴

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
واقْنَ	الهادِرِ	سریع	۱۲	۵۳
حَنظَلَة	بالنّاضِرِ	″	۱۳	۱۹۴
شاقَتك	حاجِرِ	″	۱۴	۶۹
قد	ناضِرِ	″	۱۵	۵
أسَفهًا	بالقادِرِ	″	۱۷	۳۹۰
اِذْهِیَ	الزّائِرِ	″	۱۸	۱۷۹
والمالُ	للناظِرِ	″	۱۹	۷۷
أرمِی	والعاصِرِ	″	۲۰	۳۴
وکُنَّ	الشّافِرِ	″	۲۰	۱۲۲
دِماؤُهُم	العُذَرَه	″	۱۳	۴۳۰
یاقَوم	وقُرّ	″	۲	۹۷
واِنَّما	مُفتَقِرْ	″	۱	۳۹۲
یُهِلُّ	المُعتَمِرْ	″	۱	۴۱۵ ر=
				۹: ۴۷۸،
				(۱۴: ۲۲۶،
مِن	یَعتَبِرْ	″	۵	۳۴۰
فأزغَلَت	تَشفَتِرْ	″	۶	۸۹ ر=
	(او فأزغَلَت)			۱۳: ۳۰۹،
				۳۲۴)
تَروِی	یَنصَهِرْ	″	۶	۱۳۲ ر=

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
				١٠:٢٥،
				١٩:٣١٩)،
تترك	الحضورا	خفيف	٦	١٥٣
سرقات	طهورا	″	٦	١٦٨ (=
				٩:٢٠٠)،
سنجز	تطهيرا	″	٦	١٧٤
واذا	عقيرا	″	٦	٢٦٦ (=
				١٢:٢٣٣)،
أوكماء	نزورا	″	٧	٥٨ (=
				١٥:٥٥)،
لا	الفقيرا	″	٨	٣٦٨
وثلاث	بصيرا	″	٩	٣٣٠
سببا	الجمهورا	″	١٠	٢٠٠
وفليقا	التوتيرا	″	١٢	١٨٥
سنة	صريرا	″	١٣	٥١٦
فأمن	غدار	″	٥	٥ (=
				١٧:١٧٠)،
اذا	تتنقر	مجتث	٥	١٧٤
وحارب	مسعر	متقارب	١	٢٩٦
تغير	يقدر	″	٦	١٧

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صحيفة
كأن	الخزعز	متقارب	٦	٣٢٤
تثير	الغفور	″	٦	٣٢٨
ترتع	المهمهر	″	٧	١٢٨
لعاسرة	ينفر	″	٧	٣٢٥
فمالت	الأيسر	″	٨	٢٦٣
نفى	ضمر	″	١٠	١٢٧ (=
				٤:٢٠٨)،
حتى	الأغبر	″	١٢	٨٣
اذا	مزهر	″	١٢	٣٦٦
وهي	أوفر	″	٣٠	٣٥٣ (=
				١٢:٨٢،
				٣٠٣)،
رقيا منا	أظهر	″	١٩	٣٣٦
فما	ممطر	″	٢٠	٥٢
توفي	استارها	″	٦	٨
فلم	صوارها	″	٦	١٢٧
توءم	غارها	″	٦	٣٤٠
من	زمهرير	″	٥	٢١٨
وقد	بشر	″	١٧	٣٢٩
لها	مطر	″	١٨	٢٥٣

صدر البيت	قافيته	بحر	مجلد	صفحة
يُستذلق	الوِجارا	متقارب	١١	٣٠١
كأنّ	شِعارا	"	١١	٣٠٦
هو	احمرارا	"	١٢	١٣٥ (= ١٣٦)
فباتت	غِزارا	"	١٢	١٩٣
ويارُبّ	إن ارا	"	١٢	٢٠٦
ووراء	الفقارا	"	١٢	٣٧١
أرى	نِوارا	"	١٢	٣٩٧
على	غِرارا	"	١٣	٣٤١
ودأبا	الفقارا	"	١٣	٣٦٢
فكيف	عارا	"	١٤	١٧٤
غدوتُ	اغتمارا	"	١٤	٢٠٠
كأنّي	عُقارا	"	١٥	١٧٥
بأعظمَ	الغُبارا	"	١٦	٥٢
يُبشّرُ	غِرارا	"	١٦	٢١٨ (= ١٩: ٣٢٧)
فبتنا	الصّفارا	"	١٧	٣٠١
وأقبلَ	العِشارا	"	١٨	١٧٥
لِأدنى (أو لأدنى)	انتظارا	"	١٨	٢٤٩ (= ١٩: ٧٨)

صدر البيت	قافيته	بحر	مجلد	صفحة
خريعَ	الإزارا	متقارب	١٨	٣٠٤
وداهيةٍ	خِمارا	"	١٩	٣٢
دلّيتُ	القرارا	"	١٩	٦١
رَواحُ	خيارا	"	٢٠	٣٠٩
كأنّ	بيزارها	"	٥	١٢١
فأصبحتُ	سِسارها	"	٦	٤٧
فباتتْ	عشّارها	"	٦	٢١٦
خضاخضةٌ	جرجارها	"	٩	٢
برهرهةٌ	المنفطر	"	١	٣٣٩ (= ١٦: ٢٠٨، ١٧: ٣٦٨)
أقامتْ	نهر	"	٢	١٦٩ (= ٧: ٩٥)
لها	دُبُر	"	٣	١٦٧
ببرنج	المطر	"	٣	١٩٠
فظلّ	النعر	"	٣	٢٨٠ (= ٧: ٧٩، ١٤: ٩)
سلامٌ	درر	"	٣	٢٨٥ (= ٥: ٣٦٦)

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحه
سها	تَنْبَهِرُ	متقارب	٣	٢٨٨
ولبست	غُبُرُ	"	٣	٣٨٦
بحسبك	مُضَرُ	"	٤	٢٣ ر=
٢٠				٣٢٩:٢٠،
وعينين	أُخُرُ	"	٥	١٧ ر=
				١١١:٢،
				٢٤٥،
أحارِ	خَمِرْ	"	٥	٨٩ ر=
				٩٠،
				٣٣٩،
فقالت	بَرُّ	"	٥	١١٧
فنجّ	الكَدَرُ	"	٥	١٦٨
ادفنتني	البَتَرُ	"	٥	١٧٨ ر=
				٨٥،
فما	جَدَرُ	"	٥	١٩٢ ر=
				٢٥٢:٩،
				٨٨:١٩،
فكرّ	المُجُرُّ	"	٥	١٩٦ ر=
				١٩٩،
سها	صِفِرُ	"	٥	٢٦٦ ر=

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحه
				٢٢٩:٩،
تحدّر	قَرُّ	متقارب	٥	٢٧١
وحرّ	الخَمِرُ	"	٥	٣٢١
تسها	تَزْبَئِرُ	"	٥	٣٠٥ ر=
				٢٣٤:١٦،
ولوحا	المُزْدَئِرُ	"	٥	٣١٤
كأنّ	القُطُرُ	"	٦	١٤ ر=
				٤١٩،
				٦١:٧،
				٦٦:١٥،
بآية	السُّرُرُ	"	٦	٢٦
أناقك	الشُّطُرُ	"	٦	٧٦
باطيب	الصَّدَرُ	"	٦	١١٩
أقامت	صَفَرُ	"	٦	١٣٣ ر=
				٤٠٤:١٠،
تخانف	النُّذُرُ	"	٦	١٥٨
فذر	يُعْتَسَرُ	"	٦	٢٤٠
مطاعيم	الفَجَرُ	"	٦	٣٥١
واذن	صَفِرُ	"	٧	٢١
تذكّر	قَطَرُ	"	٦	٤٢٠

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
أتَونِی	نُكُرْ	متقارب	۷	۹۲
لقالَ	الهُزَرْ	〃	۷	۱۲۴
لَهَا	تَنْبَهِرْ	〃	۷	۱۶۸
ویاابْنَیَ	السَّحَرْ	〃	۸	۴۹
وإنّا	نَأْتَمِرْ	〃	۸	۱۲۵
وأبیَضَ	مُنْكَسِرْ	〃	۸	۳۸۷
فضافَ	كالحَطَرْ	〃	۹	۱۲۲
نَحُلُّ	الجُزُرْ	〃	۹	۴۰۱
فَراغَ	الوَتَرْ	〃	۱۰	۵
وسَاقَانِ	مُنْبَتِرْ	〃	۱۰	۷۵
وقالت	هَجَرْ	〃	۱۰	۱۵۳
لقد	النُّصُرْ	〃	۱۰	۳۱۰
لها	مُضِرّ	〃	۱۰	۳۶۴
لها	المُقْتَدِرْ	〃	۱۰	۳۸۴
وأزكَبُ	مُسْبَطِرّ	〃	۱۰	۴۵۱ (=
	(أو مُنْتَشِر)			۱۱: ۵۲)
تَبِیتُ	الأُكَرْ	〃	۱۱	۳۸
وإنْ	مُسْبَطِرّ	〃	۱۱	۵۱
وهُم	لأُزُر	〃	۱۱	۲۲۸

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
تَغُضُّ	النَّظَرْ	متقارب	۱۱	۲۶۶
وسالِفَةِ	السُّعُرْ	〃	۱۲	۱۲۰ (=
				۱۷: ۲۷۹،
				۲۶۰ص)
أَلِكْنِی	الخَبَرْ	〃	۱۲	۲۷۴ (=
				۳۷۴،
				۱۳: ۳۰۱،
				۲۰: ۱۸۴)
وقولُ	الصَّبِرْ	〃	۱۱	۳۲۴
لِسَانًا	الذَّكَرْ	〃	۱۲	۵۳
نَهَا	بِكُرْ	〃	۱۲	۹۳
فلو	البَصَرْ	〃	۱۲	۳۹۱
فَكَرَّ	المُجِرْ	〃	۱۳	۲۲۷
فَبِتُّ	مُقْشَعِرْ	〃	۱۴	۳۳۴
فَیُدْرِكُنَا	نَكِرْ	〃	۱۵	۳۵۴
ولَوْ	الإبَرْ	〃	۱۶	۷۳
كأنَّ	الوَبَرْ	〃	۱۶	۱۵۹ (=
				۲۰: ۲۵،
عَرَفْتُ	حُنَنْ	〃	۱۷	۱۵۰ (=
				۱۹: ۲۴۹)

۱؎ انظر ایضاً (۳۱ : ۲۸۸.)
۲؎ انظر ایضاً (۱۱ . ۵۱.)

صدر البيت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
أُحَيْمِرَ	مُنْكَسِرْ	متقارب	١٧	١٢١
أَتَتْنِي	نُكُرْ	"	١٧	٢٧٠ر=
				٢٧١ص،
لما	النَّمِرْ	"	١٧	٢٨٤ر=
				١٨: ٢٥٤،
				٢٥٥ص،
اذا	الغُدُرْ	"	١٨	٢٧٣
فيالهف	القَدَرْ	"	١٩	٨٤
فلما	أُجَرْ	"	١٩	٩٩
أَبَيْتُ	مُرّْ	"	٢٠	٤
وقد	بِشَرّْ	"	٢٠	٢٤٢
تُثِيرُ	للقُدُورْ	"	٩	٨٦
قطعتُ	صُوَرَا	"	١	٢٥٠
ولابُدَّ	الشَّكُورَا	"	١	٤٢٢ر=
				٦: ٩٣،
				١٩: ٣٦٠،)
بلوناكَ	النَّفُورَا	"	١	٤٢٨
جماليّةً	الهَجِيرَا	"	٢	٢٠٥ر=
				١٣: ١٣٢،
				١٤: ٢٧٢،

صدر البيت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
				١٩: ٣٦٩،)
ولم	الشَّرِيرَا	متقارب	٣	٢٩٧ر=
				٦: ١٠٣،)
تُشَبِّهُ	البَرِيرَا	"	٣	٣٩٢
كبرديّة	غَدِيرَا	"	٤	٥٥ر=
	(او السَّرِيرَا)			٦: ٢٣،
	(السُّرُورَا)			٢٦،
				١١: ١٧١،)
اذا	غَيُورَا	"	٤	١٢١ر=
				٨: ١٥٨،)
اذا	الأَمِيرَا	"	٤	٣٥٧ر=
				٥: ٩١،
				٢٠: ٢٣٢،)
اذا	البَهِيرَا	"	٥	١٤٩ر=
				٨: ١٨،
				٢٠: ٢٣٦،)
لما	دَبُورَا	"	٥	٣٥٧
وقد	الزَّبِيرَا	"	٥	٣٠٥
كأنَّ	مَسْتُورَا	"	٦	١٠٣ر=
				١٣: ٣٣٢،

ز

اگست ۱۹۴۰ء

ضمیمہ

اورینٹل کالج میگزین

منجانب

عربک اینڈ پرشین سوسائٹی

پنجاب یونیورسٹی

لاہور

نوٹ: ضمیمہ صرف عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کے ممبروں اور خریداران ضمیمہ میں تقسیم ہوتا ہے

فہرست مضامین

ضمیمہ

بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مہتہ ایشر داس پرنٹر چھپا اور بابو صدیق احمد خاں نے اورینٹل کالج لاہور سے شایع کیا۔

خواجوی کرمانی - سوانح حیات اور تصانیف

[اس مضمون کی پہلی قسط اگست ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں چھپ چکی ہے بسلسلہ کیلئے گذشتہ قسط کی آخری چند سطریں درج ذیل ہیں]

" خواجوی کرمانی کی تاریخ پیدائش کے متعلق خاصہ اختلاف رہا ہے ، تذکرہ نویس تو اس سلسلے سے رہے - ریو - ایتھے - ڈاکٹر ارڈمان ، پروفیسر براؤن بھی گل و نوروز کے چند اشعار کے حوالہ پر تاریخ پیدائش ۶۷۹ دے رہے ہیں ، دوسری طرف سے سپرنگر ، بلوشے اور ایوانات ۶۸۹ درج کر رہے ہیں - اور ان کا ماخذ بھی گل و نوروز کے وہی اشعار ہیں "

تاریخ ولادت مجھے ہفتاد و ہشتاد کے ہم وزن ہونے میں اس غلطی کا پہلو نظر آیا - اور اپنے خیال میں نسخے کی قدامت کو اس گتھی کے سلجھانے کے لئے کافی سمجھا - لیکن خواجو کی تین مثنویوں (یعنی ہمائے ہمایوں کمال نامہ ، روضۃ الانوار) والے نسخہ میں جو دنیا میں شاید قدیم ترین ہے اور جس کا سنہ تحریر ۷۰۹ ہجری ہے - دو اور مثنویاں نہیں ہیں - برٹش میوزیم کے دوسرے نسخے میں یہ اشعار سرے سے موجود نہیں - لیکن ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی پنج مثنویات خواجو اور مقالہ سعید نفیسی دیکھنے کا اتفاق ہوا - شکر ہے کہ یہاں بھی شاعر مرحوم نے ہماری رہنمائی کی ہے - تاریخ پیدائش چار مختلف سنوں یعنی ہجری ، رومی ، یزدگردی اور ملک شاہی میں دی ہے - اب ہشتاد و ہفتاد کا جھگڑا اٹھ گیا ، تاریخوں کے باہمی مقابلہ سے معلوم ہوا - کہ تاریخ ولادت [شب یکشنبہ ؟] ۲۰ ذوالحجہ ۶۸۹ھ ہے

اسی طرح سنہ رومی ۱۶۱۰ ، یزدگردی ۶۵۹ ، ملک شاہی ۱۷ دی ماہ جلالی ۲۱۲ ہے - اشعارِ مذکورہ یہ ہیں :-

شب روزِ الف از مہ شدہ کاف — فگندہ آہوی شب نافہ از ناف
رسیدہ ماہ ذوالحجہ بہ عشرین — ببام آوردہ گردون خشتِ زرین
ز ہجرت شش صد و ہشتاد و نہ سال — شدہ پنجاہ روز از ماہِ شوال
وگر عقدت ز رومی می کشاید — دہ افزون بر ہزار و شش صد آید
ورت خود یزدگردی می دہد دست — یکی را طرح کن از شش صد و شصت
ور از زیجِ ملک شاہی سگالی — شدہ ہفدہ ز دی ماہِ جلالی
دو صد را ضبط کن وانگاہ دو شش خوا — کہ روشن گرددت سالِ ملک شاہ
من از کتمِ عدم بر داشتم راہ — سمن زارِ وجودم شد چراگاہ

ڈاکٹر ارڈمان نے ۱۸۴۸ء میں زیڈ ڈی ایم جی کے لئے خواجو پر ایک تنقیدی مقالہ لکھا - جو نہایت مختصر ہے - انہوں نے تاریخ پیدائش پانچ شوال سنہ ۶۷۹ دی ہے - ان کی تقلید میں ریو اور پروفیسر براؤن نے بھی یہی لکھا ہے - سال کی غلطی تو شاید کاتب کے ہفتاد لکھ دینے سے تعلق رکھ سکتی ہے لیکن " از مہ شدہ کاف " ، اور " پنجاہ روز از ماہِ شوال " کے ہوتے ہوئے پانچ شوال درج کرنے کی ہمیں کوئی دلیل نظر نہیں آتی[1] ۔

لقب | ہمارے شاعر کو نخل بند شعرا کہتے تھے ، گویا یہ ان کا لقب تھا ، دولت شاہ ان کو ملک الفضلا لکھتے ہیں - اور کہتے ہیں چونکہ زبان نہایت

---

[1] جب تک وہ متن سامنے نہ ہو - جس پر ارڈمان نے اپنا نتیجہ مبنی کیا ہے - اتنی عجلت اس کی تغلیط میں نہ کرنی چاہیئے ۔ (اڈیٹر)

شستہ ہوتی تھی، اور بات سے بات پیدا کرتے تھے الفاظ بدیع لاکر کلام میں
ایک مخصوص آراستگی ہوجاتی تھی۔ ان کو نخل بند شعرا کہا جاتا تھا۔ اسی خیال کی
تائید اور اسی لقب کا ذکر حبیب السیر، ہفت اقلیم، مے خانہ، خزانۂ عامرہ،
مرآۃ الخیال، نشتر عشق، مجالس المومنین، شمع انجمن، مخزن الغرائب اور
مرآۃ العالم میں دیکھنے میں آیا ہے۔ حاجی خلیفہ کا قول ہے کہ وہ خلاق المعانی
کہلاتے تھے۔ دوسری جگہ ملک الفضلا بھی لکھتے ہیں۔ خواجو کا پورا نام
کمال الدین ابو العطا محمود بن علی ہے۔ صرف صاحب مے خانہ انکو فضل الدین
لکھ رہے ہیں۔

خاندان | تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ خواجو کرمان کے ایک معتدر اور
بزرگ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دولت شاہ کا قول ہے "از بزرگ
زادگان کرمان بود"۔ تقریباً یہی بیان مختلف عبارتوں میں ہفت اقلیم۔ مے خانہ
مجمع النفایس، اور مخزن الغرائب میں مل رہا ہے۔ اور ملا عبدالنبی صاحب
مے خانہ تو فرماتے ہیں کہ "میں نے چند نہایت معتبر کتابوں میں پڑھا ہے
کہ خواجو کے والد کرمان کے امرا میں سے تھے۔" تاہم اُن کے حسب و
نسب کا نشان نہیں ملتا۔ ان کے والد کا نام ہم جانتے ہیں کہ 'علی' تھا
اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ خواجو کہیں کہیں اپنے متعلق شخصی معلومات
بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن اپنے خاندان، آبا و اجداد کے متعلق کسی موقعہ پر
بھی تصریح نہیں کی، آپ کے معاصرین بھی اس بارے میں خاموش ہیں
خود خواجو کے چند قطعات جن میں انعام و صلۂ مدح کا تقاضا کرتے ہیں۔
بظاہر اس مسئلہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور ان کی دایم السفری بھی ایک
قوی دلیل ہے کہ کرمان میں معاش کی مستقل صورت نہ تھی، اور اپنے وطن کے

متعلق تو انہوں نے جا بجا بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ جو خالی از لطف نہیں ہم کرمان میں انہیں اکثر تکلیف میں دیکھتے ہیں۔ اور وہ ملکِ خدا تنگ نیست، کے قائل نظر آتے ہیں ؛

وطن سے بیزاری

خواجو این منزلِ ویران چہ باندازۂ تست
از اقالیم جہان خطۂ کرمان کم گیر

مجھے ان کے دیوان سے چودہ شعر ایسے ملے ہیں۔ جن میں اصل وطن سے بیزاری اور عراق، بغداد، اصفہان، شیراز کے علاوہ تبریز کے واسطے بھی آرزومندی کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے ؎

خواجو کنارِ دجلۂ بغداد جنت است
لیکن میانِ خطۂ تبریز خوشتر است

بظاہر وہ اکثر اوقات سفر میں گزار کر واپس وطن آتے ہیں اور وہ بھی دوستوں کے تقاضے پر لیکن پھر وہی شوقِ سیاحی مغلوب کر لیتا ہے اور کرمان سے اکتا کر کہتے ہیں ؎

خواجو بکام دوستان سوی وطن باز آمدی
ای دوستان از آمدن سوی وطن باز آمدیم

کرمان کو چھوڑتے وقت گویا ایک گونہ خوشی اور انبساط محسوس کرتے ہیں ؎

خرم آن روز کہ از خطۂ کرمان بروم
دل وجان دادہ ز دست از پی جانان بروم

اکثر اوقات وہ لفظ کرمان کو ذو معنی طور پر استعمال کر کے اس سے اپنی نفرت اور وہاں کی تکالیف کا اعادہ کرتے ہیں ؎

ایوبؑ اگر ز محنت کرمان بجان رسید ہرگز نخوردہ اندوہ کرمان چنانکہ من

۵ میل خواجو ہمہ گر سوی عراق ست مگر
صبر ایوبؑ خلاصی دہد از کرمانش

اس وجہ سے ہمیں ان کی مالی حالت سے اطمینان نہیں، اور ان کا توسّل خاندانِ امرا سے بعید معلوم ہوتا ہے ؂

تصانیف خواجو کی تصنیفات میں سب سے دلچسپ ان کا دیوان ہے۔ جس میں غزلیات کے علاوہ ان کے قصائد، قطعات، ترکیب بند، اور کئی دلچسپ نظمیں شامل ہیں، اس کے علاوہ ان کا خمسہ ہے جو انہوں نے نظامی کی طرز میں لکھا ہے، میری مراد ہمای ہمایون، گل و نوروز، روضۃ الانوار، کمال نامہ اور گوہر نامہ سے ہے۔ بلوشی اور سپرنگر ایک اور مثنوی مفاتیح القلوب و مصابیح الغیوب کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ قومی پیرس میں ہے۔ ایک ساتویں مثنوی سام نامہ ہے جو خواجو سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے متعلق بہت کچھ بحث چلی آرہی ہے۔ اور میرا خیال ہے (اس روٹوگراف کو دیکھ کر جو برٹش میوزیم سے منگایا گیا ہے) کہ خواجو نے کبھی سام نامہ نہیں لکھا۔ کسی نے شاہنامہ اور ہمای ہمایوں سے سرقہ کیا ہے۔ اور موجودہ صورت دے دی ہے۔ رباعیات خواجو کا بھی ایک نسخہ کتاب خانۂ پیرس میں ہے۔ وہاں چند مختصر رسالے نثر میں بھی ہیں۔ سعید نفیسی بھی دو مختصر رسالوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو انہوں نے آقای حاجی حسین آقا ملک کی لائبریری طہران میں دیکھے۔ جن کا موضوع اُن کو مقالہ لکھتے وقت یاد نہ رہا ؂

تصانیف کے قلمی نسخے خواجو کی تصانیف کے قلمی نسخے برٹش میوزیم باڈلین لائبریری، انڈیا آفس، ایشیاٹک سوسائٹی

بنگال لائبریری، کتاب خانۂ قومی (پیرس)، بانکی پور لائبریری، پروفیسر براؤن لائبریری، رام پور، کپورتھلہ، کتاب خانۂ مجلس شورای ملی ایران میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے سب سے قدیم نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔ یہ تین مثنویوں ہمای ہمایون، کمال نامہ، روضۃ الانوار کا مجموعہ ہے۔ سنہ تحریر ۷۹۸ ہجری ہے۔ کاتب میر علی بن الیاس التبریزی الباورچی ہیں۔ جن کا کچھ حال کتاب پیدائشِ خط و خطاطان میں حاجی میرزا عبدالمحمد خان ایرانی نے دیا ہے۔ یہ بزرگ عام طور پر نستعلیق کے موجد مانے جاتے ہیں۔ کچھ بھی ہو اپنے زمانے کے ماہر استاد تھے۔ خط کیا ہے۔ گویا موتی پرو دیئے ہیں۔ چونکہ یہ نسخہ ساڑھے چھ سو سال سے زائد معمر ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے ماہر فن کی یادگار ہے۔ اور شاعر کی وفات کے تقریباً چالیس برس بعد کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئے اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس کا روٹوگراف موجود ہے۔ میں نے مثنوی کمال نامہ کا متن تیار کرنے میں اس نسخہ سے بہت مدد لی ہے۔ اور اکثر اس پر اعتماد کیا ہے۔ دو ایک تصاویر بھی ساتھ ہیں۔ جو اس زمانہ کی مصوری کا شاید نہایت عمدہ نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ دو تین ورق اس کے ضایع ہو چکے ہیں، دوسرا نسخہ مکمل خمسہ کا ہے۔ اس کا سنہ تحریر ۹۳۴ ہجری ہے۔ اور کاتب علی بن حسین بن عمادالدین حسینی ہیں۔ ہماری لائبریری میں اس نسخہ سے گل و نوروز اور گوہر نامہ کے روٹوگراف موجود ہیں۔ اس کے اوراق بھی چند جگہوں سے نہیں ہیں۔ اور خاتمہ کے دو صفحے بھی مفقود ہیں۔ خط نستعلیق ہے گر صاف نہیں اور میر علی کی شیرینی تو سرے سے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سام نامہ کے دو نسخے بھی موجود ہیں

ان میں ایک پر بادشاہِ اودھ کی مُہر ہے۔ اور دوسرا نسخہ J. H. Hindley کا سنہ ۱۸۱۱ء کا محررہ ہے۔ اس کا روٹوگراف بھی پنجاب یونیورسٹی کے کتاب خانہ میں موجود ہے۔ میوزیم میں دیوان کا نہایت عمدہ نسخہ بھی ہے، سنہ تحریر موجود نہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ پندرھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا ہوگا۔ نہایت صاف لکھا ہے۔ اور خاصہ ضخیم ہے۔ اس کا روٹوگراف بھی ہماری لائبریری کے لئے باعثِ زینت ہے۔ باڈلین لائبریری میں کلیاتِ خواجو کا ایک نہایت عمدہ نسخہ ہے۔ سنہ تحریر تو درج نہیں لیکن خاصہ پرانا معلوم ہوتا ہے۔ مکمل دیوان کے علاوہ خمسہ کی مثنویاں ہیں۔ اسی لائبریری میں خلاصۃ الکلام مؤلفہ ابراہیم خان بہادر ناصر جنگ خلیل ۱۱۹۸ھ کا ایک نسخہ بھی ہے۔ اس میں ۷۰ شعرا کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔ اس میں چوبیسویں خواجو ہیں۔ گل و نوروز، ہمای ہمایون، کمال نامہ کے علاوہ سام نامہ کا انتخاب بھی ہے۔ مگر اسپتے کا خیال ہے۔ کہ یہ سام نامہ وہ نہیں جو انڈیا آفس کے کتاب خانہ میں ہے ؛

انڈیا آفس کے کتاب خانہ میں ہمای ہمایون اور سام نامہ کے نسخے ہیں۔ پہلی مثنوی کا اصلی نسخہ مجھے دیکھنے اور اس کی مدد سے ہمای ہمایون کے متن تیار کرنے کا فخر حاصل ہے۔ سام نامہ کا سنہ تحریر ۱۰۸۵ھ ہے۔ لیکن فاضل فہرست نویس نہایت حیرت سے رقمطراز ہیں کہ نہ صرف پہلا شعر بلکہ متن کا اکثر حصہ مثنوی ہمای ہمایون اور اس کا ایک ہی ہے۔ صرف اسمای ہمای و ہمایون کو سام اور پریدخت میں تبدیل کر دیا ہے ؛

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا نسخہ پنج مثنویات خواجو میرے زیرِ نظر ہے اس کا سال تحریر سنہ ۹۹۰ھ ہے۔ برہان الدین بن بھائی جیو ؟ مخدوم کاتب ہیں

نہایت خوشخط اور دیدہ زیب ہے۔ لیکن دوسری مثنویاں سوائے کمال نامہ ناقص الآغاز یا ناقص الاختتام ہیں، دو ایک ورق نہیں بیسیوں صفحے غائب ہیں۔ ساتھ ہی ہاشمی کی مظہر الآثار کو خواجو کی مثنوی روضۃ الانوار سے خلط ملط کر دیا ہے۔ اسی کتاب خانہ میں سام نامہ کا ایک نسخہ بھی ہے۔ اور اس میں پہلا شعر اور متن کا اکثر حصہ ہمائے ہمایون سے ملتا ہے۔ لیکن یہ مثنوی ہمائے ہمایون سے لمبی ہے۔ سام کے آبا و اجداد کے کارہائے نمایاں کے ذکر کے بعد تیمور اور شاہرخ میرزا کے نام بھی آرہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ایواناف کا قول ہے۔ کہ کتاب تیموریوں کے آخری زمانہ میں لکھی گئی۔ شاہنامہ کے بہتیرے اشعار آغاز میں آرہے ہیں۔ جس سے پیچیدگی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کپورتھلہ لائبریری میں خواجو اور سلمان ساوجی کا یکجا دیوان ہے۔ لیکن اس میں صرف غزلیات ہیں۔ قصائد، مراثی، قطعات اور دیگر اصناف سخن نہیں۔ بانکی پور میں دیوان خواجو کا ایک جدید نسخہ اور ہمائے ہمایون کے دو نسخے ہیں۔ جو میری نظر سے نہیں گزرے۔ ایسے ہی پروفیسر براؤن مرحوم کی لائبریری میں دیوان کے دو نسخے موجود ہیں۔ نہایت افسوس ہے کہ خود ایران کے کتاب خانۂ مجلس شورائے ملی میں ایک اسی مجہول منظومہ (سام نامہ) کا بے تاریخ نسخہ ہے اور دوسرا روضۃ الانوار کا ہے۔ جس کا سنہ تحریر ۱۳۰۱ ہجری ہے۔ البتہ پرائیویٹ کتاب خانوں میں اور چیزیں مل رہی ہیں۔ مثلاً سعید نفیسی کا قول ہے کہ دیوان خواجو کے دو نسخے طہران میں ہیں۔ اور ان میں سے بہترین حاجی حسین آقا کے کتاب خانہ میں ہے ایک اور عمدہ نسخہ کلیات کا آقائے عبدالرحیم خلخالی ایڈیٹر دیوان حافظ کے ہاں ہے۔ جس کی بنا پر نفیسی صاحب نے اپنا مقالہ لکھا ہے۔ ہمیں ایسی

کتابیں بہت مل رہی ہیں جن میں خواجو کے کلام کا انتخاب ہے۔ قدامت کے لحاظ سے دوسرا بہترین نسخہ کلیات کا کتاب خانۂ قومی پیرس میں ہے۔ اس کا سنہ کتابت ۸۲۶ ہجری ہے۔ اوربلو شے نے اس کی کیفیت اپنی تیسری جلد میں دی ہے ؛

خواجو کی نثر

وہ نثر کے رسالوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ان میں ایک رسالۃ السیفیہ ہے جسے انجام میں رسالۂ مناظرۂ شمع و شمشیر لکھا گیا ہے۔ مرصّع نثر کے ساتھ ساتھ نظم بھی ہے۔ شمع و شمشیر کا پُر لطف مناظرہ ہے۔ یہ کتاب امیر مبارز الدین محمد کے نام پر معنون کی گئی تھی، دُوسرا رسالہ بھی اسی قسم کا ہے جس کا عنوان موجود نہیں۔ اسے شاعر نے سفر حج کے دوران میں لکھا اور اپنے پیر و مرشد "شیخ الاسلام حجۃ الدین امین الدین زین الاسلام" کے نام نامی سے مزیّن کیا ہے۔ شیخ کا سنِہ وفات ۷۴۵ھ ہے اس سے معلوم ہُوا کہ خواجو نے فریضۂ حج ۷۴۵ھ سے پہلے ادا کیا ہوگا۔ تفصیلات مکمل تصنیفات کے مطالعہ کے بعد ہی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ایک اور رسالہ مناظرہ سحاب و شمس کا ہے۔ جو وزیر غیاث الدین محمّد کے نام پیشکش کیا ہے، ایک چوتھا رسالہ جس کا نام رسالۃ السراجیہ یا مقالۃ الوہاجیہ ہے۔ جھاڑ کے استعمال و فوائد پر شاعرانہ طرز میں لکھا ہے۔ افسوس ہے کہ اس نایاب مجموعہ میں کمال نامہ موجود نہیں۔ اس کا خط نسخ ہے اور کاتب عبدالملک ابن محمّد اسعد الدین ہیں۔ قدیم ہونے میں یہ نسخہ برٹش میوزیم کے نسخہ سے دوسرے نمبر پر ہے ؛

خواجو کی مطبوعہ مثنویاں

ہمارے شاعر کی ساری کتابیں سوائے دو کے ابھی چند قلمی نسخوں پر مبنی ہیں۔ ہمارے ہمایوں

صرف ہندوستان میں دو دفعہ چھپی ہے۔ ۱۲۸۹ھ میں بمقام لوہارو فخر الدولہ مرزا علاء الدین خان بہادر رئیس لوہارو کی تصحیح سے اور پھر ۱۳۲۰ھ میں بمقام بمبئی محمد اردکانی کے اہتمام سے، بمبئی ایڈیشن وہارو ایڈیشن کا پورا پورا چربہ ہے۔ جو حصہ میں ساقط ہے اس میں بھی نہیں ہے:

یہ دو نسخے بلحاظ نایابی قلمی نسخوں سے کم نہیں۔ بمبئی ایڈیشن صرف گورنمنٹ کالج لاہور کی لائبریری میں ہے۔ اور لوہارو ایڈیشن اورینٹل کالج کے فاضل پرنسپل صاحب کی ملکیت ہے۔ اس مثنوی کے علاوہ روضۃ الانوار ۱۳۰۶ ہجری شمسی میں حسین خان کوہی کرمانی نے بحروف سربی طبع کرائی ہے افسوس ہے کہ دیوان خواجو اس قدر دلچسپ اور سراپا معانی ہونے کے باوجود اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا:

ہمائے ہمایون خمسہ کی بحث: ہمائے ہمایون شاعر کی سب سے پہلی مثنوی ہے۔ اسی نام کی ایک مثنوی ترکی زبان میں فضلی شاعر المتوفی ۹۰۷ نے بھی لکھی ہے۔ یہ شہزادہ ہمائے شہنشاہ خاور زمین کے اکلوتے فرزند اور چین کے حکمران کی چشم وچراغ شہزادی ہمایون کے معاشقہ کی داستان ہے۔ اس مثنوی کا وزن سکندر نامہ کا ہے (فعولن فعولن فعولن فعول یا فعل) متقارب مثمن مقصور یا محذوف ہے۔ لیکن موضوع عاشقانہ ہے۔ خواجوی کرمانی کے ہاں مثنویوں کا وزن خمسۂ نظامی کی طرح ہے۔ لیکن ہر مثنوی کا موضوع نظامی کی مثنویوں کا پابند نہیں۔ صرف روضۃ الانوار اور گل و نوروز کا وزن و مضمون مخزن الاسرار اور خسرو شیرین کا سا ہے۔ گہر نامہ کا وزن خسرو شیریں کا ہے۔ لیکن موضوع وہی نہیں۔ ایسے ہی کمال نامہ کا وزن ہفت پیکر کا ہے۔ لیکن مضمون عارفانہ صوفیانہ ہے۔ ہمای ہمایون کا

سنہ تصنیف ۷۳۲ھ ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

من این نامور نامہ از بہر نام — چو کردم بسال ہمایون تمام
کنم بذل بر ہر کہ دارد ہوس — کہ تاریخ این نامہ بذل است و بس

آغاز داستان میں حمد و نعت کے بعد سلطان ابوسعید بہادر خان چنگیزی اور اس کے وزیر خواجہ غیاث الدین محمد کی مدحیں ہیں۔ ابوسعید چنگیزیوں کا آخری مقتدر فرمانروا ہے۔ اس کی وفات نے تخت کے کئی دعویدار پیدا کر دیئے۔ ملک میں بدامنی کا دور دورہ رہا۔ جس نے امیر تیمور کے لئے موافق صورتِ حالات پیدا کر کے چنگیزی امراء کی رہی سہی قوت کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا۔ امیر تیمور کا سالِ پیدائش ۷۳۶ ہجری ہے اور اسی سال سلطان ابوسعید فوت ہوتا ہے۔ خواجہ غیاث الدین محمد اپنے والد خواجہ رشید الدین فضل اللہ کی طرح علما پروری کے لئے مشہور ہیں۔ ابوسعید کے زمانے میں علم و فضل کا جو چرچا تھا انہی کی بدولت تھا وہ خود ایک اعلیٰ درجہ کا صحیح مذاق سخن رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صدہا شاعر اور ادیب کھچے چلے آتے تھے اور اپنے ادبی شاہکار پیش کرتے تھے حمد اللہ مستوفی نے اپنی تاریخ گزیدہ انہی کے نام پر لکھی ہے۔ سلمان ساوجی ان کے مداح رہے۔ ان کا ایک قصیدہ جس میں تکلف سے صنایع بدائع کا التزام کیا گیا تھا۔ خاص طور پر ان کے لئے لکھا گیا تھا۔ قوامی گنجوی کے مشہور قصیدہ کی طرح یہ بھی اپنی طرز کا نرالا قصیدہ ہے۔ ایسا ہی ایک قصیدہ مخزن البحور و مجمع الصنایع شمس فخری نے بھی لکھا۔ یہ بھی اسی وزیر کے مداح تھے۔ قاضی عضد الدین ایجی نے جو متکلمین بزرگ سے ہیں متن مواقف، فوائد غیاثیہ شرح مختصر ابن حاجب ان کے نام معنون کیں۔

اوحدی مراغہ اس نے جامِ جم پیش کیا۔ محمد بن علی شبانکارہ ای مصنف مجمع الانساب بھی ان کے مداحوں میں سے تھے۔ عماد فقیہ نے مثنوی صحبت نامہ کو ان کے نام نامی سے منسوب کیا۔ ہمائے ہمایون بھی غالباً اسی علم دوست اور فاضل وزیر کے لئے لکھی گئی تھی۔ گو سبب نظم آوردن داستان میں بتایا گیا ہے۔ کہ صدر اعظم ابوالفتح مجد الدین محمود نے شاعر کو اس کام پر آمادہ کیا ہے۔ تاریخ میں فی الحال اس صدر اعظم کا ذکر نہیں ملا محمد بن علی شبانکارہ ای کی کتاب مجمع الانساب اسی زمانہ کی نادر تاریخ ہے لیکن یونیورسٹی لائبریری میں نہ اس کا کوئی قلمی نسخہ ہے اور نہ ہی کوئی عکس ہے۔ ان مدائح کے بعد ایک ساقی نامہ ہے۔ اور جس طرح میخانہ کے فاضل ایڈیٹر نے دیباچہ میں تصریح کی ہے۔ بظاہر خواجوی کرمانی ہی نے پہلا باقاعدہ ساقی نامہ لکھا۔ جو اس کتاب میں ہے۔ اس ساقی نامہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شاعر نے اس کو نو نو شعر کے دس بندوں میں لکھا ہے۔ بعد میں داستان کا آغاز ہے۔ جس کا مضمون محض افسانوی حیثیت رکھتا ہے۔ چند اشعار سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس منظومہ کا ماخذ کوئی پرانا ایرانی افسانہ ہے۔ جو خواجو کو دیا گیا۔ کہ "فسونِ مغان بر مسلمان بخوان"۔

اس میں کلام نہیں کہ اس مثنوی میں وہ لطافت اور شیرینی جو خواجو سے توقع کی جا سکتی ہے اور جو ان کی بعد کی مثنویوں میں نمایاں ہے نسبتاً کم ہے۔ شاید تصوف کا رنگ ابھی ان پر نہیں چڑھا۔ تبھی وہ گھلاوٹ جو اس کا خاصہ ہے سرے سے مفقود ہے۔ جہاں شہزادے ہمائے کے ملک خاور کے تخت و تاج کو چھوڑ کر چین چلے جانے کی داستان ختم کی ہے، "نتوان مرد بسختی کہ من اینجا زادم" کے مصداق کرمان کی شکایت کرتے اد

بغداد جانے کے شایق نظر آتے ہیں ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کا یہ حصہ کم از کم کرمان میں لکھا گیا ہوگا ۔ آخر میں شاعر نے اپنی خستہ حالی کا باب کھولا ہے ۔ اس کے ممدوح فوت ہو چکے ہیں ۔ بغداد میں اس کا کوئی قدر شناس نہیں رہا ۔ یہ مثنوی جو بڑی محنت اور آرزوؤں سے لکھی گئی تھی ویسے ہی گھر رکھی ہے ۔ کسی کے پیشکش نہیں کی ۔ ان حالات میں وہ واپس وطن آتا ہے اور خواجہ تاج الدین عراقی کی بدولت جو کرمان کے امیر ہیں ۔ قاضی شمس الدین صائن حاکم سیرجان سے شناسائی حاصل کرتا ہے ۔ ہمائے ہمایون ان کے پیش کی جاتی ہے ۔ قاضی مذکور اور ان کے فرزند رکن الدین عمید الملک انعام و اکرام سے ہمت افزائی کرتے ہیں ۔ تاج الدین عراقی امیر مبارز الدین محمد مظفر کے وزیر بھی رہے ہیں ۔ امیر نے جب ۷۴۱ھ میں کرمان کا محاصرہ کیا ہے تو خواجہ تاج الدین عراقی ہی نے سب سے پہلے شہر سے باہر نکل کر اظہار اطاعت و وفاداری کیا عماد فقیہ نے محبت نامۂ صاحبدلان مصنفہ ۷۳۲ھ (نام خود مادۂ تاریخ ہے) انھی کے نام معنون کیا ۔ اور خواجو نے اپنی مثنوی گل و نوروز بھی ان کے لئے لکھی ؛

قاضی شمس الدین صائن چوپانیوں کی طرف سے سیرجان کے حاکم تھے ۔ پہلے امیر پیر حسین چوپانی اور پھر ملک اشرف کے ہوا خواہوں میں رہے ۷۴۴ھ کے بعد جب ملک اشرف نے شیراز کو فتح کرنا چاہا تو امیر مبارز الدین سے مدد مانگی ، امیر نے جواب میں لکھا کہ اگر ارادہ دوستانہ تعلقات رکھنے کا ہے ۔ تو قاضی شمس الدین صائن کو میرے ہاں بھیجئے ۔ امیر پیر حسین چوپانی اور امیر مبارز الدین کی باہمی شکر رنجی کا باعث یہی قاضی صاحب تھے

چنانچہ ان کو بھیجا گیا۔ امیر مبارز الدین مہربانی سے پیش آئے۔ لیکن قلعۂ سیرجان چند ہزار دینار سالانہ کے عوض ان سے لے لیا۔ کچھ عرصہ بعد قاضی شمس الدین صائن نے ارادہ ظاہر کیا۔ کہ اسے شیراز جانے کی اجازت دی جائے۔ تاکہ بادشاہ شیراز شیخ ابو اسحٰق اور امیر مبارز الدین میں جو دیرینہ رنجش چلی آتی ہے۔ دُور کی جائے۔ اور ابرقوہ اور شبانکارہ کو قلمرو مبارزی کے ساتھ ملحق کیا جائے۔ چنانچہ وہ شیراز بھیجے گئے۔ وہاں جا کر قاضی صاحب سب کچھ بھول بیٹھے۔ شیخ ابو اسحٰق نے ان کو سیّد غیاث الدین علی یزدی کے ساتھ اپنا وزیر بنا لیا اور امیر مبارز الدین کی مخالفت علانیہ ہونے لگی۔ خواجہ تاج الدین عراقی نے قاضی صاحب کو شیراز بھجوانے کی کوشش کی تھی۔ امیر مبارز الدین نے غضبناک ہو کر تاج الدین عراقی کے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس نے یہ شعر پڑھا ؎

بر تاج عراقی ز سر لطف ببخش
تا خسرو تاج بخش خوانند ترا

اس دفعہ تو جان بچ گئی۔ لیکن پھر کسی جرم میں متہم ہو کر شہید ہوئے۔ قاضی شمس الدین قلمدانِ وزارت سنبھالتے ہی کرمان کی فتح کے خواب دیکھنے لگے۔ لشکر فراہم کیا اور مقابلہ کے لئے آئے۔ فوج نے شکست کھائی اور خود بھاگ نکلے۔ امیر مبارز الدین کے آدمیوں نے تعاقب کیا۔ گرفتار ہوئے۔ اور قتل کئے گئے۔ یہ واقعہ ۷۴۶ ہجری کا ہے۔ خواجو کا ایک شعر جو اس واقعہ کی تاریخ سے متعلق ہے۔ اور بقول ریو حافظ ابرو کی زبدۃ التواریخ میں ہے۔ مجھے باوجود تلاش کے نہیں ملا۔

ایک مسئلہ | مثنوی ہمائے ہمایون سلطان ابو سعید کی وفات سے چار برس

پہلے لکھی جاتی ہے۔ سلطان کی وفات کے پانچ ماہ بعد فاضل وزیر کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا موانع تھے۔ جن کے ہوتے ہوئے شاعر اتنے عرصے انعام سے محروم رہا اور آخر اسے مایوس ہو کر مان واپس آنا پڑا۔ افسوس ہے۔ کہ متنِ کتاب نے ہماری رہنمائی نہیں کی۔ اس کے علاوہ وہ "سببِ نظم آوردن کتاب" میں لکھتے ہیں ؎

برفت از دلم ہوش واز دیدہ خواب
ز چشمم ببارید چون ژالہ آب
کہ اکنون کہ دور سپہری کہ گشت
سہ دہ سال از عمر من درگذشت

گویا مثنوی لکھتے وقت وہ تیس برس کے تھے۔ جب ان کی پیدائش ۶۸۹ ہجری میں ہوئی تو لامحالہ آغاز مثنوی ۷۱۹ میں ہوا۔ لیکن انجام مثنوی کی تاریخ خود انھوں نے ۷۳۲ ضبط کی ہے۔ اب یہ ماننا کہ ۱۳ سال صرف یہی مثنوی لکھا کئے۔ خلافِ عقل ہے۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ لکھتے لکھتے اسے ترک کر دیا ہو، اور پھر مدّت گزرنے پر اسے مکمل کیا ہو۔ یہ گتھی تا حال میں نہیں سلجھا سکا ہوں +

گل و نوروز دوسری مثنوی گل و نوروز ہے۔ جو ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ یہ منظومہ جس طرح پہلے عرض کر چکا ہوں مضمون و وزن کے لحاظ سے خسرو شیرین کی متبع ہے، (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل) ہزج مسدس مقصور۔ اور خواجو کے خمسہ کی سب سے بڑی مثنوی ہے۔ شہزادے نوروز اور شہزادی گل دخترِ قیصرِ روم کے معاشقہ کی داستان ہے۔ تاریخ سے اس کا تعلق اتنا ہے کہ جن دنوں ایران کی

سلطنت ایک عظیم الشان ایشیائی حکومت مانی جاتی تھی - ایرانی شہزادے قیاصرہ روم کی لڑکیوں کو شاہی محل کی زینت بنایا کرتے ہوں گے - اور ساسانی زمانہ میں جب آرمینیا اور میسوپوٹیمیا کے سلسلے میں کشمکش رہی - اس قسم کے واقعات رونما ہوتے ہوں گے - پس بعید نہیں کہ رومن حسن نے ایرانی افسانہ نویس، داستان گو، اور شاعر کے لئے اس قسم کی اکثر داستانوں کے لئے پس منظر بہم پہنچایا۔ "سبب نظم آوردن داستان" میں فرماتے ہیں :-

شبی بودم زجام بیخودی مست	زسرمستی چو ساغر رفته از دست
زناگه بخت نیکم روی بنمود	نگارینم درِ کاشانه بگشود
بدستش حقه ای بر سر نهاده	زمهرش مهری از زر بر نهاده
مصور دیبهی از دیر هرقل	زده نیرنگ آن جادوی بابل
بلفظ هندوی میمون کتابی	زفهرستش ریاض خلد یابی
بخط فیلسوفان کهن سال	نوشته نسخه بر وعظ و (؟) امثال پر؟
گزیده داستان باستانی	درو گنجی نهفته شایگانی
پس آنگه گفت کای مرغ سخن گوی	که بردی از امیران سخن گوی
تو این اجزا که می بینی بدستم	طرازی نیست کان من نقش بستم
ببابل سحر سازانی که بودند	بنگاه باستان این در گشودند
بدستم داد آن دیرینه اوراق	که ای شاه سخن گویان آفاق
گل و نوروز را در پرده می آر	چو گل نوروز را بر پرده می آر
بلا به گفتمش کای چشمهٔ نور	زچشم و چشم بندت چشم بد دور
سخن گویان بسی در دهر هستند	اگر چه زین معانی تنگ دستند

دلی گر باشدت با من عنایت   کشم در رشتۂ نظم این حکایت

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی پرانی داستان ملی کہ بابل ہیں لکھی گئی تھی، اُسے خواجو نے نظم کیا۔ میرا خیال ہے۔ کہ ہمارے شاعر کو کوئی کتاب ملی ہو یا نہ ملی ہو مگر یہ قصہ کم از کم بطور افسانہ عام مشہور ہو گا یا خواجو نے کہیں سے سنا ہو گا۔ ساری کتاب کے مطالعہ کے بغیر اس کے متعلق کچھ اور نہیں کہہ سکتا ہوں۔

ہماری مثنویاں

افسوس ہے۔ کہ ہمارے شاعروں کے ہاں ایسی داستانیں تو ہیں۔ لیکن وہ اس کو اتنا لمبا کر دیتے ہیں کہ سنبھال نہیں سکتے۔ چارلس ڈکنز کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ وہ رجال افسانوی بہتیرے لاتا ہے اور ہر دم بڑھاتا جاتا ہے۔ چونکہ ان کو سنبھال نہیں سکتا۔ اچانک ایک ایک کو لقمۂ اجل کرتا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں جتنے عشقیہ افسانے نظم کی صورت میں ہیں نہایت دلچسپ ہیں، ان میں اکثر تو Ballads ہیں جن کا ایک ایک بند لطف سے لبریز ہے۔ باقی Love poems بھی ایک دفعہ اٹھا کر رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ مثنویاں ہیں۔ کہ اگر ان کی افسانوی حیثیت پر غور کیا جائے تو ماحصل تین صفحوں میں آجائے گا۔ اور دلچسپی کا یہ عالم ہے۔ کہ پڑھتے پڑھتے انسان اُکتا جاتا ہے اور کتاب بند کر کے مصنف کو کوسنے کو جی چاہتا ہے۔ محبت کا آغاز نہایت مختصر ہے اور بسا اوقات انجام بھی مختصر تر ہوتا ہے۔ اس سارے جھگڑے کو پانچ ہزار شعر میں بیان کرنا عشق و محبت کی شعریت کو ضایع کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ میرا ذاتی نظریہ ہے کہ ہمیں ان عشقیہ مثنویوں سے اتنا لطف حاصل نہیں ہوتا جتنا ہم عام حالات میں توقع کرتے ہیں اور اس کا سب سے بڑا سبب میرے نزدیک ان حضرات کی دیر بیانی ہے۔ ہاں زور قلم کا کیا کہنا

وضاحت کے دریا امڈ پڑتے ہیں اور اکثر اوقات متاعِ افسانہ کو بھی بہا لے جاتے ہیں۔ اور شاید یہ لوگ لکھتے بھی اسی خاطر تھے۔
ملٹن کے گم شدہ فردوس کے متعلق اس قدر لکھا جاتا ہے۔ کہ شکسپیئر کے بعد شاید ہی کسی اور مصنف یا کتاب کے متعلق لکھا جاتا ہو لیکن گمشدہ فردوس کے مطالعہ کرنے والے کتنے ہیں۔ یہی حال ہمارے ان خمسوں کا ہے،
نظامی کا خمسہ عروسِ ادب کا بہترین زیور ہے، لیکن کتنے صاحب ہیں جنہوں نے خمسہ کو پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے، البتہ مسجدوں میں سکندر نامہ مولوی صاحبان لہرا لہرا کر پڑھا کرتے ہیں اور خسرو شیریں ایم اے کے نصاب میں داخل ہے۔
مثنوی گل و نوروز کا دیباچہ خواجہ تاج الدین عراقی کے نام سے ہے، اور خاتمہ میں شیخ ابو اسحٰق ابراہیم مقدس گازرونی کی مدح ہے۔ غالباً خواجو متعدد بار ان کے مزار کی زیارت کو گئے ہوں گے، ان کے دیوان میں بھی شیخ کی مدحیں ہیں، شیخ کا سنہ وفات ۴۲۶ھ ہے۔ وہ اپنے زمانے کے صاحب کشف و کرامات تھے۔ ان کا مزار اب بھی مرجع خاص و عام ہے۔
بقول صاحب آثار عجم " شیخ ابو اسحٰق ابراہیم بن شہریار گازرونی عارفی ست محقق و فاضلی مدقق، پدرش ظاہرا پارسی مذہب بودہ مسلمان شدہ و شیخ مذکور مرجع مشائخ عہد گردیدہ و در بسیاری از بلاد رکایا و خانقاہ اساس فرمودہ، و بر آنہا اشخاص گماشتہ کہ بمصالح آن بقاع قیام نمایند و فقرا و مساکین را کہ وارد می شوند پذیرائی کنند، گویند چندین ہزار کس از گبر و یہود بدست وی مسلمان گشتند و پیوستہ با طوائف مجوس و کفار مبارزت می نمودہ باین جہت اورا شیخ غازی می خوانند، شیخ ابو سعید ابوالخیر با او معاصر بودہ بالجملہ وفاتش در

سنہ ۴۲۶ ہجری بعمر ہفتاد اتفاق افتادہ در خانقاہی کہ موسوم بنام اوست مدفون است در گازرون"۔ اس کے بعد شیخ الاسلام امین الدین گازرونی متوفی ۷۴۵ھ کی مدح ہے۔ ان کا حال آگے آئے گا۔

مثنوی کا سنہ تصنیف بقولِ خود مصنّف ۷۴۲ ہجری ہے،

صفر بود و قمر میزانش در جنگ　　شہ سیارگان با شیر در جنگ
بروز جیم از مہ دال رفتہ　　ز ہجرت با و میم و ذال رفتہ

پھر کہا ہے:-

وگر خواہی کہ روشن تر بگویم　　غبار نکرت از طبعت بشویم
دو شش بر ہفصد و سی گشتہ افزون　　بپایان آمد این نظم ہمایون

لطف یہ ہے کہ شاعر نے مثنوی کے اشعار کی تعداد بھی ضبط کر دی ہے،

چون این ابیات دلکش بخوانی　　گرت باید کہ اعدادش بدانی
غلام خویش را با سرو گلشن　　مکرر کن کہ گردد با تو روشن

۱۹۸۶　۲۶۵　۴۰۰　۲ × ۲۶۵۱ = ۵۳۰۲

برٹش میوزیم کے نسخہ میں شاید ہی اتنے شعر ہوں۔ ایک ایک کر کے تو ابھی شمار نہیں کئے، اندازہ پورا نہیں اترتا۔ اس مثنوی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شاعر نے اپنی تاریخ پیدائش اور نام کی تصریح کر دی ہے۔ کاش چند اور امور بھی لکھ دیتے ؛

روضۃ الانوار

خمسہ کی تیسری مثنوی باعتبار سنہ تصنیف روضۃ الانوار ہے۔ جو حسین خان کوہی کرمانی مدیر نامۂ ادبی نسیم صبا نے طہران سے ۱۳۰۶ ہجری شمسی میں بحروف سربی طبع کرائی ہے۔ سو صفحہ کی مختصر سی کتاب ہے۔ بہت اچھی چھپی ہے۔ مختصر سا دیباچہ بھی ہے۔ جس کی چند خامیوں کو

دیکھ کر پروفیسر سعید نفیسی نے اپنا مقالہ لکھا۔ فاضل ایڈیٹر نے متن کو دو تین نسخوں کی مدد سے تیار کیا ہے۔ اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۷۴۳ ہجری ہے خود شاعر نے تصریح اس طرح کی ہے :-

روز الف بود کہ والا دبیر	نقش قصب باز گرفت از حریر
جیم زیادت شدہ بر میم و ذال	و آمدہ چون عین منعل ہلال
شیر سوار فلک تیز پوی	تافتہ از جلوہ گہ خویش روی
شمع زر از فلک برافراختہ	بر بنہ تیر مکان ساختہ
گشتہ بداس مہ نو خوشہ چین	ریختہ از غالیہ دان مشک چین

ان اشعار سے واضح ہے۔ کہ خواجو نے روضۃ الانوار کو سنہ ۷۴۳ ہجری میں کسی ماہ قمری کی تاریخ اول کو ختم کیا ہے اور وہ قمری مہینہ تیر ماہ سے مطابق اور سورج برج اسد میں تھا۔ سعید نفیسی لکھتے ہیں کہ پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ قمری ماہ صفر تھا۔ اس کتاب کا دیباچہ اور خاتمہ شمس الدین صائن قاضی کے نام ہے ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

خمسۂ خواجو کی دو کتابیں مجھے بہت پسند آئی ہیں۔ ایک تو یہی روضۃ الانوار دوسری کمالنامہ، روضۃ الانوار مخزن الاسرار کے جواب میں ہے اور بہت خوب لکھی ہے، بیس مقالے ہیں اور ہر مقالے کے ساتھ ایک تمثیلی حکایت ہے، زبان کی چاشنی الفاظ کی نشست، محاورہ کی چستی، خیالات کی رفعت، طرز بیان کی پاکیزگی، غرض ہر لحاظ سے یہ مثنوی خواجو کے کلام کا نہایت عمدہ نمونہ ہے، حق تو یہ ہے کہ ۵۴ برس کی عمر میں جو چیز لکھی جا رہی ہے۔ بہترین ہونی چاہیئے۔ میں اپنے دوستوں کو مشورہ دوں گا کہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں، یونیورسٹی لائبریری سے یہ کتاب عرصۂ تین سال سے کسی نے مستعار نہیں لی۔ اس کتاب میں ایک

خواب بھی بچپن کا بیان کیا ہے۔ جس میں ایک فرشتے نے پیشین گوئی کی تھی کہ

ملک سخن زانِ تو خواہد شدن عقل ثنا خوانِ تو خواہد شدن

تیرِ حدیثِ تو بجوزا رسد نام بلندت بہ ثریا رسد

چوتھی مثنوی کمال نامہ ہے۔ اس کا موضوع روضۃ الانوار کی طرح عارفانہ اور متصوفانہ ہے۔ وزن ہفت پیکر کا ہے (فعلاتن مفاعلن فعلان)۔ خفیف اصلم مسبغ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مثنوی حکیم سنائی کی سیر العباد الی المعاد کی طرز پر ایک ہی وزن اور مضمون میں لکھی گئی۔[1] ہم بوثوق کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت وہ شہرت جس کی تمنا ایک شاعر کے دل میں ہو سکتی ہے۔ خواجو کو حاصل ہو چکی تھی۔ اور ان کے کلام میں وہ گھلاوٹ اور شیرینی جو صوفیانہ کلام کا خاصہ ہے آ چکی تھی،

کمال نامہ کمال نامہ میں مختلف عارفانہ مضامین معرضِ بحث میں لائے گئے ہیں۔ ان کو بارہ پُر زور مقالوں کے تحت ترتیب دیا ہے اور ہر مقالہ کو ایک تمثیلی حکایت سے واضح کیا ہے۔ مثنوی مولانا روم تصوّف کا ایک بحرِ ذخّار ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے کافی وقت کے علاوہ تحمّل کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں کمال نامہ کو رموزِ تصوّف پر ایک مختصر اور دلچسپ منظوم رسالہ کی حیثیت حاصل ہے۔ حمد و نعت کے بعد شیخ ابو اسحٰق ابراہیم مقدس گازرونی کی مدح ہے۔ ان کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ خواجو ان کے بہت مداح نظر آتے ہیں۔ وہ اکثر جگہ اقرار کرتے ہیں۔ کہ گازرون سے ان کو فیض ملا۔ اور یہ فصاحت اور شیرینی کلام میں وہیں سے عطا ہوئی اور اس سے پہلے

ہیچ شعرت بدین شعار نبود نقد علینت بدین عیار نبود

چون بملک ورع نہادی روی شد دماغت زگازرون خوشبوی

---

[1] خود انہوں نے اس کی تصریح نہیں کی، سعید نفیسی اور نہار سن نگاروں کا قول ہے۔

پھر روحِ شیخ مرحوم کو مدد کا وسیلہ بناتے ہیں ، ایک سالک کی حیثیت سے مقصودِ کلی کی تلاش میں چل نکلتے ہیں ۔ رہنمائی کے لئے خاک ۔ باد ۔ آب ۔ اور آتش سے باری باری خطاب کرتے ہیں ۔ یہ خطابات نہایت لطیف اور دلچسپ ہیں ۔ لیکن بے بسی اور عدم اختیار کا جواب ملتا ہے ۔ پھر عشق و بیخودی ہی کو رہنما بناتے ہیں ، عالمِ خیال میں پیر سے ملاقات ہوتی ہے ۔ وہ تمام رموز و حقایقِ یزدانی سے واقف کرتے ہیں ۔ پھر یکایک مقامِ حال سے قال میں آکر وہ تمام ارشادات و اشارات جو عالمِ رویا میں ہوئے تھے بارہ مقالوں میں لکھتے ہیں ۔ مضامین وہی ہیں جو ہمارے ہاں تصوف کا سرمایہ ہیں ۔ دُنیا کی بے ثباتی ، تعلیم محبت و یگانگت ، خلق و تواضع ، زہد و توکل وغیرہ وغیرہ ۔ ایک مقالہ صوفیانِ زرّاق و مکّار کے سلسلے میں لکھا ہے ۔ خاصہ دلچسپ ہے ، 'ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی' کے مصداق اہل نظر کی آبروریزی کا ذمہ وار ان کو ٹھیرایا ہے اور انہیں ،

شہریارانِ کشورِ تلبیس شہسوارانِ لشکرِ ابلیس

کہا ہے ۔ کلام میں پختگی اور لوچ ہے ۔ لیکن کہیں کہیں دو ایک شعر خشک اور بے لُطف بھی ضرور آجاتے ہیں ۔ اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۸۴۷ھ ہے وہ خود کہتے ہیں ؎

شد بتاریخ ہشتصد و چل و چار
کار این نقشِ آزری چو نگار

(باقی آئندہ)

تاج محمد بلوچ

لے خواجو کی پیدائش سے ۲۶۳ سال قبل فوت ہو چکے تھے ۔

الی قتال بعض الخوارج :-

انی اعوذ بربی ان تقدمنی ... الی القتال فتخزی بی بنو اسد
ان المهلب حب الموت اورثکم ... وما ورثت اختیار الموت عن احد
ان الدنو من الاعداء نعلمه ... مما یفرق بین الروح والجسد

(۲۴۴) الکیّس ابو عمرو عثمان بن عیسی بن الحسن البردانی الفقیه الحنبلی

ذکره الحافظ محب الدین محمد بن النجار فی تاریخه وقال: کتب الی ابو جعفر مبارک بن المبارک المذکور ان ابا الکرم الحوزی موسی بن محمد الطیب قال اخبرنا احمد بن المظفر العطار اخبرنا احمد بن سهلان بن جابر سنة تسع وسبعین وثلثمائة قال اخبرنا ابو عمرو عثمان بن عیسی بن حسن البردانی المعروف بالکیس قال حدثنا محمد بن احمد بن علویة الشیبانی عن محمد بن مصعب عن اسمٰعیل بن زکریا عن محمد بن عون الخراسانی عن عبد الله بن العباس عن النبی صلی الله علیه وسلم۔

(۲۴۵) الکیّس ابو العباس محمد بن جعفر المتوکل بن المعتصم محمد الهاشمی العباسی الامیر[1]

ذکره الحافظ الثقة ابو القاسم علی بن الحسن بن عساکر فی تاریخه

[1] لم یصح ما نقلنا من تاریخ ابن عساکر بعد، والکیس هذا ذکر فی تاریخ الکامل (ج ص) وان کان نسخة محمد بن نفی ما ذکره، وفیها (سنة ۲۹۰) توفی ابو العباس بن الکیس او ابو العباس الکیس بن المتوکل وکان بالحبس اخو المعتمد ثم اطلقه۔

وقال: قدم دمشق مع والده المتوكّل على الله سنة ثلاث، واربعين ومأتين قال وكان المعتمد على الله اخوه قد خاف ان يبايع له بالخلافة فحدّره واباعيسى ابنى المتوكّل الى بغداد فحبسا سنة احدى وسبعين ومأتين ثم رضيَ عنهما، واذن لهما فى الشخوص الى سُرّ من رأى، وصار الكيّس من ندماء اخيه المعتمد؛ قال ابن النجّار فى تاريخه: توفى الكيّس بسرّ من رأى ودفن فى داره، وقال الصولىّ فى كتاب الاوراق توفّى فى صفر سنة اربع وسبعين ومأتين،

(٦٤٦) **الكيّس** ابو جعفر محمّد بن عبد الرّحمن بن يزيد النّخعىّ الزاهد

ذكره ابو عبدالله محمّد بن سعد كاتب الواقدىّ فى كتاب الطبقات[1] وقال، كان يقال له الكيّس لتلطّفه فى العبادة، قال سفين قال مالك: كانت عند محمّد ابن عبد الرحمن بن يزيد المعروف بالكيّس امرءةٌ صالحه ما نراه اصابها الّا بالدّعاء؛ قال سفيان: وكان ثقةً قليل الحديث؛ قال: وكان يقال له: الرّفيق والمرضىّ؛

(٦٤٧) **الكيّس** ابو ربيعة النّمر بن تولب بن زهير العُكلىّ الشاعر الصحابىّ

ذكره الامام ابو عمر بن عبد البرّ النمرى فى

[1] ج ٦ ص ٢٥٤،

كتاب الاستيعاب[1] وقال: وهم ينسبونه[2] النمر* بن ابن تولب بن زهير بن اقيش[3] بن عبد بن عوف بن عبد مناة* بن اد بن طابخة وعوف هو عكل وكان[4] ابوحاتم يقول النمر ساكنة الميم* وفد على النبى صلى الله عليه وسلم ومدحه بشعر اوله:—

انا اتيناك وقد طال السفر   نقود خيلا ضمرا فيها ضرر
نطعمها اللحم اذا عز الشجر   والخيل فى اطعامها اللحم عسر

واولها:—

يا قوم انى رجل عندى خبر   الله من اياته هذا القمر
والشمس والشعرى وايات اخر   من يتشام بالهدى فالحنث شر*

وعن ابى العلاء بن الشخير قال: كنا بالمربد فجاء اعرابى بكتف[5] او صحيفة، فقال: اقرأوا ما فيها فاذا فيها هذا كتاب رسول الله لبنى زهير بن اقيش انكم ان اقمتم الصلاة واتيتم الزكاة واديتم خمس ما غنمتم الى النبى صلى الله عليه وسلم فانتم امنون بامان الله عز وجل.
قلنا: انت سمعت هذا من رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال: نعم، وهو القائل:

اعذنى ربى من حصر وعى   ومن نفس اعالجها علاجا

[1] ج ا ص ۳۲۰، واختصره المصنف ما فيه. [2] و: ينسبونه الى النمر؟ والتصحيح من الاستيعاب
[3] فى الاستيعاب: اقيش بن عبد كعب بن عوف بن الحارث بن عوف بن وائل بن قيس
ابن عوف بن عبد مناة، [4] و * زيادة على ما فى المطبوع من الاستيعاب
[5] فى الاستيعاب: بكتاب،

آخر کتاب الکاف

اعتذار :-

کنا قد کتبنا تعلیقات [illegible] اردنا الحاقها بالکتاب تتمۃ للحواشی حسب ما وعدناہ فی مقدمۃ الکتاب فاحاطت ظروف اضطرتنا [illegible] الی فسخ ما اردناہ ونالمی [illegible] ارئ منا الاعتذار ؛

وھا نحن نلحق بالکتاب فہارس ابجدیۃ تیسیراً للانتفاع ؛

فہرس الاعلام

اللفظتان (..) کنایۃ عن "الظر"

اورینٹل کالج میگزین

حصّہ اوّل

ایڈیٹر

محمد شفیع

(پروفیسر پنجاب یونیورسٹی)

فہرست مضامین

جلد ۱۷- عدد ۱ | بابت ماہ نومبر ۱۹۴۰ء | عدد مسلسل ۶۳

نوٹ۔ ضمیمہ صرف عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کے ممبروں اور خریداران ضمیمہ میں تقسیم ہوتا ہے

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بھتہ الیسر داس پرنٹر طبع ہوا اور بابو صدیق احمد خاں نے اورینٹل کالج لاہور سے شائع کیا۔

اورینٹل کالج میگزین

عرض واجب

اغراض و مقاصد اس رسالے کے اجرا سے غرض یہ ہے کہ احیا و ترویج علوم شرقیہ کی تحریک کو تاحد امکان تقویت دی جائے اور خصوصیت کے ساتھ ان طلبہ میں شوق تحقیق پیدا کیا جائے جو سنسکرت، عربی، فارسی اور دیسی زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں ؛

کس قسم کے مضامین کا شایع کرنا مقصود ہے کوشش کی جائے گی کہ اس سلسلہ میں ایسے مضامین شایع ہوں جو مضمون نگاروں کی ذاتی تلاش اور تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ غیر زبانوں سے مفید مضامین کا ترجمہ بھی قابل قبول ہوگا اور کم ضخامت کے بعض مفید رسالے بھی باقساط شایع کئے جائیں گے ؛

رسالے کے دو حصے یہ رسالہ دو حصوں میں شایع ہوتا ہے۔ حصہ اوّل عربی، فارسی، پنجابی (بحروف فارسی) حصہ دوم سنسکرت، ہندی، پنجابی (بحروف گورمکھی) ہر ایک حصہ الگ الگ بھی مل سکتا ہے ؛

وقت اشاعت و قیمت اشتراک یہ رسالہ بالفعل سال میں چار بار یعنی نومبر، فروری، مئی، اگست[1] میں شایع ہوگا۔ سالانہ چندہ حصہ اردو کے لئے ۱۲ؔ/عہ۔ اورینٹل کالج کے طلبہ سے چندہ داخلے کے وقت وصول ہوگا۔ کسی سہ ماہی کے رسالہ کے نہ پہنچنے کی شکایت رسالہ شایع ہونے کی تاریخ سے ایک ماہ کے اندر دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے۔ ورنہ ایسی شکایت پر غور نہ ہو سکے گا۔ یہ ایک ماہ کی مدت فروری و مئی و ستمبر اور نومبر کے آخر سے شمار کرنی چاہیئے ؛

خط و کتابت و ترسیل زر خریدِ رسالہ کے متعلق خط و کتابت اور ترسیل زر صاحب پرنسپل اورینٹل کالج کے نام ہونی چاہیئے۔ مضامین کے متعلق جملہ مراسلات ایڈیٹر کے نام بھیجنے چاہئیں ؛

محل فروخت یہ رسالہ اورینٹل کالج کے دفتر سے خریدا جا سکتا ہے ؛

قلم تحریر حصہ اردو کی ادارت کے فرائض پرنسپل محمد شفیع ایم۔ اے اورینٹل کالج سے متعلق ہیں اور یہ حصہ ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعانت سے مرتب ہوتا ہے ؛

---

[1] چونکہ اگست میں کالج بند ہوتا ہے۔ اسلئے یہ نمبر مجبوراً جون یا ستمبر میں شایع ہوتا ہے ؛

پنجاب میں اُردو

مثنوی نیرنگِ مملکتِ چین یا قصّۂ دلآرام

حال ہی میں جب میں نے پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطات کا جائزہ لیا - تو اس مجموعے میں مجھے مثنوی نیرنگِ مملکتِ چین یا قصۂ دلآرام کا ایک نامکمل مخطوطہ[1] نظر پڑا - اس مخطوطے کا اور کوئی نسخہ کہیں نہیں ملتا - اور نہ ہی متداول تذکروں میں اس کا ذکر موجود ہے - اس لئے اس مخطوطے کے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکی ہیں - وہ صرف متن سے ہی اخذ کی گئی ہیں - ممکن ہے اس مضمون کے شایع ہونے کے بعد کوئی صاحب مثنوی یا اس کے مصنف کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچا سکیں ۔

متن میں کہیں بھی مثنوی کا عنوان درج نہیں - لیکن نفسِ مضمون کو پیشِ نظر رکھ کر غالباً کسی کتاب فروش نے پہلے ورق پر مثنوی کا عنوان نیرنگِ مملکتِ چین یا قصۂ دلآرام درج کر دیا ہے - اور میرے خیال میں یہ عنوان موزون ہے - اس لئے مَیں نے بھی اسے اِس عنوان سے موسوم کرنا مناسب سمجھا ہے -

ا - مصنّف

قصۂ دلآرام کا مصنف غوث ابنِ عظیم ہے - اور غوث تخلص کرتا ہے -

---

[1] نمبر 1442 د 134 VI ع ll، سائز ۵½" x ۸" ، ۵۰ اوراق [پنجاب یونیورسٹی کے کیٹیلاگر (فہرست ساز) نے صرف ۴۸ اوراق گنے ہیں - دو ورق دوسرے اوراق سے نسبتاً چھوٹا ہونے کی وجہ سے نظر انداز ہو گئے] ، فی صفحہ ۱۳ سطور ۔

(ورق ۴۹ و) باِمدادِ بیچونِ قادر کریم نمودہ رقم غوث ابنِ عظیم
(ورق اب) توکر غوث نعتِ رسولِ خدا

مثنوی سے مصنف کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے۔ کہ وہ قصبۂ میروِوال کے قرب و جوار میں چک علی کا رہنے والا تھا۔ میر و وال ضلع سیالکوٹ (پنجاب) میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ مصنف نہ صرف اپنے بیان کے مطابق پنجابی ہے۔ بلکہ مثنوی کی زبان میں پنجابی کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ جس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے۔ کہ مصنف پنجابی ہے۔ اور اردو کی یہ مثنوی پنجاب میں لکھی گئی ہے۔ مصنف نے ایک صاحب جان محمد سے اکتسابِ علم کیا ہے۔ اور اس کی تعریف میں بالخصوص چند اشعار لکھے ہیں مصنف اپنے اُستاد کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اور میرو وال میں اُسے مرجع خلایق بتاتا ہے لیکن جہاں تک مصنف کے کسب فیض کا تعلق ہے۔ اُس کے متعلق تو یہی کہنا پڑے گا کہ مصنف کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں۔ بہر حال جان محمد سے اپنے تعلق کو یُوں بیان کیا ہے :-

لکھوں آگے اوستاد کی میں ثنا ہوا جو علم میں مرا رہنما
خدا نے دیا فخر اوسکون کمال ہے نورِ علی نور اس کا جمال

. . . .

کہ جانِ محمد اسم ہے عجیب زخوانِ محمد لیا اوس نصیب
ہوا تب کہ وہ قدوۃ السالکین جہان میں ہوا زبدۃ العارفین

. . . .

سبے منبع فیاضی میرو وال مین کہ فیضی رسان ہیں بہر حال مین
مکان دار دایم طرف چک علی کہ علما نہیں بل ولی ہے ولی

. . . .

کیئی جب کرم کی میرے پر نگاہ		مجھے تب علم کا دکھایا یہ راہ

مثنوی سے اس سے زیادہ مصنف کے سوانح حیات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اور نہ ہی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ مثنوی کب تصنیف ہوئی۔ لیکن میرا قیاس ہے کہ یہ مثنوی انیسویں صدی کے قرنِ اوّل یا دوم کی تصنیف ہے۔ مصنف اپنی زبان کو اُردو یا ہندی کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ بلکہ ریختہ کے نام سے پکارتا ہے

(ورق ۱۲۵) کبھی قصہ یوسف زلیخا پڑے		کبھی لیلی مجنون نظر میں دھرے

پڑے غوث کے شعر یا ریختہ		کہ با درد افسوس آمیختہ

۲- وجہ تصنیف

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دہلوی اور دکنی شاعروں کی طرح غوث کو نہ تو کسی دربار میں رسائی ہوئی اور نہ ہی کسی رئیس کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ اس لئے یہ مثنوی کسی بادشاہ یا رئیس کے ایما پر نہیں لکھی گئی۔ بلکہ قصے کو دلچسپ سمجھ کر غوث نے اسے نظم کیا۔ غوث اپنے دوستوں سمیت ایک رات رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ چودھویں کے چاند کی سیماب وش کرنیں خاکدان ارض کو بقعۂ نور بنا رہی تھیں۔ شراب کا دَور چل رہا تھا۔ اور دوست دل بہلانے کے لئے مختلف افسانے سُنا رہے تھے۔ اس مجلس میں چک علی کا ایک میراثی امام بخش بھی موجود تھا۔ اس نے کئی دلپسند داستانیں سنائیں۔ جن میں سے ایک قصۂ دلارام بھی تھا۔ غوث کو یہ کہانی بہت پسند آئی۔ اور اس نے اسے مثنوی کے قالب میں ڈھال دیا۔ میرے سامنے مثنوی کا صرف نامکمل مخطوطہ ہے۔ اس لئے یہ پتہ نہیں چل سکا۔ کہ اس کی یہ مثنوی کہاں تک مقبول ہوئی۔ مصنف نے

تمام واقعہ یوں بیان کیا ہے :-

(ورق ۳ ب و ۴ ا)

عجایب ہی رنگین میری داستان ، سنون کان دہر تم ہے اسکا بیان
جو اک رات بیٹھی تھی سبہ یار گار (غار) ، خوشی مین شگفتہ تھی جیون گل بہار
کہلی چاندنی اور شب چاردہ ، منور کہرا شاہ پروین مہ

. . . .

نشے میں خوشی کے جو سرمست تہی ، ہمہ یار دل خوش جو پیوست تہی
سبہی با دل و جان مسرور ہو ، لگی کہنے کچہہ اور مذکور ہو
کہ تہا ایک مجلس کے بی درمیان ، امام بخش آن نام دارد ز جان
خیر اللہ کا تہا وہ پسر ہوشمند ، کئی داستانان کری دل پسند
ز قوم میراسی تہا در چک علی ، کری سخن شیرین بہر یک بلی
او سیوقت اوس یہہ کہانی کہی ، میری دل میں خواہش زیادہ ہوئی
کہا مین کہانی یہ ہو دلپذیر ، لکہون با قلم گرچہ ہو بی نظیر
بامداد بیچون قادر کریم ، نمودہ رقم غوث ابن عظیم

۳ - افسانہ

زبان کے لحاظ سے مثنوی جس قدر ناقص ہے - پلاٹ کے لحاظ سے اُسی قدر اعلےٰ ہے - اس دَور کی دیگر افسانوی تخلیقات کے علی الرغم مثنوی میں مافوق الفطرت (SUPERNATURAL) عنصر کو بہت کم دخل ہے - ڈراما کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے - کیونکہ مصنّف نے اتفاقی حادثات کے صدور سے مثنوی میں تین معراج (CLIMAXES) پیدا کئے ہیں - ایک حادثے کے

ختم ہونے پر ہر مرتبہ جب ہیرو اور ہیروئن کا وصال ہوتا ہے۔ تو مثنوی پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے۔ کہ اب افسانہ ختم ہوا چاہتا ہے۔ لیکن عین اس وقت مصنف نہایت چابکدستی سے ایک اور حادثے کو وجود میں لاتا ہے۔ اور اس فجائی (Dramatic) ارتقا سے قاری کے دل میں افسانے کے اختتام کے لئے انتظار آمیز دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مخطوطے کے نامکمل ہونے کی وجہ سے یہ تو پتہ نہیں چل سکا۔ کہ درحقیقت افسانہ کتنا طویل تھا۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ نامکمل مخطوطے میں جو تیسرا معراج (CLIMAX) ہے۔ وہ مثنوی کے اختتام سے بالکل قریب ہے اور غالباً مثنوی کے صرف چند آخری اوراق گم ہیں۔ افسانہ سننے کے بعد غالباً قارئین بھی اسی نتیجہ پر پہنچیں گے ؛

اگلے زمانے میں "چین ماچین" میں ایک سخی اور عادل بادشاہ فغفور شاہ نامی حکومت کرتا تھا۔ یہ بادشاہ دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا اور سرزمین عالم کے دیگر حکمران اس کے باجگذار تھے۔ اس کے پاس لاکھوں کی تعداد میں فوج تھی۔ اور فوج کا ہر سپاہی رستم، بہمن اور افراسیاب کا ہم پلّہ تھا۔ شہنشاہ عالم ہونے کی وجہ سے دَولت کی اس قدر فراوانی تھی۔ کہ اُس کے ملک میں کوئی فقیر اور بھک منگا نہ تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود شہنشاہ رات دن ملول رہتا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ اور اُسے یہ غم کھائے جا رہا تھا۔ کہ اُس کے مرجانے کے بعد دُنیا میں اس کا نام باقی رکھنے والا کوئی نہ رہے گا۔ آخرکار وہ سب کام کاج چھوڑ کر حجرہ نشین ہوگیا۔ اور تسبیح و وظائف میں وقت گزارنے لگا چند دن گذرنے کے بعد اُمرا اور وزراء کو یہ فکر دامنگیر ہوئی۔ کہ اگر بادشاہ کا چندے یہی وتیرہ رہا تو اغلب ہے کہ کوئی دشمن ملک پر حملہ کر کے اس سے ملک چھین لے گا۔ لہذا جس طرح بھی ہو بادشاہ کو حجرے سے نکال کر تخت پر بٹھایا چاہیئے

اراکینِ سلطنت نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ شکار کی ترغیب دِلا کر بادشاہ کو حجرے
سے باہر نکالا جائے۔ یہ فیصلہ کر کے اُمرا اور وزرا بادشاہ کے پاس گئے اور اُس
سے عرض کی کہ اُن کو شکار کھیلے بہت دن ہو گئے تھے۔ اگر شہنشاہ صَید گاہ
میں تشریف لے چلیں تو اُن کو شکار کھیلنے کا موقعہ مِلے گا۔ فغفور شاہ نے پہلے
تو یہ درخواست مسترد کر دی اور اُن سے کہہ دیا کہ اُسے تو اولاد نہ ہونے کا غم کھائے
جا رہا ہے۔ اور وہ سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینے کے لئے تیار نہیں۔ اس
پر اراکینِ سلطنت نے بادشاہ سے کہا کہ اُس کے تخت نشین نہ ہونے سے ملک
میں اندھیر مچ رہا ہے۔ اور رعایا گوناگوں تکلیفات میں مبتلا ہو رہی ہے۔ اِن
حالات میں وُہ کیسے توقع کر سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ اس کی مُراد بر لائے گا۔ اُس
کی دعاؤں کے لئے درِ اجابت صرف اسی صورت میں وا ہو سکتا ہے۔ کہ وہ
سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لے کر عدل اور انصاف کرے۔ اس نفسیاتی
درخواست نے بادشاہ کے دِل پر اثر کیا اور وہ حجُرہ ترک کرنے پر آمادہ ہو گیا پہلے
سوچے ہوئے پروگرام کے مطابق بادشاہ کو صید گاہ میں لے جایا گیا۔ عمائدِ سلطنت
شکار کھیلنے میں مصروف ہو گئے لیکن بادشاہ اپنے غم کو سینے سے لگائے ہوئے
پریشان پھرتا رہا۔ اتنے میں وہاں ایک روشن ضمیر درویش آ نِکلا۔ بادشاہ
درویش کی صورت دیکھ کر ہی اُس کا گرویدہ ہو گیا۔ اور اس نے اپنے گھوڑے
سے اُتر کر اس کی تعظیم کی۔ اس کے بعد اسے اپنا دردِ دل سنایا۔ خضر صُورت
درویش نے بادشاہ کی ڈھارس بندھائی۔ اور اُسے ایک سیب دیا اور کہا کہ وہ
یہ سیب اپنی کسی بیوی کو کھلا دے۔ اس کے ہاں خدا کے فضل سے ایک لڑکا
پیدا ہو گا۔ درویش نے یہ بھی ہدایت کی۔ کہ لڑکے کا نام دلشوق رکھا جائے۔
بادشاہ سیب لے کر فوراً محل کو لوٹا۔ اور گھر پہنچ کر اس نے اپنی چہیتی

بیوی کو سیب کھلا دیا۔ اسی رات اس بیوی کو حمل ہوگیا اور معین وقت گذرنے کے بعد بادشاہ کے ہاں ایک نہایت خوبصورت لڑکا پیدا ہؤا۔ درویش کی ہدایت کے مطابق شہزادے کا نام دلشوق رکھا گیا اور شہزادے کی ولادت کا جشن نہایت دھوم دھام سے منایا گیا۔ پانچ سال کی عمر میں شہزادے کو مکتب میں تحصیل علم کے لئے بھیجا گیا۔ اور اس نے دیگر دنیاوی علوم میں اپنی شان کے مطابق خوشدل وزیر سے تربیت پائی۔ یہ وزیر اس کا نگران ہونے کے علاوہ اس کا رفیق بھی تھا۔ جب شہزادہ بڑا ہوگیا تو خوشدل وزیر کے ایما پر اُس کے لئے ایک محل اور باغ تیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اقصائے عالم سے بہترین معمار اس کام کے لئے منتخب کئے گئے اور خوشدل اور دلشوق کی نگرانی میں بستان سرا تیار ہونے لگی محل اور باغ کو ہر ممکن طریقے سے آراستہ کیا گیا۔ جب باغ اور محل کی ہر ایک چیز مکمل ہوگئی تو شہزادے نے معماروں کو انعام واکرام سے مالامال کرکے رُخصت کیا اور خود باغ کی سیر کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

باغ میں داخل ہونے کے لئے نیک ساعت معلوم کرنا ضروری تھا چنانچہ اس امر کے لئے ایک نجومی طلب کیا گیا۔ نجومی نے شہزادے کو مشورہ دیا۔ کہ وہ اسی وقت باغ کی سیر کے لئے چلا جائے کیونکہ اُس وقت کی سیر سے وُہ دو چیزوں سے لطف اندوز ہوسکیگا۔ ایک تو باغ کی سیر ہوگی اور دوسرے ایک پری سے ملاقات ہوگی لیکن نجومی نے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ دوران سیر میں شہزادے کو اپنا دل قوی رکھنا ہوگا اور ہوشیار رہنا ہوگا۔ اگر اس سے کمزوری کا اظہار ہؤا یا کسی وجہ سے اس پر بے خبری کی حالت طاری ہوئی تو "آسمان کی گردش" اس پر بہت بُرا اثر کرے گی۔ پری کا نام سُنتے ہی شہزادہ بے تاب ہوکر باغ کی طرف بڑھا اور خلوت سے محظوظ ہونے کے لئے اُس نے اپنے دوست وزیر اور چوبداروں کو دروازے

پر بٹھا دیا کہ وہ کسی شخص کو باغ میں نہ آنے دیں۔

شہزادہ کچھ دیر تک باغ میں سیر کرتا رہا۔ باغ میں ہزاروں قسم کے سایہ دار اور پھلدار درخت تھے اور رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ حوضوں میں فوارے چھوٹ رہے تھے۔ فاختائیں اور قمریاں غزل خوانی کر رہی تھیں۔ سرو و شمشاد نے جھک کر تعظیم کی۔ گلاب و یاسمن نے بڑھ کر قدم لئے۔ ہر سو جنت نگاہ اور ہر جانب فردوس گوش کا منظر تھا۔ شہزادہ باغ میں سے گھومتا ہُوا محل میں داخل ہو گیا۔ بارہ دری میں جڑاؤ پلنگ رکھا ہُوا تھا۔ شہزادہ دم لینے کے لئے اس پلنگ پر بیٹھ گیا۔ عین اس وقت پریوں کی ایک سردار ایک ہزار پری کے ساتھ اُڑتی ہوئی اس طرف آ نکلی۔ اور دلشوق کا خوبصورت باغ دیکھ کر باغ میں اُتر پڑی۔ پریاں باغ میں سے گھومتی ہوئی جب محل کی طرف بڑھیں تو اُن کا سایہ پڑتے ہی دلشوق بیہوش ہو گیا۔ اور پلنگ پر گر پڑا۔ پریاں محل میں داخل ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ایک نہایت حسین نوجوان پلنگ پر محوِ خواب ہے۔ جس کا حُسن آفتاب و ماہتاب کو شرمندہ کر رہا ہے۔ ہر ایک پری کی یہ رائے تھی کہ دلشوق اُن سب سے زیادہ حسین ہے۔

دلشوق کے حُسن سے محظوظ ہونے کے بعد سردار پری نے اپنی ماتحت پریوں کو حکم دیا۔ کہ وہ اُسی وقت جا کر کسی بادشاہ کی خوش شکل بیٹی کو وہاں اُٹھا لائیں۔ سردار کا حکم سُن کر ایک پری نے بصد تعظیم اپنی سردار سے کہا کہ "خطا و ختن" کی ولایت کے بادشاہ طیمور شاہ کی بیٹی دلآرام چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہے اور حُسن میں اپنا نظیر نہیں رکھتی اگر حکم ہو تو اُس کو یہاں اُٹھا لایا جائے۔ سردار نے جواب دیا۔ کہ دلآرام کو اُسی وقت وہاں لایا جائے۔ آنکھ جھپکنے میں پریاں دلآرام کا پلنگ اُس باغ میں اُٹھا لائیں اور دلشوق کے پلنگ کے پاس اُس کا پلنگ بچھا کر خود رخصت ہو گئیں

پریوں کا سایہ ہٹنے سے شہزادے کے کچھ ہوش بجا ہوئے تو وہ بیدار ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک حسین لڑکی اس کے ساتھ والے پلنگ پر سو رہی ہے۔ کچھ دیر تک فرطِ حیرت سے اپنی آنکھیں ملتا رہا لیکن دلآرام کے حُسن خوابیدہ نے بیک نظر دلشوق کے متاعِ صبر و شکیب کو نذر غارت کر دیا اور وہ بیتاب ہو کر اُس کے پلنگ پر کود پڑا۔ دلآرام ناگہاں بیدار ہوئی تو غیر محرم کو اپنے پلنگ پر دیکھ کر بیکل ہو گئی، اور غم و غصّہ کے جذبات اُس کے دل میں موجزن ہو گئے۔ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اُس نے نہایت درشتی سے شہزادے کو مخاطب کر کے کہا:-

"تمہارا یہ فعل نہایت غیر شریفانہ ہے کہ تم بیگانی بہو بیٹی کو اپنا سینہ ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنے سحر سے یہاں اٹھا لائے ہو لیکن ہرگز ہرگز مجھے ہاتھ نہ لگانا ورنہ تمہاری حرکات کا میں تمہیں پورا پورا مزہ چکھاؤنگی۔ افسوس کہ اس وقت میرے پاس چھری نہیں ورنہ میں تیرے پیٹ میں گھونپ دیتی یا اپنے آپ کو مار لیتی"

شہزادے نے نہایت لجاجت آمیز انداز میں جواب دیا "اے پری مجھے خدا کی قسم میں سحر یا جادوگری نہیں جانتا۔ مجھے تیرے سر کی قسم مجھے تو تمہارے آنے کی بھی خبر نہیں۔ میں تو یہاں تنہا سویا ہوا تھا اور اب بیدار ہوا ہوں تو تمہارا پلنگ یہاں دیکھا ہے۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ آج تمہیں دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ مجھ سے خفا نہ ہو اور ذرا ہنس کے بولو کیونکہ ہم صرف اتفاقی طور پر ملے ہیں"

دلآرام نے کہا "میں تم سے کیا بولوں۔ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں کہ تم کون ہو"

دلشوق نے جواب دیا "تو میں تعارف کرائے دیتا ہوں۔ میرا نام دلشوق ہے اور میں فغفور شاہ کا بیٹا ہوں"

یہ سُن کر شہزادی کو تسکین ہوئی اور اُس نے دلشوق کو اپنا نام بتایا۔ دلآرام

صرف اپنا نام ہی بتا چکی تھی کہ شاہ پری کا پھر اُس طرف گذر ہوا۔ پریوں کا سایہ پڑتے ہی دلآرام اور دلشوق ایک دفعہ پھر بے خبر ہو گئے۔ شہ پری نے نیچے اتر کر دیکھا تو حیران ہوئی کہ دلشوق اور دلآرام ایک دوسرے سے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے اور پھر دفعتہً اُسے اپنی حرکت پر ندامت محسوس ہوئی کہ اُس نے ایک دوشیزہ کو نامحرم مرد کے پاس لا کر رکھ دیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے پریوں کو حکم دیا کہ وہ دلآرام کا پلنگ اُٹھا کر اُس کے گھر پہنچا آئیں۔

دلآرام اور پریوں کے جانے کے بعد جب دلشوق کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ دلآرام وہاں سے غائب ہے۔ دلآرام کو وہاں نہ پا کر اُسے بہت صدمہ ہوا اور وہ باغ میں چاروں طرف دیوانہ وار پھرنے لگا۔ کبھی درختوں سے باتیں کرتا۔ کبھی پرندوں سے مخاطب ہوتا اور ہر ایک سے دلآرام کا پتہ پوچھتا۔ لیکن دلآرام کہیں ہوتی تو ملتی۔

جب شہزادے کو باغ میں گئے کافی دیر ہو گئی تو اُس کا رفیق خوشدل وزیر دروازے پر بیٹھا بیٹھا بے چین ہو گیا۔ چنانچہ وہ چوبداروں سے تکرار کر کے باغ میں چلا آیا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب وہ شہزادے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ سر و پا برہنہ دلآرام کے عشق میں تباہ حال ہو رہا ہے اور اُسی کا نام وردِ زبان ہے۔ خوشدل کے اصرار پر دلشوق نے اُسے دلآرام سے ملاقات کا سارا قصہ کہہ سنایا۔ اور پھر دونو باغ سے باہر نکل آئے۔ خوشدل نے وعدہ کیا کہ جس طرح بھی ہو وہ دلآرام کو ڈھونڈھ نکالے گا۔ گھر آنے پر دونو دوستوں نے سارا ماجرا بادشاہ کو سنایا اور پھر سپاہ و لشکر کے ساتھ دونو دوست دلآرام کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

دلشوق اور خوشدل خدم و حشم کے ساتھ ساتھ ملک بملک پھرنے لگے فیغفور شاہ دنیا کا سب سے بڑا تاجدار تھا۔ جب دوسرے بادشاہوں کو اس کے بیٹے کی آمد کی

خبر ہوتی تو وہ نذر و نیاز لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نہایت تپاک سے اس کا استقبال کرتے۔ دلشوق اور خوشدل دن کو تو شاہانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے لیکن شام ہوتے ہی فقیروں کا لباس پہن لیتے اور کوچہ بکوچہ ہر ایک شہر میں دلآرام کی تلاش کرتے۔ شہزادے کا یہ قافلہ چلتا ہوا ایک عرصے کے بعد "خطا و ختن" میں جا پہنچا اس ملک کے بادشاہ طیمور شاہ نے جب دلشوق کی آمد آمد کی خبر سُنی تو دوسرے بادشاہوں کی طرح وہ بھی تحایف لے کر اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور دلشوق نے تحایف قبول کرنے کے بعد اسے اعزاز و اکرام سے رُخصت کیا۔

دن گذرنے کے بعد شام آئی تو دلشوق اور خوشدل حسبِ معمول فقیروں کا لباس بدل کر چل کھڑے ہوئے۔ شہر میں ہر دروازے پر صدا کرتے اور بھیک مانگتے۔ کئی دنوں کی مصیبت جھیلنے کے بعد دلشوق غم اور تکان سے نڈھال ہو رہا تھا جب دلآرام کے محل تلے اُس کا گذر ہُوا تو ناگہاں اُس کے منہ سے نکلا:۔

(ورق ۲۸ ب) یا رزاق فتاح قادر وہاب ہماری تو قسمت کا یکشا باب

دلآرام کہیں قریب تھی اُس نے یہ آواز سُنی تو فوراً پہچان گئی کہ ہو نہ ہو یہ دلشوق کی آواز ہے۔ حیرانی اور تذبذب کے جذبات اُس کے دل میں موجزن ہوئے۔ کہ اگر فقیر دلشوق شہزادہ ہے تو اُسے بھیک مانگنے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ اور اگر فقیر دلشوق نہیں تو اُس کی آواز دلشوق جیسی کیوں ہے! بہر حال دیکھنا چاہیئے کہ فقیر کون ہے۔ چنانچہ اُس نے ایک لونڈی سے کہا کہ وہ فقیروں کو محل میں بُلا لائے۔ لونڈی کے اصرار پر دلشوق خوشدل کو باہر چھوڑ کر تنہا محل میں لونڈی کے ساتھ چلا گیا۔ دلشوق نے دیکھتے ہی دلآرام کو پہچان لیا اور دوڑ کر اُس سے لپٹ گیا۔ دلآرام نے تجاہل سے کام لے کر برہمی کا اظہار کیا۔ لیکن فراق زدہ دلشوق کے بے انتہا جذبۂ وصال کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی اور راز و نیاز کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ دلشوق

دلآرام کے باپ سے اُس کے رشتے کے لئے درخواست کرے۔ دُوسرے دن اس کام کے لئے دلشوق نے خوشدل وزیر کو طیمور شاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ چنانچہ چند معمولی رکاوٹوں اور رسموں کے بعد دلشوق اور دلآرام کی شادی ہوگئی اور دونو ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

جب شادی کو کچھ دن گذر گئے تو دلشوق کے دل میں والدین کی یاد چٹکیاں لینے لگی اور وہ تکرار و اصرار کے بعد دلآرام کو ساتھ لے کر طیمور شاہ سے رُخصت ہُوا۔ راستے میں دلشوق کو کئی شہروں میں قیام کرنا پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسے شہر میں پہنچے جہاں گھوڑوں کا ایک بڑا تاجر بھی قیام پذیر تھا۔ "خوخطا وختن" کا رہنے والا تھا۔ شہر میں دلشوق کے آنے کا چرچا ہُوا تو سوداگر اُسے دیکھنے کی غرض سے اُس کی قیامگاہ کی طرف سے گذرا دلشوق تو وہاں موجود نہ تھا لیکن اتفاق سے دلآرام پر سوداگر کی نظر پڑ گئی۔ جسے دیکھتے ہی وہ اس پر دل وجان سے عاشق ہوگیا۔ تجسس کرنے پر جب سوداگر کو معلوم ہُوا کہ دلآرام کی شادی دلشوق سے ہوچکی ہے تو اُس کے پاس اِس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ کسی جادوگر کی مدد سے دلآرام کو اپنے قبضے میں لے آئے۔ چنانچہ وہ ایک جادوگر کے پاس پہنچا جس نے اُسے چار نقش لکھ کر دیئے اور کہا کہ جنگل میں جاکر وہ ایک چار رُخ کے دیئے میں اُن نقوش کو جلائے اور نتیجے کا انتظار کرے۔

سوداگر نے جادوگر کی ہدایت کے مطابق رات کو جنگل میں جاکر دیا جلایا۔ جب نقوش کو آگ لگی تو معاً چار شخص وہاں آموجود ہوئے اور اُنھوں نے سوداگر سے کہا کہ وُہ اس کی ہر خدمت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ سوداگر نے انہیں حکم دیا کہ وہ دلآرام کو اُس کے پاس اُٹھا لائیں۔ حکم سنتے ہی چاروں شخص ہوا میں بلند ہوئے اور آن کی آن میں سوئی ہوئی دلآرام کو وہ سوداگر کے پاس اُٹھا لائے۔ لیکن دیئے کے ختم ہونے کے ساتھ ہی چاروں شخص گم ہوگئے سوداگر اسی وقت دلآرام کو لے کر چل پڑا۔ جب دلآرام کی آنکھ کھُلی تو اُس نے اپنے آپ

کو محبوس پایا۔ بہتیرا شور و غل مچایا لیکن کیا ہو سکتا تھا۔

اب سوداگر کا تقاضا تھا کہ دلآرام اس سے شادی کرے اور وُہ میاں بیوی کی طرح رہنے لگیں۔ دلآرام نے جب رہائی کی کوئی صورت نہ دیکھی تو وہ شادی کرنے پر رضامند ہو گئی۔ لیکن اُس نے سوداگر سے کہا کہ اُن کے ہاں رسم ہے کہ شادی سے ایک سال قبل میاں بیوی کو ایک محل تیار کرا کے دیتا ہے جس میں غُربا کے لئے لنگر جاری کیا جاتا ہے۔ ایک برس تک یہ لنگر جاری رہتا ہے اور اس کے بعد میاں بیوی آپس میں ملتے ہیں سوداگر نے یہ شرط فوراً مان لی اور رسم پوراکرنے کی خاطر اُس نے دلآرام کے لئے ایک محل تیار کرایا اور لنگر جاری کر دیا۔ دلآرام محل میں رہنے لگی اور شہر میں منادی کرادی کہ تمام غریب مسافر اور گداگر اُس کے لنگر سے آ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ دُور دُور سے آنے والے مسافر اس لنگر پر آ کر ٹھہرتے اور دلآرام اُن سے دلشوق کا پتہ پوچھتی لیکن کوئی اس کا پتہ نہ بتا سکتا اسی طرح بارہ مہینے گذر گئے۔

اُدھر جب دلشوق بیدار ہوا تو اُس نے دلآرام کو اپنے پہلو میں نہ پایا حیران تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ اِدھر اُدھر تلاش سے جب کچھ پتہ نہ چلا تو قافلے کو چھوڑ کر تن تنہا دلآرام کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

(اوتق الم) کرے گریہ زاری کہے ہائے اب دلآرام مجھ پر گئی کر غضب
وہ لب خشک پھرتا تھا تشنہ دہن لگن کی اگن سے جلا تن بدن

اسی طرح دلشوق بارہ مہینے پھرتا رہا۔ آخر کار ایک دن اُس سے کسی مسافر نے کہا کہ فلاں فلاں شہر میں دلآرام کا لنگر جاری ہے جہاں مُسافر جا کر ٹھہرتے ہیں۔ اور دلآرام اُن سے کسی کی خبر پوچھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گُم گشتہ محبوب کی منتظر ہے یہ سُن کر دلشوق نے اُس شہر کا رُخ کیا اور محل میں عاشق و محبوب ایک دوسرے کے گلے مل کر خوب روئے۔ جب رو دھو چکے اور اپنا اپنا افسانہ غم ایک دوسرے کو سُنا

چکے تو دلآرام نے دلشوق کو کچھ زر نقد دیا کہ وہ شہر میں جا کر اُس روپے سے نہایت تیز گام اور مضبوط گھوڑا خریدے۔ اور یہ طے پایا کہ نصف شب کے قریب دلشوق گھوڑے کو لے کر محل کی دیوار کے نیچے آجائے جہاں سے وہ دونو فرار ہو جائیں گے۔

دلشوق نے شہر سے جا کر ایک نہایت عمدہ گھوڑا خریدا اور اُس کی زین وغیرہ کس کر سرِ شام ہی محل کی دیوار کے ساتھ آبیٹھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ اونگھ گیا اور پھر سو گیا جب رات ہوگئی تو اُس کی شومئے قسمت سے ایک چور اس طرف آنکلا۔ اُس نے دیکھا کہ گھوڑے کا مالک سو رہا ہے۔ اور گھوڑا آسانی سے چرایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے گھوڑا وہاں سے کھول لیا لیکن جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر چلنے لگا تو پیچھے سے کسی عورت نے اُسے پکارا اور کہا کہ مجھے کیوں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ چور نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے گھوڑے کی باگیں موڑ دیں۔ تاریکی میں دلآرام محل سے نکل کر اُسی گھوڑے پر چور کے پیچھے سوار ہوگئی۔ جب کچھ دُور نکل گئے تو دلآرام نے چور کو دلشوق سمجھ کر اُس سے گفتگو کرنی چاہی لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔ دلآرام کے اصرار پر جب چور بولا تو دلآرام کی جان ہی نکل گئی۔ اور وہ بصد عجز و نیاز بارگاہِ الٰہی میں دُعا کرنے لگی۔

(ورق ۴۳ب) لگی کہنے وہ اے غفور الرحیم | اے بیچوں حافظا اے داور قدیم
کہ دلشوق کو مجھ سے کر کے جدا | عوض اس کا یہ چور مجھ کو دیا
ازل سے تھی میری یہی سرنوشت | کہیں کے کٹھن میں رہوں دلشکست
مجی اس بلا سیں رہائی تو دہ | کہ اس بد گہر سے جدائی تو دہ

دلآرام کی دُعا کچھ اس پُرسوز دل سے نکلی کہ بارگاہِ عالی میں اُسے فوراً شرفِ قبولیت حاصل ہوگیا اور معاً اُسے ایک تدبیر سوجھی۔ ان کا گذر ایک جنگل سے ہو رہا تھا کہ دلآرام نے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی اور یہ ظاہر کیا کہ پیاس سے اُس کی جان نکل رہی تھی چور نے گھبرا کر ادھر اُدھر پانی کی تلاش کی لیکن پانی کہیں نظر نہ پڑا۔ بالآخر اُن کا گذر

ایک پُرانے کنوئیں کے پاس ہوا جو مار و کژدم سے پُر تھا، اور نہایت عمیق اور تاریک تھا۔ اس کنوئیں کے پاس دونو گھوڑے سے اتر پڑے اور شہزادی کی تجویز کے مطابق چور نے اپنی پگڑی سے درختوں کے پتوں کا دُونا بنا کر کنوئیں میں پانی نکالنے کے لئے لٹکایا۔ دونا پانی سے کچھ اوپر رہا تو چور سر کو آگے کر کے ذرا کنوئیں میں جھکا تاکہ دُونا پانی تک پہنچ جائے۔ شہزادی نے موقعہ غنیمت دیکھ کر چور کو پیچھے سے اس زور سے لات ماری کہ وہ سیدھا کنوئیں کی تہ تک پہنچ گیا اور شہزادی کو چور سے نجات مل گئی۔

شہزادی نے بارینعالی کا شکر ادا کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل کھڑی ہوئی۔ ابھی تھوڑی دُور پہنچی تھی کہ اُسے سامنے سے دو سوار آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ دونو سوار شکار کھیلتے ہوئے آرہے تھے۔ اُن میں سے ایک اُس ملک کا شہزادہ تھا اور ایک وزیر تھا۔ ان دونو نے جب دُور سے دلآرام کو گھوڑے پر سوار دیکھا تو اُس کو پہچاننے کے بغیر آپس میں طے کر لیا کہ گھوڑے کا مالک شہزادہ ہوگا اور سوار کا مالک وزیر ہوگا لیکن جب دلآرام کے پاس پہنچے تو اُس کا بے مثال حُسن دیکھ کر شہزادے کی نیت بدل گئی اور اس نے چاہا کہ وہ گھوڑے کی بجائے دلآرام کو اپنے قبضے میں لے لے۔ اس پر دونو میں تکرار ہونے لگی۔ دلآرام نے جب یہ ماجرا سُنا تو اُس نے دونو کو کہا کہ وہ اپنے گھوڑوں سے نیچے اُتر آئیں اور وُہ اُن کے جھگڑے کا فیصلہ کر دے گی جب شہزادہ اور وزیر گھوڑوں سے اُترے تو شہزادی نے اُن سے کہا کہ وہ اپنے سارے ہتھیار اُتار دیں۔ پھر ایک کمان سے مختلف سمتوں میں دو تیر چلائے اور اُن دونو سے کہا کہ وہ تیر تلاش کر کے لائیں۔ جو آدمی تیر پہلے لے کر پہنچیگا وہ اُس کی ہو جائیگی شہزادے اور وزیر کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور وہ تیروں کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ جب وہ کچھ دُور نکل گئے تو شہزادی نے اُن کی تلوار سے ان کے دونو گھوڑوں کے سر کاٹ

دیئے۔ اور آپ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے چل نکلی۔ گذشتہ تلخ تجربے سے فائدہ اٹھا کر شہزادی نے مردوں کا لباس پہن لیا اور ہتھیار بھی باندھ لئے۔

دلآرام چلتی چلتی ایک شہر میں داخل ہوئی اور وہاں کچھ دن قیام کرنے کے لئے ٹھہر گئی۔ اس ولایت کے بادشاہ کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی۔ جس نے ایک دن دلآرام کو اپنے محل کے نیچے گذرتے دیکھا۔ تو وہ اُس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اُس نے سمجھا کہ اُس کے شہر میں پھرنے والا اجنبی کوئی حسین سوداگر یا شہزادہ ہے۔ اُس نے اپنی لونڈی کو اُس کے پیچھے بھیجا کہ وہ اس کے حالات دریافت کرے۔ دلآرام نے لونڈی کے استفسار کے جواب میں اس سے کہہ دیا کہ وہ "خطا و ختن" کا شہزادہ ہے یہ خبر سن کر اُس ملک کی شہزادی روشن جمال نے اپنے والدین کو مجبور کیا کہ وہ دلآرام سے اس کی شادی کر دیں۔ بادشاہ اور دلآرام نے شادی کو ملتوی کرنے کی بہت کوشش کی لیکن روشن جمال نے ایک نہ مانی اور دونو شہزادیوں کی شادی ہو گئی۔ پہلی رات جب روشن جمال اور دلآرام میاں بیوی کی حیثیت سے خلوت میں ملے اور ایک پلنگ پر لیٹے تو دلآرام نے اپنی تلوار کھینچ کر اپنے اور روشن جمال کے درمیان رکھ دی۔ روشن جمال نے حیران ہو کر اِس کا سبب پوچھا تو دلآرام نے جواب دیا کہ اُن کے ہاں یہ رسم ہے کہ جب وہ کسی جگہ جا کر بیاہ کرتے ہیں تو وہ ایک سال تک اپنی بیوی کے قریب نہیں جاتے روشن جمال یہ جواب سن کر بہت مایوس ہوئی لیکن خاموش رہنے کے سوا کیا چارہ تھا

اُدھر جب دلشوق بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ اُس کا گھوڑا اور دلآرام دونو غائب ہیں۔ اپنا سر پیٹتا ہوا وہ پھر دلآرام کی تلاش میں چل نکلا اور پھرتے پھراتے اُسی شہر میں آ پہنچا جہاں دلآرام مقیم تھی۔ ایک دن دلآرام بازار کی سیر کر رہی تھی کہ اس نے دلشوق کو دیکھ پایا۔ اور اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا۔ کہ وہ دلشوق کو محل میں لے جائے۔ دلشوق نے دیوانوں کی طرح دلآرام کے نام کی رٹ لگا رکھی تھی۔ شہزادی نے ہنس کر

دلشوق سے پوچھا :-

(ورق ۵۰ ب) تو آیا کہاں سے ہے اے نوجوان ۔ دلآرام ہے کون رہتی کہاں

اس کے جواب میں دلشوق کے مُنہ سے صرف یہی نکلا :-

(ورق ۵۰ ب) ۵ دلآرام ہا ئے دلارام ہا ئے

. . . .

یہاں پر نامکمل مخطوط ختم ہو جاتا ہے ۔ اور گمان غالب ہے کہ اس ملاقات کے بعد دلآرام اور دلشوق میں فراق نہیں ہوا لیکن روشن جمال کا کیا حشر ہوا اس کے متعلق قارئین صرف قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں ۔

۴ ۔ متن

کتابت | مثنوی کی کتابت بہت حد تک ناقص ہے ۔ کاتب سے جا بجا املا کے اغلاط سرزد ہوئے ہیں ۔ مندرجہ ذیل الفاظ

نذر و نیاز ۔ مغموم ۔ نکاح ۔ مقام ۔ یار غار ۔ بلطف و تلطف ۔ مہمیز ۔ تماشہ ۔ قلندر

بالترتیب مثنوی میں یوں لکھے گئے ہیں :

نظر و نیاز ۔ مخموم ۔ نکاہ ۔ مکام ۔ یادگار ۔ بلطف و تلفت ہمیز

(ورق ۲۴ و) (۲۵ و) (۳۲ و) (۳۵ و) (۳ ب) (۴ و) (۷ ب)

تاماشہ ۔ کلندر

(۷ ب) (۸ و)

کسرۂ اضافت | کاتب نے متن میں کسرۂ اضافت استعمال کرنے کے علاوہ جا بجا غلطی یا کسی اور وجہ سے کسرہ (ـِ) کی بجائے یا (ی) کا استعمال کیا ہے ۔ دیگر مخطوطات میں یہ چیز کہیں نظر نہیں پڑی ۔ ملاحظہ ہو :-

(ورق ۳۵ و) اے بادی صبا اب توجا کرو ہیں — شہزادے کو میری یہ حالت کہیں

(ورق ۳۵ ب) مجھے یاد کرتا وُہ ہے یا نہیں — دمی دوستی بھرتا ہے یا نہیں

(ورق ۲ و) مبادا کوئی دشمنی سست بخت — کرے قصد اور مُلک گیر د بدست

ان اشعار میں "بادِ صبا"، "دمِ دوستی"، اور "دشمن سست بخت" کی بجائے بادی صبا، دمی دوستی اور دشمنی سست بخت لکھا گیا ہے۔

یای زاید: اس عہد کے دیگر شاعروں کی طرح غوثؔ نے چند الفاظ کے پیچھے کثرت سے یای زاید کا استعمال کیا ہے۔ مثنوی کے پنجاب میں منظوم ہونے کی یہ بھی ایک دلیل ہے کیونکہ پنجابی میں یہ قاعدہ کثرت سے مروج ہے۔ مثلاً غوثؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں زور، شتاب، فلاں، حیات، اور عرض کی بجائے بالترتیب زوری، شتابی۔ فلانی۔ حیاتی اور عرضی کو نظم کیا ہے:۔

(ورق ۱۳ ب) وگرنہ زبردست دلشوق شاہ — وہ زوری سین اپنا کرے گا بیاہ

(ورق ۲۶ ب) یہ کرلو شتابی میرا کام ہے — فلانی جگہ جو دلآرام ہے

(ورق ۲۸ ب) حیاتی کی مجھ کو اُمید ہی نہیں — میں مرنی اوپر دل ٹھرایا و لی

(ورق ۷ و) نہ غم کھاؤ اتنا نہ گھبراؤ تم — غریبوں کی عرضی بجا لیاو تم

فارسی کا عجیب امتزاج: جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے غوثؔ اپنے اشعار کی زبان کو ریختہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ چنانچہ اس مثنوی میں اس نے فارسی کے الفاظ کے کسی ممکن استعمال سے دریغ نہیں کیا۔ در، از، اور ب کے حروف تو کثرت سے بلاتکلف استعمال کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

(ورق ۱۵ ب) وے دند روشن بتن سیم ہے

(ورق ۱۹ ب) ہیں پیدا ہُوا یا کہ درخواب ہوں

(ورق ۲۱ ب) دیا پہاڑ پل ہیں کہ از تن لباس

(ورق ۳۴ ب) مجھے جانا بہتر بخدمت پدر
(ورق ۲۱ ل) کہ در پیرہن وہ سمایا نہ تھا

فارسی کے افعال بھی کہیں کہیں نظم کر لئے ہیں

(ورق ۲۸ ب) یا رزاق فتاح قادر وہاب ہماری تو قسمت کا بکث و باب
(ورق ۳۰ ب) یہی سخن سن کر پڑا در فکر تخیر ہیں افتادوے سر بسر
(ورق ۳۹ ب) نگہبان حافظ میرا ہو کریم بہر وقت جو ہیم از حق پناہ

فارسی ضمیر متصل | فارسی ضمائر متصل کا غوثی نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کرونگا

(ورق ۱۵ ب ل) دو چشماں صوادش دہن میم ہے
(ورق ۲۴ ب) دلم در جدائی جو مخمور ہے
(ورق ۴ ل) کہو راوی نامش ہے فغفور شاہ
(ورق ۵ ب) ندانم میری میں چہ تقصیر ہے

پنجابی اثرات | جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے مثنوی زبان کے لحاظ سے بہت ناقص ہے لیکن غالباً اس لحاظ سے مثنوی کو ضرور اہمیت حاصل ہے کہ یہ پنجاب میں اردو کے اس دور کی تصنیف ہے۔ جس دور کی بہت کم تصنیفات ابھی تک دریافت ہو سکی ہیں۔ اور جو تصنیفات دریافت بھی ہوئی ہیں ان میں شاید ہی پنجابی کے اتنے اثرات موجود ہوں جو ہمیں اس مثنوی میں نظر آتے ہیں پنجابی کے الفاظ تو اس کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں کہ ان کی فہرست مرتب کرنا بھی بہت طویل کام ہوگا تاہم چند منتخب الفاظ قارئین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں

پنجابی الفاظ

(ورق ۲۲ ل) باہمن (برہمن)۔ (ورق ۱۸ ل) نسنگ (جھجک کے بغیر) (۱۷ ل)

ستابی (جلدی)۔ (۱۳ب) بطک (بطخ)۔ (۱۸ب) اگارے (آگے) (۲۱ب) دارو (بمعنی شراب)۔ (۲۲ب) وردی (غمخوار)۔ (۲۵و) گل (گلا)۔ (۲۷ب) زہیر (مضمحل)۔ (۳۲ب) پتاکا (پتا خہ)۔ (۳۸و) سڑنا (جلنا)۔ (۳۸ب) پنجویں (پانچویں)۔ (۳۹ب) بے (بچے)۔ (۴۲و) لت (لات)۔ (۵ب) جلبل ہوا (جل بجھ کر ہوا)۔ (۸۴ب) بسا (اعتبار)

پنجابی افعال

پنجابی الفاظ کی کثرت کے علاوہ غوث نے اس مثنوی میں پنجابی افعال بھی بہت استعمال کئے ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار میں نشان زدہ افعال پنجابی ہیں:۔

(ورق ۱۸ب) کہ پریوں کا جس وقت سایہ پیا[1] | اسی وقت دلشوق تھا سو گیا
(" ۲۲ب) شہزادے کا جب لک نہ فرمان ہو | تو مشکل وہاں بھی ترا جان ہو
(" ۲۵و) اے باد صبا اب تو جا کر وہیں | شہزادے کو یہ میری حالت کہیں
(" ") کہ رل[2] بیٹھ دونو پیویں ہم شراب | او تھا درمیاں سین جو پردہ حجاب
(" ۲۷و) تو ہر گاؤں ہر شہر میں آوڑیں[3] | جو کوچہ بکوچہ گدائی کریں
(" ۲۹ب) نہ سمجھا تو مجکو نہ جاتا سبھے | کہ ہرگز نہ تم نے پچھاتا مجے
(" ۳۰و) لگا ساتھ چھاتی کے چھاتی وہی | وہ ایسے ملے تھے نہ ملیا کوئی
(" ۳۱و) بندھا سہرا نوشہ کے جب سر اوپر | وہیں آئے دیکھن کو شمس وقمر
(" ۳۲ب) کہ کشتی کریں پہلوان اس طرف | کہ دیکھن سین جس کے ہو غم ہر طرف
(" ۳۸و) نہ ہمدم نہ واقف کوئی راز کا | مجھے ایسی آتش میں سڑنا پڑا
(" ۴۰و) کیا یا ہروے ماہ میں مجکو بیتاب | ہوا ما گہہ میں بہجہ میرا دل کباب

---

[1] پڑا [2] کساتھ مل بیٹھ کر [3] آداخل ہوں [4] جانا پہچانا [5] جل کر

اورق ۳۴ ا) سنی ورزد نے جب عقب سے کلام　　تو مُڑ آ[1] کھلوتا وہ در زیر بام

پنجابی جمع

غوث نے حتی الوسع افعال واسما کی جمع پنجابی طریق پر بنائی ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار میں نشان زدہ الفاظ اس کے شاہد ہیں:۔

(ورق ۱۳ب) کہ جس وقت پریاں پلنگ کو اُٹھا　　شہزادی کوں گھر میں لے گیاں اُونہا

(" ۳۶ب) لیا ساتھ لشکر کئی لکھ سوار　　کئی پلٹناں لے کے ہو یا تیار

(" ۳۵و) گئی جب وہ کر کوچ کئی منزلاں　　یہ گردش فلک کی تھی سالتی وہاں

(" ۴۸ب) کہا اس نے داناواں سچ ہے کہا　　نہ عورت کے عالم کا کچھ ہے بِتا[2]

مصنف نے اس مثنوی میں ایک مختصر سا "بارہ ماہ" بھی لکھا ہے۔ جس میں ہر مہینے میں پانچ غزل کے اشعار لکھے ہیں۔ اس "بارہ ماہ" میں تمام مہینوں کے نام بھی پنجابی میں نظم کئے گئے ہیں:۔

۵۔ انتخاب

یہ مضمون تشنہ رہے گا اگر قارئین کی خدمت میں مثنوی کا انتخاب پیش نہ کیا جائے ملاحظہ کیجئے مصنف نے دلشوق کا محل اور باغ الفاظ سے کس طرح تعبیر کیا ہے۔ پنجاب میں مبارک کام کا آغاز زمین پر تیل گرا کر کیا جاتا ہے۔ اور اسے نیک شگون سمجھا جاتا ہے یہ رسم مٹی مٹی بھی اس شکل میں موجود ہے کہ جب دولہا دلہن کو بیاہ کر لاتا ہے۔ تو دلہن کی خوشدامن اپنے مکان میں دلہن کے داخل ہونے سے پہلے دہلیز پر سرسوں کا تیل گراتی ہے اور پھر دلہن مکان میں داخل ہوتی ہے۔ غوث نے بھی مندرجۂ ذیل

---

[1] پھر آ کھڑا ہوا۔ [2] پنجابی بھروسہ

اشعار میں اِس رسم کا ذکر کیا ہے:۔

اوّل فاتحہ خیر بسم اللہ پر　　دیا خشت کو شہزادہ نے دہر
کہ پھر شیرنی بانڈ اور تیل چو　　رکھا کاریگر نے جو بنیاد کو
مرتب لگا ہونے دیوار و در　　لگا سیم کا آب اور خشتِ زر
عجب اک طرح طاق تھے بند کئے　　کہ جو گرد ہی طاقوں کے جدول کئے
سبز سرخ دے رنگ کاریگراں　　کیں جبرت لعلوں کی اوس درمیاں

. . . .

کہ پہلوں ہر طاقونکی کئی مورتاں　　کہ معشوق عاشق کیاں صورتاں
کچھ اس طور اوس کاریگر نے بنا　　کسیکون کسی کے دیا گل لگا
کسی نے کسی کا جو پلہ پکر　　کہے سات میرے تون اک بات کر
کسی نے کسی کے گلے ڈال ہاتھ　　کسی سے کوئی کہتی ہس ہس کے بات
کسیکو کوئی کہنی انگل کوں پھیر　　پرے دور ہو چل ارے مجھ نہ چھیر
کوئی خود بخود بوسہ بازی کریں　　گذشتہ کوئی بات تازی کریں
کسی کے کوئی آگے ہتھ باندہ کر　　کرے منت اور عاجزی بیشتر
خوشی سے کوئی بیٹھ پیئے شراب　　کوئی سامنے کھانی کرکر کباب
کوئی چہرہ کون دیکھتی شیشہ دہر　　کوئی مستی ملتی تھی دانوں اُپر
لبوں کے اوپر کوئی سرخی ملے　　کوئی سیس اپنی کون کنگھی کرے

. . . .

کوئی ساتھ چشموں اشارت کرے　　کوئی ساتھ ہاتھوں بشارت کرے
کوئی کھیلے شطرنج گنجفہ قمار　　کوئی بازی جیتے کوئی دیوے ہار
کوئی نازادا سین چہراوے پلنگ　　کوئی سیس اپنے کون دہوے لنگ

کوئی زیچ آنکھوں کے سرمہ کرے کسی کو کوئی بیٹھ چپی کرے
کوئی بیٹھے بر پلنگ تکیہ لگا عجب مورتوں میں تھی وہ کج ادا
رکھے رب اس عوث کو بے خلل کہ تیار رنگین کیا جس محل
لگا دوں میں ہر طرف گلذار کو بٹھادوں میں اس باغ میں یار کو
لگائے تھے ہر طرف شجر میوہ دار کہیں تاک لیموں کہیں تھے انار

. . . .

کہیں بوتے بادام کے بیشمار کسی طرف انجیر تھی اور انار
کہیں تھے ترنگ اور کہیں سنگترا کہیں داکھ تھی اور پستہ کھرا
کسی طرف تھے انبہ آرو کہیں کہیں کشمش و ناشپاتی کہیں
کہیں لاچیاں اور کہیں قرنفل سپاری کہیں اور کہیں ناریل

. . . .

کہیں سوسن و مروا تھا گل دوپہر کہیں تھا جو سنبل بنفشہ کا لہر
کہ گل خیرا ریجان وہ برگ حنا کہیں کاسنی گینڈا صد برگ تھا
گل عباسی گل شبو گل نارون شقایق خمیرا کہیں نسترن

. . . .

کہیں تھی داؤدی اور کہیں موتگرا کہیں تھی جو نسرین کہیں موتیا
گل عنبر کہیں اور بابونہ کہیں صنوبر کہیں اور کرنا کہیں

. . . .

"بارہ ماہ" میں سے ایک مہینہ ملاحظہ فرمائیے:۔
دلآرام دلشوق کے فراق میں گا رہی ہے:۔

ماہ ساون

کیا مجکوں ساون نے اب دِلفگار کہ ہنجویں مہینے نہ پایا مَیں یار
پیا کے بنا میں پریشان ہُوں کروں اپنی آنکھوں سے ہیں اشکبار
میرا تن بدن جل کے کولا ہُوا نہیں خواب خور مجھ کو لیل و نہار
ہیں بے ذوق بیٹھی ہوں حیران دے کہ دلشوق بن اب گئی سب بہار
اگر میری آ کر خبر لے سجن کروں جان و دل اپنا اوس پر نثار

محمد باقر

دائرہ کے مہدویوں کا اُردو ادب کی تعمیر میں حصّہ

ریاست جے پور کی توراوامی نظامت میں کھنڈیلہ کے نام سے ایک قصبہ ہے۔ جو جے پور سے پچپن میل شمال میں مغرب کی طرف ہٹتا ہوا واقع ہے۔ فی زمانا کھنڈیلہ کے دو حقدار ہیں اور دونو راجہ کہلاتے ہیں۔ مقامی طور پر بڑا پانا اور چھوٹا پانا کے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ راجا ریاست جے پور کو بہتر ہزار پانسو پچاس روپے سالانہ خراج میں ادا کرتے ہیں۔ کھنڈیلہ سے مشرق میں تین تیر پرتاپ کے فاصلہ پر ایک بستی ہے۔ جو دائرہ کے نام سے موسوم ہے اور سنہ ۹۹۹ھ ۱۵۹۰ء میں بعہد جلال الدین اکبر بادشاہ آباد ہوتی ہے۔ اور میاں مصطفیٰ کے فرقہ کے مہدویوں کی خالص آبادی ہے۔ اہل دائرہ کو مذہب کے ساتھ ہمیشہ توغّل رہا۔ ایک الگ تھلگ مقام میں آباد رہنے اور بعض اختلافی معتقدات پر یقین لانے کی وجہ سے ان میں مذہبی جوش ہر عہد میں بیدار اور قائم نظر آتا ہے۔ وہ اپنی روایات زندہ رکھتے ہیں۔ جب تک فارسی میں نباہ سکے فارسی سے کام لیتے رہے۔ جب اُردو کا ستارہ چمکا اور محمد شاہ کے عہد سے شمالی ہند میں ادبی تحریک شروع ہوئی انہوں نے اردو اختیار کر لی۔ اور اپنے مطالعہ کے لئے اپنا علیحدہ لٹریچر جو زیادہ تر نیم مذہبی قسم کا ہے طیار کرتے رہے۔ نہ صرف لٹریچر طیار کیا بلکہ اس کے تحفظ میں بھی ساعی رہے ہمارے لئے دلچسپی کا موجب یہ امر ہے کہ اس جماعت کے ذریعہ سے راجپوتانہ میں ہمیں اُردو لٹریچر کے وجود کا سراغ لگتا ہے اور اس کے کافی نمونے حاصل ہو جاتے ہیں

جن سے اس علاقہ میں اردو زبان کی عام حالت اور کیفیت کے مطالعہ کرنے کا ایک غیر مترقبہ موقع بہم پہنچ جاتا ہے ۔

ہم اپنی موجودہ معلومات کی روسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ اہل دائرہ میں اُردو زبان کی تصنیفات کا سلسلہ سنہ ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء سے شروع ہوکر سنہ ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء کے قریب ختم ہوجاتا ہے اس پینتالیس سال کے عرصہ میں انہوں نے بیس کے قریب جدید تالیفات مہیا کیں جو ایسی چھوٹی جماعت کے لئے بالخصوص ان ایام میں ایک قابل ستائش اور یادگاری کارنامہ ہے۔ یہ تالیفات سب کی سب نظم میں ہیں۔ نثر کا کوئی نمونہ موجود نہیں ۔

ان میں اوّلیت کا فخر مثنوی فیض عام کو ملتا ہے۔ جو سنہ ۱۱۴۱ھ میں لکھی جاتی ہے اس کے بعد تاریخ غریبی کا نمبر ہے۔ جو سنہ ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰ء میں آغاز پاکر سنہ ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء میں ختم ہوتی ہے۔ شہادت نامہ اور وفات نامہ سنہ ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء کے مصنف آدھین مہدوی ہیں ۔ زینت المصلی اور رسالہ راگ تالیف سنہ ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷ء بھی انہی کی ملک ہیں۔ رسالہ درحجت دلیل بے واسطہ یا خلاصۂ عقیدہ میاں مصطفٰے سنہ ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱ء کی یادگار ہے۔ سنہ ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۶ء میں محمد جی میاں اماموں کا فتح نامہ تیار کرتے ہیں۔ بحر المعانی عرف معراج نامہ سنہ ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء میں شایع ہوتا ہے ۔

یہاں وہ تصانیف مذکور ہوتی ہیں۔ جن کی تاریخ معلوم نہیں۔ مثلاً (۱) گناہ کبیرہ (۲) عقاید مہدویان از محمد جی میاں (۳) رسالہ در تائید گروہ میاں مصطفٰے از سید مرتضیٰ بن سید شریف (۴) ایک نظم :- حق حاضر ہے حق ناظر ہے۔ (۵) عرس وتاریخ میران علیہ السلام (۶) نقل ہیزم فروش از ظہور مظہر (۷) شمایل نامہ از ابدال ترین (۸) نقل مردیکہ چہار چیز پیش آمدہ بود (۹) اثبات مہدویت (۱۰) شہادت نامہ سید خوند میر (۱۱) رسالہ نظم :- سپاس او منت خدا راست بس' (۱۲) درویش نامہ (۱۳) رسالہ :-

اولاً وصف ہے سبحان جو ہے صاحب سلطان (۱۴) ریختہ عقاید مہدویان ٭

صفحات آیندہ میں انہی کتابوں اور رسالوں کا تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن تبصرہ سے پیشتر ہمیں مہدویوں کی تحریک کے بانی اعظم حضرت سید محمد جونپوری نیز بندگی میاں مصطفے اپیشواے اہل دائرہ کے حالات جاننے نہایت ضروری ہیں۔ اس حصہ کو حتے الامکان میں نے مختصر کر دیا ہے اور ایسے عنصر کو جو ان کی کرامتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ بالکل حذف کر دیا ہے۔ تاہم میں دیکھتا ہوں۔ کہ یہ مضمون بہت لمبا ہو گیا ہے۔ اور مجبوراً مجھ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا ہے ٭

پیشتر اس کے کہ اس پیش نامہ کو ختم کروں میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ سید خیر الدین صاحب وکیل ٹھکانجات جے پور کی خدمت بابرکت میں اس مجموعۂ تصانیف اہل دائرہ کے واسطے جو انھوں نے نہایت مہربانی اور فیاضی سے کام لے کر مجھے مستعار دی ہیں۔ اپنی دلی ممنونیت کا اظہار کروں۔ اہل دائرہ کی ادبی تحریک میرے نزدیک اردو کی تاریخ کا ایک نامعلوم ورق ہے۔ اور اس ورق کو منظر عام پر لانے میں سید صاحب ممدوح کی علمدوستی اور فیاضی میری شریک غالب ہے ٭

حضرت سید محمد جونپوری بانی فرقہ مہدویہ

نویں صدی ہجری مذہبی اعتبار سے نہایت انقلاب انگیز اور یادگار صدی ہے جس میں کئی جدید تحریکیں بروی کار آئیں۔ مخلوق کو اپنے خالق کی تلاش میں زبردست انہماک رہا۔ جدید پیشوا اور مصلح پیدا ہوئے جو بھولی دنیا کو بیدار کرنے اور پیغام حق سنانے میں کامیاب ہوے۔ نئے مذہب اور نئے فرقے پیدا ہوئے اور پران چشتے مداری وجلالی فرقے۔ کبیر پنتھی۔ دادو پنتھی وستنامی اسی صدی کی یادگار ہیں۔ اور سید محمد جونپوری بھی جو فرقہ مہدیہ کے بانی ہیں۔ اسی صدی کی پیداوار ہیں۔ مہدویہ کے

خروج سے نہ صرف ایک نیا فرقہ وجود میں آیا۔ بلکہ اس نے اپنے پیروؤں میں ایک تازہ روح اور دینی جوش پھونک دیا۔ ایک نئی قسم کی رہبانیت کی ترویج کی۔ نئی جماعت بندی ہوئی۔ اور نیا لٹریچر وجود میں آیا۔ نئے فدائی اور شہدا پیدا ہوئے جو عقیدہ کی خاطر اپنا جان ومال ہر وقت قربان کرنے کے لئے مستعد تھے۔ قید وبند قتل و غارت۔ اخراج اور دنیوی لالچ انہیں اپنے معتقدات سے متزلزل نہیں کرسکتا تھا۔ دنیا ترک کی اور مہدی کی خاطر طرح طرح کے عذاب سہے۔ مگر اس سے غداری نہیں کی۔ اب وقت آگیا ہے۔ کہ ہم اس مہدی کی زندگی کے مختصر حالات اپنے سامعین کی خدمت میں پیش کریں ؛

۸۴۷ھ / ۱۴۴۳ء میں حضرت سید محمد بانی فرقہ مہدویہ شہر جونپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید عبداللہ عرف سید خاں ہے۔ والدہ کا نام بی بی آمنہ عرف آغا ملک ہے سات برس کی عمر میں حفظ قرآن کر کے بارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ چونکہ موشگافی میں دلیر اور مباحثہ میں شیر تھے۔ شیخ دانیال جونپوری و دیگر علماء نے آپ کا لقب اسد العلما قرار دیا۔ انیس سال کی عمر میں یعنی ۸۶۶ھ / ۱۴۶۱ء میں آپ کی چچا زاد بہن بی بی الہ دادی دختر سید جلال الدین بن سید عثمان سے آپ کا نکاح ہوا ؛

سید محمد نے عنفوان شباب سے عالم درویشی میں قدم رکھا۔ اور دنیا ان کی معتقد ہونے لگی۔ جب آپ کی ولایت کا زیادہ چرچا ہوا۔ سلطان حسین شرقی ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸ء و ۸۸۵ھ / ۱۴۸۰ء (متوفی ۹۰۵ھ / ۱۴۹۹ء) اس وقت جونپور کے تخت پر جلوہ فرما تھا۔ وہ خود آپ کی مجالس وعظ میں حاضر ہوا۔ مہدویوں کی روایت ہے کہ ان ایام میں سلطان حسین راو دلپت والی گوڑ کا خراج گزار تھا۔ آپ نے اثنائے وعظ میں فرمایا کہ مسلمان حاکم کو

---

[1] یہ قصہ تاریخی نقطۂ نظر سے محل تامل ہے۔ کیونکہ تاریخ میں کوئی ایسا راجہ نظر نہیں آتا (گوڑ) بنگال ان ایام میں مسلمانوں کے زیر نگیں ہے۔ اور حسین کا سب سے بڑا دشمن راو دلپت نہیں ہے، (باقی حاشیہ بر صفحہ ۴۱)

چاہیئے۔ کہ مطیع الاسلام رہے۔ سلطان نے کہا۔ جب ہندو قوی ہو تو کیا کیا جائے۔ اگر میں وقت پر خراج ادا نہ کروں تو ہندو راجہ میرا ملک تباہ و تاراج کر دے گا۔ آپ نے جواب دیا کہ خدا دین حق کا ناصر ہے۔ ہمت شرط ہے۔ اس جواب سے سلطان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس نے ایک بڑی رقم مجاہدین کے صرفہ کے لئے بھیج دی۔ آپ نے اس رقم سے پندرہ سو جوان بیراگی ملازم رکھ لئے۔ جب خراج دینے کا وقت آیا۔ سلطان نے اس کی ادائگی سے صاف انکار کر دیا۔ والی گوڑ رائے دلپت ستر ہزار فوج لے کر چڑھ دوڑا۔ سلطان نے آپ کی خدمت میں کہلا بھیجا۔ کہ اب وقت آ پہنچا ہے۔ جب مسلمان مشرکوں کے ہاتھ سے شہید ہوں۔ آپ نے جواب میں فرمایا خدا پر بھروسہ رکھو۔ میں میدان میں آتا ہوں۔ تم بھی تیار ہو کر آؤ۔ الغرض آپ تین سو تیرہ آدمی لے کر میدان میں آ دھمکے۔ سلطان نے بیراگی سواروں کو حضرت کے مطیع فرمان کر دیا۔ سلطانی فوج راجہ کی ٹڈی دَل فوج کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ جنگ شروع ہوئی۔ اور کھانڈا بجا۔ راجہ کے لشکر نے شاہی فوج کو ایسا دبایا کہ اس کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ مگر آنحضرت اپنے دستہ کے ساتھ میدان میں قدم گاڑے کھڑے رہے۔ سلطان نے پیغام بھی بھیجا کہ پلٹ آئیے۔ جب راجہ نے دیکھا کہ ایک مختصر جماعت ابھی تک جنگ میں ڈٹی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے سفید ہاتھی کو ان پر ریل دیا۔ حضرت نے ہاتھی کی طرف گھوڑا بڑھایا اور ایک تیر اس کی مستک پر اس زور سے مارا کہ سوفار تک غرق ہو گیا۔ ہاتھی زخمی ہو کر پلٹ پڑا اور اپنی فوج کو روندنے لگا۔ راجہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ راجہ آگے بڑھا۔ اس نے آپ پر تلوار کا ہاتھ چھوڑا۔ تلوار گھوڑے کی گردن پر پڑی مگر کارگر نہ ہوئی۔ اب آپ نے اس پر وار کیا۔ اور تلوار سر کاٹتی ہوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) بلکہ بہلول لودھی جو متواتر جنگوں کے بعد ۸۸۳ھ میں حسین کی سلطنت پر قابض ہو جاتا ہے۔ اور حسین بنگالہ میں جا کر پناہ لیتا ہے۔ اور ۹۰۵ھ میں وہیں مرتا ہے ؂

سیلہ تک پہنچی۔ راجہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اور مسلمانوں کی فتح ہوگئی۔ میاں ولاور حضرت سید محمد کے خلیفہ اسی راجہ کے بھانجے ہیں۔ اور لڑائی میں اسیر ہوکر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ اس جنگ کے بعد بارہ سال آپ پر جذبہ کی حالت میں گذرتے ہیں ۔

سنہ ۸۸۷ھ (۱۴۸۲ء) میں جب آپ کی عمر چالیس سال کی تھی۔ آپ نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ سلطان حسین[1] نے بھی سلطنت چھوڑ کر ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ اگر تم ہمارے ساتھ رہوگے تو کفار پھر سر اٹھائیں گے اور مسلمان تباہ ہوجائیں گے۔ یہ کہہ کر سلطان کو اس کے ایمان کی سلامتی کی بشارت دی اور داناپور روانہ ہوگئے۔ وہاں سے کالپی۔ چندیری ہوتے ہوئے چانپانیر پہنچے اور جامع مسجد میں قیام فرمایا۔ سلطان محمود سنہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۸ء) و سنہ ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء) ان دنوں گجرات کا بادشاہ تھا۔ جب اس نے آپ کی مجلس وعظ کا چرچا سُنا اپنے دو معتمد فرہاد الملک اور سلیم خاں کو دریافت حال کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ لوگ آپ کا بیان وعظ سن کر اس قدر گرویدہ ہوئے کہ مرید ہوگئے۔ اسی مقام پر آپ کی حرم محترم یعنی بی بی الہ دادی ۲ رذیحجہ کو انتقال فرماتی ہیں۔ چانپانیر میں آپ کا قیام ڈیڑھ سال رہا۔ اس اثنا میں ہزاروں نے آپ سے فیض پایا۔ اب آپ مانڈو تشریف لائے۔ لیکن بعض سوانح نگار لکھتے ہیں۔ کہ آپ چندیری سے پہلے مانڈو گئے اور پھر چانپانیر پہنچے ہمارے خیال میں یہ بیان زیادہ صحیح ہے۔ بہر حال حضرت کی تشریف آوری کے وقت مانڈو کا حاکم سلطان نصیر الدین[2] تھا۔ اس نے اپنے باپ سلطان غیاث الدین کو قید

---

[1] سلطان حسین نو اس زمانہ سے دو سال پہلے اپنا ملک بہلول لودھی کے ہاتھ پر کھو کر بنگالہ میں پناہ گزین ہوجاتا ہے اس لئے اس سفر میں حضرت سید محمد مہدی کے ساتھ اس کو شرف بیعت کی خواہش کرنے کا کوئی موقعہ نہیں مل سکتا۔

[2] دونوں نام درست نہیں۔ غیاث شاہ خلجی والی مانڈو سنہ ۸۸۰ھ (۱۴۷۵ء) سے سنہ ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) تک اور ناصر شاہ سنہ ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) سے سنہ ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) تک حکومت کرتا ہے ۔

کر کے اپنی حکمرانی کا سکہ جمایا تھا۔ غیاث الدین نے آپ کی خدمت میں ساٹھ توڑے روپے، اشرفی و زر و جواہر کے اور ایک تسبیح موتیوں کی جس کی قیمت ایک کروڑ محمودی تھی بھجوائے۔ اور دعا کا طالب ہوا۔ دولت آباد میں آپ نے مزارات اولیاء اللہ کی زیارت کی۔ احمد نگر میں احمد نظام شاہ بن نظام الملک بحری کے اولاد نہ ہوتی تھی۔ خدا نے آپ کی دُعا قبول کی اور اس کے اولاد ہوئی۔ بیدر میں جب پہنچے۔ اس وقت سنہ ۹۰۰ھ ۱۴۹۴ء اور وہاں کا بادشاہ قاسم برید سنہ ۸۹۷ھ ۱۴۹۱ء و سنہ ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء تھا۔ یہاں آپ پورے ڈیڑھ سال قیام فرماتے ہیں اور بڑے بڑے علماء اور شیخ زادے مثلاً جناب شیخ مومن توکلی۔ قاضی علاء الدین۔ مولنا ضیاء الدین عاشق اللہ اور قاضی منتجب الدین جونیری آپ کی تصدیق کرتے ہیں۔ بیدر سے رخصت کے وقت آپ کے ساتھ تین سو ساٹھ یار و احباب کی جماعت تھی۔ اب ارادہ ہوا کہ بیجا پور ہوتے ہوئے ڈابول سے جہاز پر بیٹھ کر برائے حج بیت اللہ تشریف لے جائیں۔ مگر بعض بشارت کی بنا پر آپ کو گلبرگہ جانا پڑا۔ زیارتوں سے فارغ ہو کر براہ بیجا پور و چیتا پور ڈابول بندر پہنچے اور جہاز میں سوار ہو کر جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے۔ یہ سنہ ۹۰۱ھ ۱۴۹۵ء تھا۔ آپ کی عمر اس وقت چون سال تھی۔ طواف کے بعد آپ نے درمیان رکن و حجر اسود مجمع کثیر میں دعوت مہدیت کی۔ واپسی کے وقت آپ بقولے دیو بندر اور بقولے بندر کھنبایت میں جہاز سے اُترے۔ کھنبایت میں اکثر بوہرے آپ کے مرید ہو گئے ؎

احمد آباد پہنچ کر آپ نے تاج خاں سالار کی مسجد میں جمال پور کے قریب اقامت فرمائی۔ یہاں آپ کی شہرت اس کثرت سے ہوئی۔ کہ ہزارہا آدمی آپ کی مجالس وعظ میں شریک ہونے لگے اور باوجود مسجد کی وسعت کے تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ آپ کے بیان کا ایک اعجاز یہ تھا۔ کہ آپ کا وعظ نزدیک اور دُور

کے آدمیوں کو یکساں سنائی دیتا۔ ایک دن جب آپ آیۂ لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّیٰ تُنفِقُوا پر وعظ کر رہے تھے۔ ملک برہان الدین جو بڑے عالم اور جلیل القدر امرائے احمد آباد سے تھے۔ ترک دنیا کر کے آپ کے مصدق ہو گئے۔ امیر ملک گوہر خزانہ دار بادشاہ بنگالہ۔ سلطان محمود بیگڑہ کا بدچلن بھانجا اور حاجی مالی آپ پر ایمان لاتے ہیں۔ قاضی بڈھن صاحب۔ شاہ عبدالمجید نوری۔ امین محمد صاحب اور ابو محمد صاحب فرزندان شاہ سعداللہ۔ مولانا یوسف۔ مولانا احمد شاہ قدن جو جماعت علماء و مشائخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی تصدیق کرتے ہیں۔ بالآخر علمائے احمد آباد آپ کے روز افزوں اثر اور خلق اللہ کی عام رجوع کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور چانپانیر اس مضمون کی عرضی بھیجی کہ سید محمد جونپوری کے وعظ و تلقین میں تجرد و ترک دنیا کی ترغیب ہوتی ہے۔ تمام شہر کے امراء و سپاہ، رعیت و علماء و مشائخ چند ہی روز میں ان کے معتقد اور گرویدہ ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ سب کے سب دنیا چھوڑ کر اگر فقیر بن گئے تو ریاست کے کل پرزے بیکار ہو جائیں گے۔ اگر کچھ دنوں یہ سید یہاں اور رہا تو تمام شہر اس کا مطیع ہو جائے گا۔ اور ریاست ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ بہتر ہے کہ ابھی سے انسداد کیا جائے۔ اس درخواست پر آپ کے اخراج کا حکم ہوا اور آپ نے پٹن کا رخ کیا۔

مرآت سکندری میں یہ واقعہ کسی قدر مختلف بیان ہوا ہے۔ جو یوں ہے کہ ایک روز سید (محمد مہدی) نے کہا۔ کہ میں خدا کو اسی سر کی آنکھ سے دکھا سکتا ہوں۔ اس پر علماء احمد آباد نے ان کے قتل پر فتوے دے دیا۔ گر مولانا محمد تاج کہ اعلم العلماء اور استاد الاساتذہ تھے۔ مفتیوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔ کہ تم نے علم کیا اسی غرض سے سیکھا تھا۔ کہ سید کے قتل پر فتویٰ دو۔" ہمہ فتویٰ نوشتند الا مولانا محمد تاج کہ اعلم علمائے عصر بود و اوستاد اوستادان شہر۔ بعلما گفت۔ کہ شما

علم را برای ہمین آموختہ اید کہ بر قتل سید فتویٰ بدہید" الغرض سید احمد آباد سے پٹن کو روانہ ہوے۔ بڑلی پٹن سے تین کوس پر ایک گاؤں ہے۔ وہاں قیام کیا اور مہدویت کی دعوت کی۔ (مرآت سکندری۔ بحوالہ سوانح مہدی موعود ص۵۲)

جب پٹن پہنچے ۹۰۳ھ (۱۴۹۷ء) یا ۹۰۴ھ (۱۴۹۸ء) تھا۔ یہاں بھی مرجع خلق اللہ بن گئے ملک بخن نے تصدیق کی اور اجازت لے کر سید خوندمیر کو خدمت میں لے گئے۔ انہوں نے بھی تصدیق کی۔ ملک یعقوب صوبہ دار پٹن ان کے فرزند اور لواحق سب کے سب آپ کی تلقین میں آ گئے۔ اسی طرح شہر کے مشہور علماء مولنا یوسف سہیت اور ان کے بھائی مولنا محمد تاج جو سر آمد طبقۂ علماء تھے۔ نیز مولنا عبدالرشید پٹنی آپ کے مصدق ہوے۔ ملک معروف اور ملک برہان الدین بھیں آپ کے حلقۂ ارادت میں آتے ہیں۔ اسی شہر میں مولنا لاڑشہ کی دختر بی بی ملکان سے آپ کا نکاح ہوا۔ سید صاحب نے یہاں اپنے فرزند سید محمود ثانی مہدی کو جو آپ کے بعد آپ کے خلیفۂ اوّل بنتے ہیں کسب معاش کے لئے ملازمت کی اجازت دی۔ جو ملک عثمان باڑیوال کی معرفت سلطان محمود بیگڑہ کی خدمت میں کسی منصب پر سرفراز ہوے؛

پٹن میں جب آپ کے معتقدین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور علماء کی بے قدری ہونے لگی۔ سب نے متفق ہو کر سرکار شاہی میں آپ کے خلاف درخواست ارسال کی۔ سابق کی طرح اخراج کا حکم صادر ہوا۔ آپ اس سے قبل پٹن سے کوچ کا عزم کر چکے تھے۔ پٹن سے بڑلی پہنچے جہاں آپ نے مہدی موعود بننے کا دعویٰ کیا۔ اس وقت آپ کی عمر اٹھاون سال کی ہو چکی تھی اور ۹۰۵ھ (۱۴۹۹ء) تھا۔ آپ نے سلطان محمود والی گجرات و دیگر سلاطین کو تبلیغی خطوط بھیجے۔ اور چار ماہ تک ان کے جواب کی امید میں بڑلی قیام پذیر رہے۔ اس اثنا میں پٹن کے علماء ملا معین الدین

کی قیادت میں آپ سے مباحثہ ومناظرہ کرنے کے لئے بڑلی آئے اور مغلوب
ہوکر واپس گئے +
بڑلی سے چل کر آپ جالور پہنچے ۔ زبدۃ الملک حاکم جالور آپ کی مجلس میں آیا
اور مرید صادق بن گیا ۔ جالوری ہزاروں کی تعداد میں آپ کے حلقۂ ارادت میں
آئے ۔ چار مہینے جالور میں رہ کر نصیر پور ہوتے ہوئے ناگور پہنچے ۔ ملک جی حاکم
ناگور علماء کو جمع کر کے مناظرہ کی نیت سے آیا ۔ مگر جیسے ہی اس کی نگاہ آنحضرت
پر پڑی ۔ آپ کی تلقین پر ایمان لے آیا ۔ ناگور کے دیگر اشراف واعیان اور علماء
آپ کی تصدیق سے مشرف ہوئے ۔ یہاں سے آپ جیسلمیر ہوتے ہوئے ٹھٹھہ
وارد ہوئے ۔ جام نظام الدین والی ٹھٹھہ نے جس کو جام نندا بھی کہتے ہیں ۔
علمائے وقت کو آپ کے ساتھ بحث ومناظرہ کے واسطے بھیجا ۔ انہوں نے
واپس آکر آپ کی شکایت کی اور جام نندا کو آپ کے قتل کی ترغیب دی ۔ جام
نے اپنے میر لشکر دریا خاں کو آپ کے اخراج کا حکم دیا اور کہا کہ اگر عدول حکمی
کریں تو قتل کر دینا ۔ دریا خاں نے فوج ساتھ لی اور جب قریب پہنچا چند آدمیوں
کو ساتھ لے کر آپ کی اقامت گاہ میں آپہنچا ۔ جیسے ہی آنحضرت کی نظر دریا خاں
پر پڑی گھوڑے سے گر کر بے خود ہوگیا ۔ آپ کی تصدیق کر کے اور تلقین پاکر
واپس ہوگیا ۔ جام اس خبر سے بڑا پریشان ہوا ۔ آخر اس نے اپنے پیر شیخ صدرالدین
سندھی کو جو اپنے وقت کے فاضل اور نامور شیخ تھے ۔ طلب کر کے بغرض مناظرہ
بھیجا ۔ شیخ آئے اور بحث کے بعد آپ کے معتقد ہوگئے ۔ اور دنیا ترک کر کے
آپ کے گروہ مہاجرین میں شامل ہوگئے ۔ اب سندھی کثرت سے آنے اور مصدق
ہونے لگے ۔ ان میں میرزا شاہین بھکر کے امیر اور شیخ الیاس مولوی اور جناب
قاضی قاضن قاضی سندھ قابل ذکر ہیں ۔ موخرالذکر مشرکوں کا لباس پہنے اور زنار

گلے میں ڈالے حاضر خدمت ہوے۔ آپ نے دیکھتے ہی فرمایا۔ قاضی قاضن یہ کیا
سوانگ ہے۔ اس لطیفہ پر قاضی صاحب ایمان لے آئے۔ ٹھٹھہ میں ایک سال
ٹھہرنے کے بعد آپ براہ دریا کاہہ تشریف لے گئے۔ حاکم کاہہ اشرف خاں آپ
کے مصدقین میں شامل ہوگیا۔ یہاں آپ کے اصحاب کو بھوک اور فاقوں سے
بڑی تکلیف اٹھانی پڑی اور آپ کی جماعت کے چوراسی بندگانِ خدا نذرِ اجل ہوئے
شکر خاتون اور قاضی خاں فاقوں کی تاب نہ لاکر گجرات کو چلے گئے۔ اس وقت
آپ کی جماعت میں نوسو نفوس تھے۔ ان میں عیالدار تین سو ساٹھ تھے۔ ایک
روایت کی رو سے بائیس سو تھے۔ جن میں نوسو عیالدار اور باقی تیرہ سو مجرد تھے۔
اسی مقام پر بی بی بون آپ کے نکاح میں آئیں *

کاہہ سے قندھار کی طرف کوچ ہوا۔ راستہ بڑا خطرناک تھا۔ موذی جانور
حشرات الارض اور درندوں کے علاوہ زہریلے سانپ بکثرت تھے۔ مگر آنحضرت
مع اپنے مہاجرین کے بخیر و عافیت قندہار پہنچ گئے۔ قندہار میں اوّل اوّل آپ پر
سختیاں ہوئیں لیکن جب شاہ بیگ حاکم قندہار آپ پر ایمان لے آیا۔ وہاں کے
شرفا اور معززین کثرت سے آنے اور تصدیق کرنے لگے۔ منجملہ ان کے جناب
محمد کاشانی۔ میاں اشرف ہانسوی۔ میاں دانش خراسانی۔ جناب حاجی محمد عبداللہ
عبدالہاشم۔ عبدالقادر۔ کبیر خاں۔ شریف محمد۔ کمال خاں وچالاک خاں ترکِ دنیا
کرکے آپ کے ہمراہ ہولئے۔ قندہار سے روانہ ہوکر منزل بمنزل موضع دلآرام ہوتے
ہوئے قصبہ کوہ پہنچے۔ یہاں متعدد علما و اکابرین آپ کے مقلدوں میں داخل
ہوئے۔ قندھار سے فراہ پورا دس منزل ہے۔ یہاں پہنچ کر حضرت سید محمد مہدی
ملک اسکندر کی سرائے میں جو شہر کے باہر ہے قیام پذیر ہوے۔ فراہ میں آپ کے
کلام و بیان و دعوت مہدیت کی بڑی شہرت ہوئی۔ قاضی کے حکم سے اگرچہ فوج

نے آپ کے ہتھیار و سامان لے لئے۔ مگر سردار فوج سرور خاں بہت جلد آپ کا معتقد بن گیا۔ ادھر میر ذوالنون عامل فراہ بھی ارادت لے آیا۔ علما کا ایک گروہ بھی مناظرہ میں شکست پاکر آپ کے مریدان با اخلاص میں شامل ہو جاتا ہے۔ عامل نے آپ کے دعوے کی تصدیق کرتے ہوئے ایک عرضی سلطان حسین [بایقرا] ۸۷۸ھ ۱۴۷۳ء وسنہ ۹۱۲ھ ۱۵۰۹ء والی ہرات کی خدمت میں بھیجی۔ سلطان نے آپ سے مناظرہ کے لئے علماء کو بلایا۔ جب یہ علما آئے وہ بھی آپ کے پیرو بن گئے۔ سلطان خود آکر آپ کی تصدیق کرنی چاہتا تھا۔ مگر بوجہ شیخوخت و پیرانہ سالی سفر کرنے کے قابل نہ تھا۔ تاہم ہمت کر کے وہ چند منزل چلا تھا۔ کہ پیام اجل آپہنچا اور وفات[1] پائی ؛

جب آپ کی عمر تریسٹھ سال کی ہوئی۔ آپ ایک روز جمعہ پڑھنے موضع رچ میں جو فراہ کے قریب ہے تشریف لے گئے۔ راستہ میں ایک مقام پر ٹھہرے اور فرمایا کہ ملائک نور کے طبقات لے کر اس مقام پر آئے ہیں اور خدا ے تعالےٰ کا حکم ہے کہ یہ مقام متبرک ہے۔ "یہاں ٹھہر جا"۔ بالآخر آپ اسی مقام پر دفن ہوئے۔ آپ کی وفات ۱۹ ذی قعدہ سنہ ۹۱۰ھ کو یوم دوشنبہ ڈیڑھ پہر دن چڑھے واقع ہوئی ۔ لفظ 'فضل' سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ دفن کے لئے اہل فراہ اور اہل رچ میں جھگڑا ہوا۔ فراہ والے اپنے علاقہ میں اور رچ والے اپنے علاقہ میں دفن کرنے کے خواہشمند تھے۔ آخر آپ کو فراہ اور رچ کے مابین ایک باغ میں دفن کیا جہاں آخری جمعہ پڑھتے وقت آپ ایک مرتبہ ٹھہرے تھے۔ قبر میں رکھنے کے بعد جب سید محمود نے کفن میں آپ کو ٹٹولا تو آپ کی میت کا نشان نہیں ملا۔ اس واقعے پر سب حیرت زدہ رہ گئے ؛

---

[1] سلطان حسین سنہ ۹۱۲ھ میں یعنی حضرت سید محمد مہدی کی وفات سے جو سنہ ۹۱۰ھ میں واقع ہوتی ہے۔ دو سال بعد انتقال کرتا ہے۔ اس لئے اس قصہ کا ضعف ظاہر ہے ؛

حضرت سید محمد مہدی کے یہ وہ حالات ہیں۔ جو میں نے مولٰنا سید ولی صاحب سکندر آبادی کی تصنیف "سوانح مہدی موعود" سے اخذ کئے ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ اپنے مضمون پر نہایت قابلِ قدر مانی جاسکتی ہے۔ مگر مصنف نے اپنے پیشوا کی شخصیت کو خوش عقیدگی اور کرامت کے پردوں میں اس قدر چھپا دیا ہے کہ ان کے اصلی خط وخال کی شناخت دشوار ہوگئی ہے۔ سید صاحب کی شان اس میں شک نہیں کہ نہایت اعلےٰ وارفع ہے۔ خود ان کے مخالف ان کی بزرگی کو تسلیم کرتے ہیں۔ تمام دسویں صدی میں ان کا نام مخالف وموافق حلقوں میں گونجتا رہا ہے۔ وہ ایک زبردست عالم اور فاضل کامل تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں ان کو کامل دستگاہ تھی۔ ان کی زندگی میں ان کے معتقدین کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کرگئی تھی۔ نہ صرف عامی وجاہل ان کے حلقہ بگوش تھے۔ بلکہ علما وفضلا۔ امرا وشرفا ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ کمالاتِ علمی کے ساتھ ساتھ خدا نے ان کی زبان میں جادو اور بیان میں تاثیر دی تھی۔ ان کی آنکھ میں تسخیر کرنے کی بڑی طاقت تھی۔ دشمن بھی ان کے سامنے آکر موم ہو جاتے تھے۔ بحث ومباحثہ میں بے نظیر تھے۔ زبردست سے زبردست حریف کو بھی ان کے مقابلہ میں اپنی شکست تسلیم کرنی پڑتی تھی۔ با ایں ہمہ تقدس وہ ظرافت کی چاشنی سے بھی خالی نہ تھے۔ بلکہ بعض اوقات اپنی اس استعداد سے انھوں نے اپنی شکست کو فتح میں بدل دیا ہے۔ ان کے ایک کامیاب ریفارمر اور اعلےٰ مصلح ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مہدویت کے علاوہ انھوں نے کوئی بدعت روشناس نہیں کی۔ بلکہ تقویتِ دینِ اسلام واعلائے شریعتِ رسول سے کام رکھا۔ دین کی بادشاہی کی بجائے اگر کہیں دنیاوی بادشاہت قایم کرنے کا ان کو خیال آجاتا تو آج ہندوستان کی تاریخ میں ایک کی جگہ سادات کی دو سلطنتوں کا حال ہم پڑھتے۔

مہدویوں کا عقیدہ ہے۔ کہ فرائض و واجبات قرآنی دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ احکام شامل ہیں۔ جن کا تعلق نبوت و شریعت سے ہے۔ ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلسان شریعت مفصل بیان فرمادیا۔ دوسری قسم میں وہ احکام ہیں۔ جن کا تعلق خاص ولایت محمدیہ سے ہے۔ اب مشیت الٰہی کو منظور ہوا کہ ان احکام کی بھی تبلیغ ہو جائے۔ لہذا حضرت سید محمد مہدی موعود مبعوث ہوئے۔ جو دافع ہلاکت امت محمدیہ اور ناصر شریعت محمدی و مبلغ احکام ولایت محمدی ہیں۔ مقام ولایت میں جو امور فرض ہیں۔ یہ ہیں :-

(۱) ترک دنیا (۲) صحبت صادقاں (۳) عزلت از خلق (۴) ذکر کثیر (۵) ہجرت و توکل (۶) طلب دیدار خدا (۷) عشر ؛

حضرت سید محمد مہدی کے جانشین ان کے فرزند سید محمود ثانی مہدی ہوتے ہیں۔ جو ۸۶۷ھ یا ۸۶۹ھ میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک سال کے بعد اپنی جماعت کو لے کر گجرات آجاتے ہیں اور موضع بھلوٹ میں جو رادھن پور سے تین کوس مغرب میں ہے قیام کرتے ہیں۔ جب ان کی شہرت عام ہوئی خلق اللہ کا ہجوم ہونے لگا۔ مخلوق کثرت سے آتی اور گھر بار ترک کرکے آپ کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو جاتی۔ مہدویت کی اس روز افزوں ترقی کو دیکھ کر حکومت کو اندیشہ ہوا۔ علمائے اسلام کو خوف ہوا۔ چنانچہ علماء نے متفق ہو کر بادشاہ کی خدمت میں چانپانیر سند کتابت بھیجی۔ شاہی حکم پر پولیس آئی اور سید محمود ثانی مہدی کو قید کرکے لے گئی۔ آپ چالیس روز برابر قید میں رہے۔ اور بادشاہ کی بہنوں کی سفارش سے جو آپ کی معتقد تھیں۔ قید سے رہائی پائی۔ آپ نے ۳ رمضان ۹۱۹ھ ۱۵۱۳ء یا ۹۲۰ھ ۱۵۱۴ء کو وفات پائی ؛

سید خوندمیران کے قایم مقام ہوتے ہیں۔ یہ مہدی موعود کے داماد بھی

ہیں۔ اس وقت تک حکومت گجرات مہدویوں سے کافی بدظن ہو چکی تھی۔ سید خوندمیر کا بیس مختلف مقامات سے اخراج کیا گیا۔ علمائے احمد آباد نے مہدویوں کے قتل کے فتوے دے دیئے اور ان کی پیشانیوں کو ایک لوہے سے جس کا سرا کوّے کے پنجہ کے مشابہ تھا داغنے لگے۔ دو مہدوی رنگریز لڑکوں کو قتل کیا گیا۔ ملا حمید اور ملا انار الدین پر قتل کا فتوے لگا اور حد جاری ہوئی جب دیکھا کہ مہدوی تحریک سیاسی اہمیت حاصل کر رہی ہے۔ ان کے قتل عام کے لیئے سولہ ہزار فوج بسرکردگی عین الملک روانہ کی۔ یہ مظفر شاہ گجراتی ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء و ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء کا زمانہ ہے۔ شاہی فوج ۱۲ ارشوال ۹۳۰ھ کو جماعت مہدویہ کے مقابلہ پر آتی ہے۔ کھانبیل کے کھاریال میں پڑاؤ تھا۔ سید خوندمیر صرف ساٹھ جانباز لے کر مقابلہ میں نکلے۔ ان مٹھی بھر فدائیوں نے شاہی فوج میں قیامت مچادی۔ چھ سات سو سپاہیوں کو میدان جنگ میں موت کی نیند سُلا دیا۔ شاہی فوج نے بُری طرح شکست کھائی۔ فاتحین نے ڈیڑھ میل تک دشمن کا تعاقب کیا۔ سید خوندمیر اس معرکے میں زخمی ہوے۔ ۱۴ ارشوال سنہ مذکور کو شاہی فوج پھر بڑھی اور معرکۂ کارزار از سرِ نو گرم ہوا۔ مہدوی نہایت بیجگری سے لڑے اور جب تک کہ ان میں کا ایک ایک شخص قتل نہ ہو لیا۔ جنگ سے منہ نہیں پھیرا +

شاہ نعمت مہدویوں کے خلیفہ سویم ہیں۔ ان کے والد کا نام شیخ بڑے ہے۔ جو شیخ بیانی صدیقی تھے۔ شاہ نعمت گھر کے رئیس تھے۔ سپاہگری اور پہلوانی کا بڑا دم بھرتے تھے۔ ایک دفعہ کہیں تکرار ہوگئی۔ آپ نے طیش میں آکر سات آدمیوں کو قتل کر دیا اور پچیس تیس آدمی اپنے ہمراہ لے کر احمد آباد کی اطراف میں لوٹ مار شروع کر دی۔ شاہی فوج ان کے تعاقب میں نکلی۔ ایک

روز انہوں نے جنگل میں اذان کی آواز سنی ۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا ۔ کہ سید محمد مہدی مع اپنی جماعت متوکلین کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں ۔ احمد آباد سے ان کا اخراج ہوگیا ہے ۔ ان کو سید صاحب سے ملاقات کا اشتیاق ہوا۔ جب سامنے پہنچے ۔ ایک ہی نگاہ میں مسخر ہو گئے ۔ دوڑکر قدموں پر گر گئے ۔ توبہ کی اور ترک دنیا کر کے مہدی کے خدمت گزاروں میں شامل ہو گئے ۔ مہدی کی وفات کے بعد ثانی مہدی کے ساتھ گجرات آ گئے ۔ آپ کا دائرہ پٹن ۔ جالور ۔ احمد آباد ۔ احمد نگر ۔ خاندیس وغیرہ مختلف مقامات میں رہا ہے ۔ جب آپ کا مقام موضع منولی میں قریب قلعہ لوہ گڑھ تھا ۔ نماز عشا کے بعد آپ کے دائرہ سے آواز تسبیح وتہلیل بلند ہوئی یعنے" لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ۔ اللہ الٰہنا محمد نبینا ۔ القرآن والمہدیؑ اماما ۔ آمنا وصدقنا "۔ کفشدار خان خواجہ سرای حرم نظام شاہ کو جو اس وقت بیگمات کی حفاظت کے لئے قلعہ لوہ گڑھ میں متعین تھا ۔ مہدوی مذہب سے سخت عداوت تھی ۔ تسبیح کی آواز جو سنی ۔ غصہ میں چند لوگوں کو ساتھ لے کر چلا آیا ۔ شاہ نعمت کو مع دیگر سولہ طالبان حق کے ناحق قتل کر ڈالا ۔ شاہ نعمت اکسٹھ برس کی عمر میں ۲۲ شعبان ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء کو شہید ہوتے ہیں +

شاہ نظام خلیفہ چہارم مانے جاتے ہیں ۔ سلسلۂ نسب حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر سے ملتا ہے ۔ آپ کے والد شاہ خداوند پورب میں بلدۂ جالیس کے حاکم تھے ۔ ان کی وفات کے بعد شاہ نظام وارث بنے مگر ان کی طبیعت خداطلبی اور ترک دنیا کی طرف مائل تھی ۔ عین شباب میں ریاست اپنے چھوٹے بھائی کے حوالہ کر کے مکہ معظمہ گئے ۔ ستائیس برس کی عمر میں جناب مہدی کی تلقین سے فیضیاب ہوئے ۔ گیارہ برس آپ کی خدمت میں رہے اور بعد وفات مہدی

تیس سال خلافت کر کے موضع انوندرہ میں جو قصبۂ کرای ضلع احمد آباد سے ہے ۶۸ یا ۶۹ برس کی عمر میں ۸ ر ذیقعدہ ۹۴۰ھ / ۱۵۳۴ء کو رہگرائے عالم جاودانی ہوئے ؛

شاہ دلاور خلیفۂ پنجم دلپت رائے والی گوڑ کے بھانجے ہیں ۔ جب سلطان حسین شرقی نے حضرت سید محمد کی مدد سے ولایت گوڑ فتح کی ۔ آپ غنیمت کے ساتھ گرفتار ہو کر آئے ۔ اس وقت آپ کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی ۔ سلطان کی بہن سلیمہ خاتون نے جو لاولد تھیں ان کو اپنا متبنی کر لیا ۔ ان کو جب سے کلمۂ لاالٰہ الا اللہ کا الہام ہوا تھا ۔ تب ہی سے آپ مجذوب رہتے تھے ۔ جب آپ مہدی کے حضور میں پہنچے ہیں اس وقت آپ وضو کر رہے تھے ۔ ان کو دیکھتے ہی فرمایا ۔ یہ دلاور نہیں شاہ دلاور ہے ۔ یہ میرا مقبول اور خدا کا مقبول ہے ۔ اسی روز سے آپ شاہ دلاور کے نام سے پکارے جانے لگے ۔ جب مہدی اپنے سفروں میں دانا پور سے آگے بڑھے ۔ شاہ دلاور کے پاؤں ٹھیر نہ سکتے تھے ۔ اس لئے آپ کو میاں دراج کی مسجد میں چھوڑ دیا گیا ۔ میاں دراج ان کی خبر گیری کرتے ۔ جب مہدی حج سے فارغ ہو کر احمد آباد تشریف لائے ۔ اس وقت شاہ دلاور ہوش میں آئے اور سولہ سال کے بعد احمد آباد پہنچ کر آپ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور اس کے بعد تا وفات مہدی ساتھ رہے ۔ اور ایک ساعت کے واسطے بھی جدا نہ ہوئے ۔ مہدی نے بہت بشارتیں آپ کے حق میں کی ہیں اور بی بی رحمتی کا نکاح آپ کے ساتھ کیا ۔ شاہ دلاور ۲ ر ذیقعدہ ۹۴۵ھ / ۱۵۳۸ء کو بور کھیڑ میں جو اورنگ آباد سے تین منزل شمال و مغرب میں کنڑ گھاٹ کے اس پار ہے ۔ انتقال کرتے ہیں ؛

سید محمد کے بعد مہدوی فرقہ ان کے خلفاء و دیگر تابعین کی مساعی سے برابر ترقی کرتا رہا خصوصاً شیخ علائی کے ذریعہ سے جو ایک بڑی جوشیلی طبیعت اور تیز زبان کے بزرگ تھے ۔ اسلام شاہ کے عہد میں ۹۵۵ھ / ۱۵۴۸ء میں شہید ہوتے ہیں ۔ جمال خاں

مہدوی کے اثر میں نظام شاہی خاندان کا چھٹا بادشاہ اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ ثانی ۹۹۷ھ/۱۵۸۸ء و ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء مذہب مہدویہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس زمانہ میں مہدوی فرقہ کو بڑا فروغ ہوا۔ شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ ایک مہدوی سردار مع اپنی جماعت کے متعین تھا کسی مذہبی بحث کی بنا پر آپس میں فساد ہو گیا۔ اور آخر شہزادہ کی فوج کے ہاتھ سے مع اپنے متبعین کے مارا گیا۔ سلطان ٹیپو کے پاس بہت سے مہدوی افغان ملازم تھے۔ ایک بار عدول حکمی کی بنا پر کئی سو مارے گئے اور باقی کا اخراج کر دیا گیا۔ سردار غڑے زئی مہدوی ملازم باجے راؤ والی پونا اپنے آقا کی ممانعت کے باوجود انگریزی چھاونی پر حملہ کرتا ہے۔ جس سے باجے راؤ کا علاقہ ضبط ہوتا ہے۔ اور انگریز باجے راؤ کو ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں گرفتار کر کے بطور پہنچا دیتے ہیں۔ راجہ چندو لال کے دور میں حیدر آباد مہدوی گروہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ وہ دس بارہ ہزار کی تعداد میں بمشاہرۂ بیش قرار ملازم رکھ لیے جاتے ہیں۔ اور اتنا اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ کہ بے باکانہ مذہبی بحثیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ۱۲۳۷ھ میں مولوی عبدالکریم کو مذہبی بحث کی بنا پر میر عالم بہادر کی مسجد میں قتل کر ڈالتے ہیں۔ جس کی بنا پر شہر میں فساد برپا ہو گیا اور بہت سے سنی اور مہدوی مارے گئے۔ نواب سکندر جاہ نے انگریزی فوج کی امداد سے ان کو ملک سے نکالا +

فی زمانہ اس فرقہ کے پیروؤں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہو گی۔ گجرات تو گویا اس جماعت کا زاد و بوم ہے۔ اس لئے گجرات اور بمبئی احاطہ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ راجپوتانہ و ممالک متوسطہ میں ان کی متعدد بستیاں ملتی ہیں۔ ریاست پالن پور کا مذہب کئی پشتوں سے مہدوی ہے۔ اور اس کے علاقہ میں ہزاروں مہدوی آباد ہیں۔ مدراس پریسیڈنسی دکن و کرناٹک مرہٹہ و تلنگانہ ملیبار وغیرہ علاقوں میں بڑی تعداد میں پائے جاتے اور شاید بیرون ہند میں بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں

اب ہم مرکزی شاخ سے قطع نظر کر کے اس کی ایک دورافتادہ شاخ کا ذکر کرتے ہیں۔ جو ریاست جے پور کے جاگیرداران راجہ صاحبان کھنڈیلہ کے علاقہ میں آباد ہے اور دائرہ کے نام سے مشہور ہے۔ فقراء کے تکیوں اور خانقاہوں کو دائرہ بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ مہدوی جو اپنے آپ کو فقرائے مہدی کہتے ہیں اپنی قیام گاہوں کو بھی اسی مناسبت سے دائرہ کے نام سے یاد کرنے لگے۔ اہلِ دائرہ کی مرکزی شخصیت میاں مصطفےٰ ہیں۔ جن کے حالات سوائے بدایونی کے ایک مختصر بیان کے عام طور پر نامعلوم ہیں۔ اور شاید یہ پہلا موقعہ ہے۔ جو اُردو میں شائع ہو رہے ہیں۔ میں سب سے پہلے بدایونی کا بیان دیتا ہوں۔ اس کے بعد عبدالمحمد کی مثنوی فیض عام سے جو ۱۱۸۱ھ میں مولنا شیخ آدم کی ایک فارسی تالیف پر مبنی ہے مختصر حالات یہاں درج کرتا ہوں۔

میاں مصطفیٰ گجراتی

از منتخب التواریخ

اصلاً بوہروں کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو صوبۂ گجرات میں تجارت میں مشغول ہیں۔ میر سید محمد جونپوری کے ایک بے واسطہ مُرید سے طریق فقروفنا سیکھا اور آخر عمر تک اس پر راسخ رہے۔ جب [اکبر] بادشاہ تسخیر بنگالہ کے بعد پٹنہ سے مراجعت فرمائے اجمیر ہوئے۔ آصف خاں ثانی میر بخشی حسب فرمان شاہی انہیں گجرات سے اپنے ہمراہ لایا۔ ایک رات صحن دیوان خانہ میں علما کو بلا کر شیخ مصطفیٰ سے مسئلہ مہدویت کے متعلق تحقیقات شروع کی۔ وہ جواب دیتے رہے مناظرہ میں دیر لگی اور حاجی ابراہیم سرہندی بحث کے وقت اپنی مذموم عادت کی بنا پر تحکم کرتا اور شیخ کو آزار دیتا۔ بندہ نے جو کچھ شرح گلشن راز میں پڑھا تھا تفصیلاً

نقل کیا۔ شرح لہٰذا شیخ محمد لاہجی کی تصنیف ہے۔ جو میر سید محمد نوربخشی کے بالواسطہ مرید ہیں۔ میر نے بھی اپنے زمانہ میں مہدویت کا دعوے کر کے بہت فتنے کھڑے کئے تھے۔ چونکہ یہ امر شیخ کے مدعا کے خلاف تھا۔ اس سے شاید ان کو ملال پہنچا ہو۔ فتح پور پہنچنے پر حکم دیا کہ شیخ چند روز خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کے مکان پر رہیں میں اپنی اس تقصیر کی عذرخواہی کے واسطے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی مانگی۔ ان کو بے حد ضعف تھا۔ اسی مجلس میں طشت منگوایا اور بہت خون ان کے منہ سے گرا۔ جب گجرات جانے کی اجازت ملی۔ غالباً راستے میں یا اپنے وطن پہنچ کر اس دار فانی سے رحلت فرما ہوئے۔ یہ واقعہ ۹۸۳ھ میں پیش آیا۔ شیخ کے مکتوبات موجود ہیں۔ جن سے غربت و فنا کی بو آتی ہے۔ عاملہ اللہ بلطفہ۔

ص ۱۵۰۔ منتخب التواریخ جز و سوم طبع ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

از فیض عام

جب میران مہدی بڈلی میں مقیم تھے۔ آپ کی خدمت میں ایک بزرگ اویس نامی حاضر ہوے۔ یہ میاں مصطفیٰ کے دادا تھے۔ آکر مہدی پر ایمان لے آئے۔ جب مہدی کی وفات کے بعد جماعت مہدیہ مختلف دائروں میں تقسیم ہوگئی۔ ان دائروں میں ایک دائرہ کے پیشوا سید خوندمیر تھے۔ اویس کے بھائی قطب جہاں ان کی خدمت میں حاضر ہوے۔ میاں مصطفیٰ ان کے نواسے ہیں۔ میاں اویس کے فرزند کا نام عبدالرشید تھا۔ شہر پٹن میں آپ بحیثیت ایک فاضل متبحر کے مشہور تھے۔ قطب جہاں اور میاں عبدالرشید سید خوندمیر کی خدمت میں آنے جانے لگے۔ شیخ قطب جہاں نے اپنی دختر بلند اختر میاں عبدالرشید کے نکاح میں دے دیں۔ جن کے پیٹ سے میاں مصطفیٰ پیدا ہوے۔

جب میاں مصطفیٰ بالغ ہوے۔ ان کو خدا کا حکم ہوا کہ تم سید خوندمیر کی پیروی کرو

چنانچہ ان کا دستور تھا۔ کہ تلقین دیتے وقت "بحرمت سید خوندمیر" ضرور فرماتے۔ گویا ان کا سلسلہ میاں سید خوندمیر سے چلتا ہے۔ میاں مصطفےٰ کے چھ بھائی تھے (۱) میاں ملتجیٰ (۲) میاں مرتضیٰ (۳) میاں مجتبیٰ (۴) شیخ آدم (۵) حضرت عماد (۶) شاکر محمد۔

میاں بڑے خدا والے اور توکل پیشہ تھے۔ ان کے والدین کے پاس کچھ جائداد بوجہ میراث تھی۔ میاں نے ان سے تقاضے پر تقاضا کرنا شروع کیا۔ کہ آپ اس جائداد کو راہ خدا ترک کردیں۔ کیونکہ حضرت مہدی نے اپنی جماعت کو یہی ہدایت کی ہے۔ کہ "تم پر ملک و میراث حرام ہے"۔ رسول اللہ نے بھی دنیا کو مُردار کہا ہے۔ جس کا طالب ہمیشہ ذلیل وخوار ہے۔ دنیا گناہوں کا راز ہے۔ اور ترکِ دنیا بندگی کا راز ہے۔ مہدی کا قول ہے۔ کہ ایمان بغیر ترکِ دنیا حاصل نہیں ہوتا۔ ان کی یہ باتیں سُن کر والدین نے جواب دیا۔ کہ ہم میں دنیا چھوڑ دینے کی ہمت نہیں اور نہ ہم توکل پر قادر ہیں۔ ہمیں ان امور سے معاف کرو۔ آخر میاں کو کہنا پڑا کہ اگر آپ میری عاجزانہ درخواست قبول نہیں کریں گے۔ تو میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔ والدین کا جواب تھا۔ کہ اگر ہمارے ساتھ رہو تو ہمارے سر آنکھوں پر اگر جاؤ تو فضلِ خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو۔ الغرض میاں مصطفےٰ والدین سے جدا ہو پٹن سے کوچ کر کے اندری گاؤں میں آبسے۔ یہ ایک چھوٹا سا موضع تھا۔ طالبانِ خدا آکر ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ ایک مدت کے بعد میاں عبدالرشید ان سے ملنے آئے اور بیٹے کی موجودہ زندگی سے متاثر ہو کر ترکِ دنیا پر عازم ہوگئے۔ اور فقیری لے کر بیٹے کے پاس آکر رہنے لگے۔ ایک عرصہ کے بعد انہوں نے میاں مصطفےٰ سے کہا کہ اندری نہایت چھوٹا موضع ہے۔ یہاں فقیروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے مناسب سمجھو تو پٹن چل رہیں۔ کیونکہ اب جو امور تمہاری ناخوشی کے موجب تھے خدا نے اپنے فضل سے رفع کر دیئے۔ تجویز معقول تھی۔ میاں مان گئے۔ سب کو ساتھ

سے کر پٹن شہر میں آ گئے۔ اور تالاب سہسلنگ پر دائرہ باندھ کر رہنے لگے۔ ان کے دائرہ میں پندرہ سو فقیر تھے۔

جب میاں مصطفےٰ کی شہرت ہوئی۔ اور ان کے پاس مُریدوں کی رجوعات ہونے لگی۔ اس عہد کے علماء نے ان پر حسد کرنا شروع کیا۔ اور بادشاہ کو لکھا کہ ملک میں کامل فساد ہونے والا ہے۔ شیخ زادہ نے مہدوی مذہب اختیار کر لیا ہے اور اپنے عقیدہ کی دوسروں کو دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ پولادی قوم اور پٹھانوں بلکہ بعض علماء اور بے شمار دیگر اشخاص نے یہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔ بادشاہ پر فرض ہے۔ کہ اس کی جلد تدبیر کریں۔ جب یہ خط بادشاہ کے پاس پہنچا۔ اس نے کہا۔ کہ مصطفےٰ مہدوی نے مخلوق خدا کو گمراہ کیا ہے۔ میں خود اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کر کے دین کی خدمت بجا لاؤں گا۔ اور یہ جواب دینے کا حکم دیا کہ میں خود آتا ہوں شاہی لشکر میں کئی اشخاص میاں کے مرید تھے۔ انہوں نے فی الفور ایک خط کے ذریعہ سے اطلاع دی کہ بادشاہ وقت نے کہا ہے۔ کہ میں مصطفےٰ مہدوی کو قتل کروں گا۔ اس لئے آپ کی خدمت میں گذارش ہے۔ کہ آپ شہر پٹن کی سکونت ترک کر کے کسی اور جگہ تشریف لے جائیں۔ ظالم سے کنارہ کرنا بھلا ہے۔ میاں نے یہ مکتوب پڑھ کر اپنے تمام مریدوں اور فقیروں کو بلوایا اور وہ خط سنایا۔ پھر کہا۔ کہ میرا ارادہ تو یہی ہے۔ کہ میں اپنی جگہ پر قایم رہوں۔ اگر بادشاہ نے دلیل و حجت مانگی۔ میں جواب دوں گا۔ اگر وہ میری جان کا طالب ہے۔ تو میں مسرت کے ساتھ اپنی جان دینے کو تیار رہوں۔ مُریدوں کا جواب تھا۔ کہ ہم سب آپ کے فرمان کے تابع ہیں۔ جس طرح آپ کی مرضی ہو کیجئے۔ ہم اپنی جانیں آپ پر قربان کرنے کے واسطے مستعد ہیں۔ اکبر بادشاہ کوچ در کوچ فتحپور سیکری سے گجرات پہنچے۔ شیر خاں ایک امیر پٹن میں رہتا تھا۔ جو میاں کا مرید تھا۔ اس کو جب

بادشاہ کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس نے میاں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو ایک مرتبہ اور سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ آپ یہاں سے کنارہ کر جائیں مگر میاں کا فیصلہ اٹل تھا۔ ان کے عزم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ شیر خاں تو پٹن چھوڑ کر چلا گیا۔ جب اکبر کو اس کے جانے کا واقعہ معلوم ہوا۔ اس نے فوراً دریا خاں کو شہر پر قبضہ جمانے کے لئے بھیج دیا۔ اور حکم دیا کہ ہمارے نام کا خطبہ پڑھا جائے دریا خاں میاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قدمبوسی کی اور بولا کہ بادشاہ آپ کے قتل کے لئے آ رہے ہیں۔ بہتر ہے۔ کہ آپ اس وقت ٹل جائیں۔ میاں نے جواب دیا۔ نواب! تمہاری محبت مجھ کو معلوم ہو گئی۔ مگر میں متوکل ہوں اور خدا پر میرا آسرا ہے۔ اکبر ڈیسے آ پہنچے۔ جو پٹن سے تین فرسنگ ہے اس جگہ تمام علماء بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے پیشوا نے جسے میاں سے قدیمی عداوت تھی بادشاہ کے سامنے اپنی پگڑی اتار کر پھینک دی اور بولا کہ مصطفےٰ مہدوی نے ہماری پگڑیاں اتار دی ہیں۔ بادشاہ نے اسے تسلی دی اور اپنی کمر کا پٹکا کھول کر اس کے سر پر بندھوایا اور بولا کہ بس اب میں اسے مارتا ہوں عثمان خاں ایک نیازی پٹھان تھا۔ وہ میاں کا بھی معتقد تھا۔ بادشاہ نے اسے پٹن رعیت کی تسلی کے لئے بھیجا۔ وہ بڑی دھوم سے آیا اور شہر میں ڈیرا لگا دیا آدھی رات کو نوکروں کے ساتھ میاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک کوتل گھوڑا ساتھ لایا اور عرض کی۔ خدارا۔ آپ اسی وقت کسی طرف کو نکل جائیں۔ یہ گھوڑا سواری کو حاضر ہے۔ مگر میاں کے ارادہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اکبر پٹن پہنچ گئے علما[1]

---

[1] یہ اشارہ ہے۔ اکبر کی دوبارہ روانگی گجرات کی طرف جو مرزاؤں کی بغاوت اور خان اعظم کے احمد آباد میں محصور ہو جانے کی بنا پر وقوع پذیر ہوئی۔ جس کو عبد المومن نے اپنے پیشوا کے قتل کی مہم سازی سے تعبیر کیا ہے۔ اکبر سنیچر کے دن ۲۴ ربیع الآخر ۹۸۱ھ کو فتحپور سے روانہ ہو کر نو روز میں احمد آباد پہنچا ہے۔

عرض کی کہ مصطفےٰ مہدوی اسی شہر میں مقیم ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ اچھا کل مابدولت اسے بلائیں گے۔ انہوں نے پھر عرض کی کہ اس کا حضور میں بلایا جانا مصلحت نہیں اس کے بے شمار معتقد ہیں۔ اگر سب کے سب قلعے میں آگھسے۔ تو اُن سے عہدہ برآ ہونا بہت دشوار ہو جائے گا۔ مناسب یہی ہے۔ کہ وہیں فوج بھیجکر اسے قتل کرا دیا جائے۔ اکبر نے خفا ہو کر کہا۔ تمہارا مذہب تحقیقات کئے جانے کے بغیر قتل کا حکم دیتا ہے۔ اس پر علماء نے سکوت اختیار کیا۔

دوسرے روز صبح کو چوبدار بھیج کر بادشاہ نے میاں مصطفےٰ کو بلایا۔ میاں فوراً عصا لے کر روانہ ہو گئے اور پیچھے مریدوں کا ایک جم غفیر ہو لیا۔ بادشاہ جھروکے میں بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ اتنے بڑے ہجوم کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔ دل میں کہنے لگے۔ کہ علماء سچ کہہ رہے تھے۔ اگر یہ لوگ قلعہ میں گھس آئیں۔ تو ان کا سنبھالنا مشکل ہو گا۔ اسی وقت چوبدار سے کہا کہ جاؤ کہہ دو سب واپس جائیں۔ شاہی حکم ہے۔ میاں کو جب یہ حکم ملا مع اپنے مریدوں کے لَوٹ گئے۔ اب عالموں کو موقعہ مل گیا۔ بولے ہم نے کل درست عرض کی تھی مصطفےٰ محض درویش نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مرتبہ امرا سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ دوسرے دن۔ بادشاہ نے چوبدار بھیج کر میاں کو کہلا بھیجا کہ اکیلے آئیں۔ میاں بلا عذر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور فوراً چوبدار کے ساتھ ہو لئے۔

جب قریب پہنچے۔ بادشاہ کے ہاتھ میں ایک بڑا لیمو تھا۔ جب اس نے میاں پر نظر ڈالی۔ اسے بیٹھنے کی تاب نہ رہی۔ لیمو کو اچھالا اور اسے جھیلنے کے بہانے فوراً کھڑا ہو گیا اور یوں میاں کی تعظیم دی۔ ساتھ والے چوبدار نے میاں سے کہا۔ بے ہر جو فرش پر کھڑے ہیں۔ بادشاہ سلامت یہی ہیں۔ تم تسلیمات بجا لاؤ میاں نے کہا۔ ابھی تو آگے بڑھو۔ جب دوسری ڈیوڑھی پر پہنچے چوبدار نے پھر کہا۔

اب کورنش بجالاؤ۔ سامنے بادشاہ سلامت کھڑے ہیں۔ میاں بولے اور آگے بڑھو جب تیسری ڈیوڑھی آگئی چوبدار پھر بولا۔ فرش پر جو استادہ ہیں اعلیٰ حضرت ہیں۔ آپ بندگی بجالائیے۔ یہ کہتا ہوا وہ اپنی جگہ جا کھڑا ہوا اور میاں آگے بڑھ گئے۔

جب بادشاہ کے بالکل قریب پہنچے۔ بولے میں سلاطین کے ادب آداب سے ناواقف محض ہوں۔ درویش ہوں۔ سنت نبی جانتا ہوں۔ اس لئے سلام علیکم کہتا ہوں اے نیکنام بادشاہ اکبر نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور وعلیکم السلام جواب دیا اور کہا آگے آئیے۔ جب فرش کے پاس پہنچے۔ جوتا اتارنے لگے۔ بادشاہ نے کہا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ جوتے پہنے آجاؤ۔ دیکھو میں نے بھی تو جوتے پہن رکھے ہیں۔ چنانچہ میاں جوتوں سمیت فرش پر پہنچ گئے۔ اب بادشاہ نے کہا کہ آپ کی طرف جادو ٹونا نسبت کیا جاتا ہے۔ میاں نے جواب دیا۔ رسول اللہ پر بھی یہی تہمت لگائی گئی تھی۔ مخلوق کی زبان سے نہ خدا بچا ہے نہ خدا کا رسول بچا ہے میں تو ایک ادنےٰ انسان ہوں۔ بادشاہ کو یہ جواب پسند آیا۔ پھر سوال کیا کہ مجھے علماء کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ تم مہدویوں کا یہ دستور ہے۔ کہ جب تمہارے دائرہ میں کسی کی بہو بیٹی آجاتی ہے۔ تم اپنے ہاں اس کا نکاح کر لیتے ہو۔ اور کہتے ہو۔ کہ خدا کا یہی حکم ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی بھینس بکری یا بیل اونٹ گھوڑا بھولے سے تمہارے دائرہ میں آجاتا ہے۔ تم فوراً اسے پکڑ لیتے ہو اور کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے ملی ہے۔ میاں نے جواب دیا ایسے امور تو مخفی نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم ایسے عملوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ شہر پٹن ایک چھوڑ دو قاضی موجود ہیں۔ ان سے تو نہیں چھپ سکتے۔ اعلیٰ حضرت اِن سے دریافت کریں۔ اتفاق سے دونوں قاضی بادشاہ کی خدمت میں حاضر تھے۔ بادشاہ نے ایک قاضی سے پوچھا۔ وہ میاں کا حاسد تھا۔ اس نے کہا۔ مجھ میں یہ طاقت نہیں۔ کہ اِن کے خلاف بات کر سکوں

نہ کسی اور کی تاب ہے۔ یہ سن کر بادشاہ نے جواب کے لئے میاں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہا۔ دوسرا قاضی اور ہے۔ اس سے بھی تو دریافت کیا جائے یہ قاضی راست گو اور عادل تھا۔ اس نے عرض کی۔ کہ اے بادشاہ یہ تو نامی گرامی میاں مصطفےٰ ہیں۔ میرا منہ نہیں کہ ان کی تعریف کر سکوں۔ ان کے سبب سے بے شما مخلق نے ترک دنیا کر کے رہ ہو لالی ہے۔ بلکہ بارہ ہزاری۔ شش ہزاری۔ یالصدی اور دو صدی امرا اپنا اپنا منصب چھوڑ کر ان کے پیرو ہو گئے ہیں اور یہ با سپہی دو پچی نوبے تعداد ہیں۔ جو ان کو اپنا ہادی سمجھتے ہیں۔ جس شخص نے فقر لے لیا ہو۔ اور توکل پر عامل ہو۔ اس سے نا واجب افعال کیونکر سرزد ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ میاں مصطفےٰ کی شکایت کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت یقین رکھیں کہ وہ مفتری ہیں۔ بادشاہ بولے میں سمجھ گیا۔ علماء آپ پر حسد کرتے ہیں۔ میاں نے برادران یوسف کے حسد کا ذکر کیا اس پر بادشاہ نے کہا۔

میں نے یہ قصہ سنا تو ہے۔ لیکن میں آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ میاں نے کہا۔ آپ اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ آپ کی وجہ سے تمام لوگ کھڑے ہیں۔ یہ بھی بیٹھ جائیں۔ بادشاہ نے کہا۔ پہلے آپ بیٹھیں پھر میں بیٹھوں گا۔ یہ سن کر میاں مصطفےٰ بیٹھ گئے۔ بادشاہ بھی ان کے سامنے مودب بیٹھ گئے۔ میاں نے اس وقت ولی نعمت کو پاس بلوایا اور ان سے سورۂ یوسف پڑھوائی اور میاں تفسیر بیان کرنے لگے۔ گویا ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ بادشاہ عالم سکوت میں سنتے رہے۔ آخر ان پر اس قدر اثر ہوا کہ زار و قطار رونے لگے۔ شیخ عبدالنبی جو بادشاہ کے مرشد تھے اور قاضی یعقوب ملک القضاۃ کہیں علحدہ بیٹھے ہوئے تھے ان کا نائب بادشاہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے جب یہ معاملہ دیکھا فی الفور ان کے پاس پہنچا۔ اور بولا۔ کہ تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ غضب ہے۔ کہ بادشاہ میاں

مصطفٰی کے معتقد ہو جائیں۔ دونوں اٹھے۔ شاہی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے کہ وقت بہت گذر چکا ہے۔ اور میاں کو بھی آئے دیر ہو گئی ہے اب ان کو رخصت دیجئے۔ وہ پھر آ سکتے ہیں۔ بادشاہ ان کا کہنا ملتے تھے۔ یہ الفاظ سنکر ہنسے اور میاں مصطفٰی سے کہا کہ لشکر کے لوگ ظالم ہیں ممکن ہے کہ میرے بعد وہ آپ کو ایذا پہنچائیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ پٹن چھوڑ کر کسی اور گوشہ میں چلے جائیں تاکہ ان کے ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ جب مجھ کو ذرا فرصت ملے گی میں آپ کو بلواؤں گا میاں رخصت ہوئے اور پٹن چھوڑ کر موربی میں رہنے لگے۔ اکبر نے گجرات فتح کر کے خان اعظم کو اس کا صوبہ دار بنایا اور ہدایت کی کہ جس وقت میں تمہیں بلاؤں۔ اور دوسرا صوبہ دار بھیجوں۔ تم میاں مصطفٰی کو اپنے ساتھ لے کر آجانا۔ بادشاہ یہ ہدایت دے کر آگرہ کی طرف راہی ہوئے۔ میاں مصطفٰی موربی میں مع اپنے فقیروں کے فقر و فاقہ کے پنجہ میں اسیر تھے۔ ایام رمضان کے اندر ان کے تین سو ساٹھ فقیر فاقوں سے ہلاک ہو گئے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی ؛

موربی سے تین کوس پرے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں ایک امیر فتح خان نامی رہا کرتا تھا وہ میاں کے فقیروں کو بڑا لالچ دیتا۔ کہ اگر میرے پاس آجاؤ۔ تو میں تمہیں بڑے آرام سے رکھوں۔ ۔۔۔ اور پلاؤ کھلاؤں حلوا کھلاؤں اور دوسری لذیذ نعمتیں آگے دھروں۔ جب تک دل چاہے رہو۔ اور جب جانے لگو۔ ہر ایک کو ایک ایک اشرفی دندان مزد کے طور پر دے کر رخصت کروں لیکن میاں کے فقیروں میں سے کسی نے بھی اس کی طرف رخ نہیں کیا ؛

خان اعظم نے ایک روز امین سنجر کو حکم دیا۔ کہ جا کر موربی پر شاہی عمل قائم کرو اور جب فارغ ہو کر آنے لگو۔ میاں مصطفٰی کو اپنے ساتھ لیتے آنا۔ کیونکہ بادشاہ نے بلوایا ہے۔ امین سنجر حسب الحکم موربی پہنچا اور میاں کے پاس ایک آدمی کے ذریعہ

کہلا بھیجا۔ کہ مجھے علم خاں سے لڑائی درپیش ہے۔ آپ خدا کے کامل ولی ہیں۔ آپ اطمینان کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ اور تشویش نہ کریں۔ جب یہ پیغام میاں کے پاس پہنچا۔ انہوں نے ایک معنی خیز نگاہ کے ساتھ اپنے فقیروں کی طرف دیکھا شاہی فوج بسر کردگی ابن سنجر مورلی آئی۔ علم خاں سے جنگ ہوئی اور وہ میدان میں مارا گیا اس کے تینوں بیٹے گرفتار ہوئے۔ فتح کے بعد ابن سنجر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ کہ اِن فقیروں کو آزار دو۔ چنانچہ انہیں طرح طرح سے ستایا گیا۔ مثلاً اگر کسی کے پاس نیا لباس دیکھا چھین لیا۔ اگر کسی نے احتجاج کی۔ اِسے مارا پیٹا۔ ایک دن خود ابن سنجر فوج لے کر دائرہ کے قریب آگیا۔ مسجد میں جا کر بیٹھا اور میاں مصطفےٰ کو بلا کر بولا کہ میری سرکار کے دو غلام بھاگ آئے ہیں۔ اور مجھے پتا چلا ہے۔ کہ وہ تمہارے دائرہ میں موجود ہیں۔ تم انہیں جلد حاضر کرو۔ ایسے موقعوں پر تمہارا کیا دستور ہے۔ میاں نے کہا۔ ہمارے ہاں اگر ایسا معاملہ پیش آتا ہے تو ہم ڈھنڈی پٹوا دیتے ہیں۔ ڈھنڈی پٹنے سے تمام لوگ آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ڈھنڈی پٹوا دی گئی۔ اور لوگ آکر جمع ہونے لگے۔ جب سب آچکے۔ میاں نے مغل سے کہا اگر تم اپنے غلام پہچان سکتے ہو پہچان لو۔ ہمارے لوگ سب موجود ہیں۔ ابن سنجر کا مقصد کچھ اور تھا۔ اسے یہ دیکھنا تھا کہ اہل دائرہ کی طاقت کتنی ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ قلیل تعداد میں ہیں اور شاہی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ وہ لوگ دائرہ کے اندر گھس گئے اور لوگوں پر زیادتیاں کرنے لگے۔ حضرت عماد میاں مصطفےٰ کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ بڑے جوانمرد اور غیرت مند تھے۔ انہوں نے آکر میاں کے کان میں کہا۔ کہ مغلوں کے طور بے طور معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ہمیں اجازت دے دیں۔ کہ انہیں مار پیٹ کر نکال دیں۔ صرف آپ کے حکم کا انتظار ہے۔ میاں نے فرمایا صبر رکھو اور دیکھو خدا کو کیا منظور ہے

کچھ توقف کے بعد انہوں نے پھر عرض کی۔ آپ نے وہی جواب دیا میاں کا
ایک فقیر خدمتگار تھا۔ اس کے پاس میاں کی تلوار رہتی تھی۔ ایک مغل نے آکر اس
تلوار پر قبضہ کرنا چاہا۔ خادم نے قبضہ نہ چھوڑا۔ دونوں میں کشمکش ہونے لگی میاں نے
دیکھا اور پوچھا کیا ماجرا ہے؟ خادم نے کہا۔ یہ مغل آپ کی تلوار میرے ہاتھ سے چھیننا
چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تم یہ تلوار اُس کے حوالے کر دو۔ مجھے اس کا رکھنا۔
منظور نہیں۔ خادم نے تلوار فوراً چھوڑ دی۔ میاں عماد نے تیسری مرتبہ لڑائی کی
اجازت مانگی۔ آپ نے گرم ہو کر فرمایا۔ کہ ہیں خدا کا کہنا مانو یا تمہارا۔ تم لڑائی پر تلے ہو
ادھر خدا کا حکم ہے۔ کہ تسلیم سے کام لو۔ مغل نے میاں سے کہا کہ اب تم ہمارے
ساتھ چلو۔ آپ فوراً اس کے ساتھ ہو لئے۔ دائرہ کی تمام عورتیں آپ کے پیچھے
پیچھے آنے لگیں۔ ایک شخص نے آکر آپ کو خبر دی۔ آپ نے فرمایا جاؤ اور ان کو
روک دو اور کہہ دو کہ دائرہ میں بیٹھیں۔ اگر ہماری زندگی ہو گی آملیں گے ورنہ الوداع۔
اگر تم کو کوئی آزار دے۔ تم اس کو خدا کی عنایت سمجھو۔ اگر کوئی تمہاری جان
اس کے نام پر لے گی۔ تم اپنی جان دے دو۔ یہاں کی سختی ہنگامی ہے گذر جائیگی
عاقبت میں اس کا اجر ملے گا۔ یہاں کی تکلیف دم بھر کی ہے۔ وہاں ابدالآباد تک
بہشتوں میں رہنا ہو گا۔ یہ نصیحتیں سن کر عورتیں روتی ہوئی دائرہ میں لوٹ گئیں
میاں مصطفےٰ مغل کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مغل نے اپنی فرودگاہ پر پہنچ کر میاں
سے کہا کہ تم اپنے فقیروں کو کہہ دو کہ باہر ٹھہریں۔ اور تم تن تنہا میرے ساتھ آؤ۔ آپ نے
مریدوں کو وہیں روک دیا۔ اور خیموں میں داخل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر مغل نے
شمشیر برہنہ کی اور غصہ کے لہجہ میں کہا کہ مہدی سے انکار کر ورنہ ابھی تیرا لاشہ
زمین پر پھڑکتا ہو گا۔ آپ نے نہایت متانت سے کہا۔ کہ مہدی آئے اور چلے
گئے۔ اور اب کوئی مہدی نہیں آئے گا۔ دو مرتبہ مغل نے آپ سے مہدویت سے

برگشتہ ہونے کے لیے کہا سنتے ہی میں آپ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور کڑک
کر بولے۔ دیوانے کب بار بار بچوں کی طرح بات کی تکرار لگا دی ہیں جو کہتا ہوں
نہیں سنتا۔ تجھے جو برا لگے ہو سو اللہ کر۔ اس پر مغل نے تلوار پھینک دی اور
بولا کیا کروں۔ شاہی حکم نہیں ورنہ یہاں سے تو زندہ نہ جاتا۔ یہ کہہ کر مغل باہر آیا
اور میاں کے مریدوں سے بولا کہ میں تمہارے پیر کو ہلاک کر آیا ہوں۔ اب تم
مہدی سے برگشتہ ہو جاؤ میں تمہیں بادشاہ سے منصب اور مرتبہ دلواؤں گا۔
سب نے انکار کیا اور بولے۔ کہ مہدی آیا اور گیا اور آئندہ نہیں آئے گا اس
وقت مغل نے عثمان خاں کو اپنے پاس بلایا عثمان اپنے عقیدہ میں نہایت راسخ
تھا جب وہ ترک کر کے جماعت مہدویہ میں شامل ہوا تھا۔ اس نے بارہ من سونا لٹایا
تھا مغل نے اس سے کہا کہ تو تو شاہ و دربار شاہ کا روشناس تھا اور تمام شاہی
امرا سے واقف۔ خود ایک جلیل القدر امیر تھا۔ تو کہاں کن ان بھکاریوں میں شامل
ہو گیا۔ اس عقیدہ سے تائب ہو میں تجھے بادشاہ کی خدمت میں لے جاؤں گا۔
اور بڑا مرتبہ دلاؤں گا۔ عثمان نے جواب دیا۔ تو مجھے دنیا کا لالچ کیا دلاتا ہے دنیا
میرے پاس بہت تھی میں نے اسے ناپاک سمجھ کر ترک کیا۔ خدای پاک نے میری
ساری مرادیں پوری کیں۔ اور اس سے بڑی مراد کیا ہو گی۔ کہ محمد کا کلمہ نصیب کیا۔
دوسری نعمت مہدی کی تصدیق روزی کی۔ خدا کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ میاں
مصطفے سا مرشد مجھ کو دیا۔ اب صرف ایک آرزو باقی ہے وہ یہ ہے۔ کہ مہدی کے
مقدس نام پر قربان ہو جاؤں۔ مغل نے بگڑ کر اپنے کسی آدمی کو اشارہ کیا۔
اس نے تلوار کا ایک ہاتھ ایسا مارا کہ عثمان جیسا صادق العقیدہ انسان شہید ہو
کر زندہ جاوید بنا۔ اس کے بعد مغل نے میاں ناصر خان موسیٰ اور عیسیٰ کو باری
باری بلایا اور مہدی سے منکر نہ ہونے پر سب کو موت کے گھاٹ اتارا۔ بوڑھے میاں

عبدالرشید سب سے پیچھے تھے۔ ان کی پیرانہ سالی اور ضعف و ناتوانی دوسروں کے برابر چلنے سے مانع تھی۔ ان کے فرزند ان کے ساتھ تھے۔ جو ان کا ہاتھ پکڑے کھینچتے ہوئے لا رہے تھے۔ ان کا نام شاکر محمد تھا۔ وہ میاں مصطفٰے کے سگے بھائی تھے۔ شاکر نے فقیروں کے کٹے سر دیکھ کر کہا۔ باواجان! معلوم ہوتا ہے کہ میاں مصطفٰے کو جام شہادت پلا دیا گیا۔ اب ہمارا بھی آخری وقت آگیا۔ میاں عبدالرشید ضبط نہ کر سکے۔ خواجہ سنجر کو بلند آواز میں کہنے لگے۔ ظالم تو بڑا کمبخت ہے کہ تو نے ایسی ذات پر ہاتھ اٹھایا۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور بولے کہ ہدی تو آئے اور گئے۔ مغل نے جیسے ہی یہ الفاظ سنے بے تاب ہو کر دوڑا اور بیک ضرب شمشیر آپ کو موت کی نیند سُلا دیا۔ تب شاکر محمد بڑھے اور بولے۔ اب میری باری ہے۔ مغل نے کہا۔ مجھے تیری جوانی پر رحم آتا ہے۔ آپ بولے اگر تو مجھے قتل کئے بغیر آگے بڑھے گا۔ میں قسم دلاتا ہوں کہ تجھ پر جو چیز حلال ہے حرام ہو اور تیری ماں کا دُودھ تجھ پر حرام ہو۔ مغل پلٹا اور ایک ہاتھ چھوڑا۔ پیشانی پر گہرا زخم آیا۔ آپ تیورا کر زمین پر گر پڑے۔ کوئی دو تین گھڑی سانس چلتا رہا۔ پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ باقی فقرا کو قید کر دیا گیا۔ ان میں میاں مصطفٰے اور ان کے فرزند شاہ عبداللہ بھی تھے۔ سب کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ اب فوج دائرہ میں گھس گئی۔ اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ میاں مصطفٰے کی صاحبزادی کی تلاش ہوئی۔ مریدنیوں میں ایک نیک بی بی تھیں امتوا نام تھا۔ وہ سمجھیں کہ مرشد زادی پر یہ لوگ زیادتیاں کریں گے۔ جھٹ بول اٹھیں کہ وہ صاحبزادی میں ہوں۔ اور مغل سے پوچھا۔ کہ بھیا تم کیا چاہتے ہو۔ امت الکریم میاں کی صاحبزادی ادھر سے بول اُٹھیں۔ کہ میاں مصطفٰے کی اصلی صاحبزادی یہ نہیں میں ہوں۔ مغل نے کوڑا اٹھایا۔ اور فارسی زبان میں کہا کہ مجھے روپیہ بتاؤ۔ بی بی امت الکریم فارسی

نہیں جانتی تھیں۔ اپنی دوا سے پوچھنے لگیں۔ کہ یہ مغل کیا کہتا ہے۔ دوا نے
سمجھایا کہ وہ تو مال کے واسطے پوچھتا ہے۔ بی بی نے مغل کو جواب دیا کہ ہمارا خزانہ
اور ہماری دولت میاں مصطفےٰ ہیں۔ ان کے سوا ہمارے پاس کوئی اور مال و
دولت نہیں۔ مغل کو اس جواب پر طیش آیا۔ بی بی کی چٹیا پکڑ لی۔ ان کی گود میں
بچہ تھا۔ آخر وہ اسی حال میں ایک ہاتھ سے بی بی کی چٹیا پکڑے ہوئے گھوڑے
کو ایڑ دے کر لشکر میں پہنچ گیا۔ کبھی بی بی کے پاؤں زمین پر گھسٹتے کبھی اُدھر ہو
جاتیں۔ اسی طرح مغل وہاں پہنچا۔ جہاں بی بی امۃ الکریم کے بھائی قید تھے بھائی
نے بہن کو اس حال میں دیکھا۔ مگر تسلیم سے کام لیا۔ قصہ مختصر مغل اس طرح تمام
عورتوں کو پکڑ کر لے گئے اور لے جا کر لشکر میں الگ الگ قید کر دیا۔ میاں
ان کے بھائی اور فرزند ایک جگہ قید تھے۔ جب عشا کا وقت ہوا۔ میاں نے نماز
عشا ادا کی اور فارغ ہو کر تسبیح بآواز بلند پڑھی۔ فقیروں اور عورتوں نے جو مختلف
جگہ لشکر میں قید تھے۔ میاں کی آواز پہچان لی۔ اور تسبیح کا جواب اسی طرح بلند
تسبیح سے دیا۔ جس سے فوج میں ایک شور مچ گیا۔ سپاہی یہ آواز سُن کر حیران رہ
گئے۔ اور بولے کہ یہ مہدوی بھی عجیب قسم کے انسان ہیں۔ نہ چھپانے سے چھپتے
ہیں۔ نہ ڈرانے سے ڈرتے ہیں۔ نہ جان دینے سے ان کو خوف ہے چھوٹے
بڑے سب کے سب اپنے عقیدہ پر ثابت قدم ہیں۔ ہم نے ایسے لوگ نہیں
دیکھے۔ اس قدر ان کو عذاب دیا اور کتنوں کو بے دردی کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔
مگر ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ اس امر کی خواجہ نظر سے رپورٹ ہوئی۔
وہ متحیر رہ گیا۔ آخر اس نے حکم دیا کہ ان سب کو بھاگسی میں بند کر دو۔ چنانچہ سب کو
بھاگسی میں ڈال کر اوپر سے تالا ٹھوک دیا۔ ایک عورت اتفاق سے باہر رہ گئی۔
وہ دربان کی رات بھر منت سماجت کرتی رہی کہ مجھے بھی بھاگسی میں اپنی بہنوں کے

پاس پہنچا دے۔ دربان حکم کا بندہ تھا۔ نہ مانا۔ عورتوں کو تین روز برابر بھاگسی میں رکھا
پھر ان کو رہا کر دیا گیا۔ ان عورتوں نے میاں کی خدمت میں پیام بھیجا۔ کہ اب ہمارے
لئے کیا حکم ہوتا ہے۔ میاں نے جواب بھیجا۔ جہاں خدا تمہیں لے جائے۔ جاؤ
اور مشیت ایزدی کے خلاف کوئی حرف زبان پر نہ لاؤ۔ میں تم کو رخصت کرتا ہوں
جب یہ جواب عورتوں تک پہنچا۔ زار زار روئیں اور ایک دوسرے سے رخصت ہو
کر جس کے جہاں سینگ سمائے چلی گئی ❊

ماہ رمضان کی چھبیسویں تاریخ کو خواجہ سنجر نے حضرت عماد کو بلایا۔ وہ اپنے
بھائی محمود کو ساتھ لے کر گئے۔ مغل نے حسب معمول کہا کہ مہدی سے منکر ہو جاؤ۔
ان کا وہی جواب تھا کہ مہدی تو آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ امین سنجر یہ جواب
سن کر نہایت برہم ہوا۔ اپنے خادم کو اشارہ کیا کہ کھڑا کیا تماشہ دیکھتا ہے۔ اسے
قتل کر۔ خادم تلوار لے کر ان کی طرف بڑھا۔ مگر انہوں نے اس اندیشہ سے مبادا
محمود مجھے قتل ہوتا دیکھ کر مہدی سے بدل جائیں۔ مغل سے کہا کہ پہلے تو میرے
ساتھی کو قتل کر۔ اس نے محمود پر وار کیا۔ ادھر سے عماد نے ان کی ہمت بندھائی
اور کہا کہ یہ امتحان کا وقت ہے۔ حوصلہ نہ چھوڑو اور ثابت قدم رہو۔ یہ مصیبت
ایک پل میں ختم ہو جائے گی اور عقبےٰ میں ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے تمہیں نعمتیں
ملیں گی۔ محمود نے جواب دیا۔ بھائی صاحب آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ اگر مہدی کے
واسطے میری بوٹی بوٹی جدا کر دی جائے گی۔ تو میری بوٹی بوٹی سے مہدی امنّا کی
صدا نکلے گی۔ بالآخر دونوں بھائیوں کو شہید کر ڈالا۔ ادھر میاں مصطفٰے اور میاں جی مبارک
کو شکنجے میں کس دیا۔ جس سے ان کے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹنے لگا۔ مگر دونوں اپنے
عقیدے میں راسخ رہے۔ جب پیادوں نے دیکھا کہ ان کی حالت غیر ہو رہی ہے
اور موت کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے خواجہ سنجر کو خبر دی کہ یہ لوگ قریب المرگ

ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ کھول دو اور معمولی قید میں رکھو۔ چند روز کے بعد خواجہ سنجر اپنے قیدیوں کو لے کر احمد آباد آگیا۔ یہاں خان اعظم نے علماء کو بلایا اور میاں مصطفےٰ کو بلوایا۔ مجلس مباحثہ گرم ہوئی۔ مگر یہ مباحثہ اس مختصر میں نہیں آسکتا۔ اس لئے حذف کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد خان اعظم نے میاں کے قتل کے خیال سے فوج و لشکر آراستہ کیا۔ داریں نصب کرائیں۔ اور ہاتھی منگوائے اور میاں سے کہا۔ کہ یہ تمہارے قتل کے سامان ہیں۔ اس امتحان میں بھی میاں پورے اُترے اور ان کے عقیدے میں کوئی تزلزل نہیں آیا۔ آخر خان اعظم نے انہیں معمولی قید میں رکھا۔ ایک روز ایک رحم دل مغل آیا۔ اس کا دل مہر و شفقت سے معمور تھا۔ اس نے میاں کے قید و بند۔ ان کے باپ بھائیوں کی شہادت اور دائرہ کی تباہی پر بڑا افسوس کیا اور بولا بہت بُرا ہوا۔ میاں نے اس کی ہمدردی قبول نہ کی۔ گوجری زبان میں دیل کا ریختہ ان کے اس وقت کے خیالات و جذبات کا آئینہ دار ہے۔ جو دو فارسی نظموں کے ساتھ میاں نے انہی ایام میں لکھا تھا۔

ریختہ

وے چوکیں جو کہیں برا ہوا   ات دُہل جو نبیوں سیں پڑے
ہور ولیوں سوں بھی آی اٹے   ہم اس پنتھ چالیں کھڑے کھڑے
جو پیو جی ہمسوں نہیں جوا   وے چوکیں جو کہیں بُرا ہوا +
کیا ہوا ہم جو بہر نک ہوے   کوئی تروا روں کوئی بھوکہ موے
کوئی رہے سو پر جوے جوے۔
جو پیو جی ہمسوں نہیں جوا   وے چوکیں جو کہیں بُرا ہوا +
کیا ہوا جو مغلوں بند پڑے   لے کپڑے جو بیڑیوں مانہہ جُڑے
جوں چور سو آگل کٹی کھڑے

جو پیو جی ہمسوں نہیں جوا وے چوکیں جو کہیں بُرا ہوا +
کیا ہوا جو لوگوں برے کہے کیا ہوا جو دُکھ میں سُوک رہے
کیا ہوا جو کروت سبس بہے
جو پیو جی ہمسوں نہیں جوا وے چوکیں جو کہیں بُرا ہوا +
کیا ہوا جو ہارے بہت ہے کیا ہوا جو ساتھی چھوڑ چلے
کیا ہوا جو اس پنتھ چلے بہے
جو پیو جی ہم سوں نہیں جوا وے چوکیں جو کہیں بُرا ہوا +

ایسا پھیری وقت پڑ جانے کے باوجود میاں کا دل مگن ہے۔ خدا سے لو لگ رہی ہے اور نہایت شگفتہ روئی سے کہتے ہیں۔ خدا دارم چہ غم دارم۔

نوشتۂ بالا ریختہ سے ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے۔ جس کا میاں کے سوانح نگار نے ذکر نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس تباہی کے وقت ان کے مریدوں کی ایک جماعت نے ان سے بے وفائی بھی کی ہے۔ اور جدائی اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ

مصرع کیا ہوا جو ساتھی چھوڑ چلے

میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ یہی جذبہ ان کے ایک فارسی مخمس میں بھی ہے۔ جس سے بخوفِ طوالت میں صرف دو پہلے بند یہاں نقل کرتا ہوں۔ عبدالصمد اس کی نسبت لکھتا ہے:۔

غزل ریختہ کی شل بے بدل میاں نیں کہی سو سنو دراصل
زباں فارسی میں جو بولے صحی لکھوں میں سنو کاندھر تم وہی

چہ شد گر مبتلا گشتم بتاریکی و تنہائی چہ شد گر زخمہا خوردم ز دست چرخ مینائی
چہ شد گر روی آوردم بوادیہای غربتہا چہ شد گر خلق پیدا (گشت) بدخوئی و بدرائی

تو خوشنودی اگر از من از نیہا ہیچ غم نبود   چو تو داری نظر سویم خوشیہا ہیچ کم نبود

چہ شد گر جمع یارانم جدا گشتند در ہر سو   چہ شد گر دوستدارانم شدہ بیچارہ بر ہر سو
چہ شد گر نیشہا خوردم بہر رنگی بہر صورت   چہ شد گر جملہ عالمہا شدہ در باب من بدخو
تو خوشنودی اگر از من از نیہا ہیچ غم نبود   چو تو داری نظر سویم خوشیہا ہیچ کم نبود

میاں مصطفٰے اپنی بربادی اور قید و بند کو اسی محبوب ازلی کی ایک ادا سمجھتے ہیں اور اپنے مدعیوں اور آزار دہندوں کے افعال کی اسی ہمہ اوستی انداز میں ترجمانی کرتے ہیں۔ میں ان کی فارسی غزل کے چند شعر جو فیض عام میں درج ہیں یہاں نقل کرتا ہوں۔ ان شعروں میں بعض ایسے نام بھی ملتے ہیں۔ جن کا مذکور ان کے سوانح نویس نے نہیں کیا۔ وہو ہذا :-

ندیدہ کس بدینساں دل ستانی   کہ ہر لحظہ نماید نو نشانی
گہی چون میرزا در گفت و در پیچ   گہی در خشم چون خان کلانی
گہی بدخوی چون قلیچ محمد   گہی شیریں زبان چون شیر خانی
گہی چون خواجہ سنجر بر سر قتل   گہی مرغوب شکلی میرزبانی
گہی بد خلق ہمچوں میر تولک   گہی خوش خوی چون حلوا نشانی ؟
گہی چون نقطہ ظاہر ؟ حسینی   گہی چون مرتضای مہربانی
گہی ملان صفت در بحث و در جنگ   گہی درویش روشیرین زبانی
گہی با وحشت ؟ اندر حبس و زندان   گہی ہمچون محبت پاسبانی

میاں کے یہ تبرکات اشعار کی شکل میں اوپر درج ہیں۔ سب سے بڑا وصف ان کا یہ ہے۔ کہ حالی ہیں نہ خیالی ۔

آمدم بر سر قصہ۔ جب اکبر بادشاہ اجمیر پہنچ گئے۔ نیا صوبہ دار وہاں سے احمد آباد بھیج دیا۔ اور خان اعظم کو بلالیا۔ خان اعظم میاں مصطفےٰ اور میاں عبد اللہ کو لے کر چلے۔ جب جالور سے گذرے وہاں میاں سید محمود کا دائرہ تھا۔ ان کے ایک فقیر نے میاں مصطفےٰ اور میاں عبد اللہ کو دیکھ لیا اور جاکر سید محمود کو خبر دی۔ انہوں نے پوچھا۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے مشورہ دیا۔ میاں کو چھڑانا چاہیئے۔ اگر وہ خوشی سے نہ چھوڑیں تو لڑکر چھڑانا چاہیئے۔ یا دائرہ چھوڑکر ہمیں بھی ان کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ سید محمود نے کہا۔ ایسا کوئی اقدام کرنے سے پیشتر ہمیں میاں سے بھی تو پوچھ لینا ضروری ہے کہ ان کی کیا رائے ہے۔ چنانچہ اسی فقیر کو میاں کے پاس بھیجا گیا۔ انہوں نے کہا۔ اے دوست تم جاکر سید سے پوچھو کہ تمہارا یہ ارادہ تمہاری اپنی فکر کا نتیجہ ہے۔ یا خدا کے حکم سے؟ سید نے کہلا بھیجا کہ یہ میری اپنی تجویز ہے۔ نہ حکم الٰہی۔ یہ جواب آنے پر میاں نے کہلوایا کہ اندریں حالات مجھے اپنے حال پہ چھوڑ دو اور خدا کے سپرد کرو؛

خان اعظم مع الخیر اجمیر پہنچ گئے۔ اور میاں مصطفےٰ کو لے کر دربار شاہی میں حاضر ہوے۔ بادشاہ کی نظر میاں پر پڑی تعظیم کے لئے اٹھا۔ کچھ دور بڑھا اور بڑی محبت سے میاں سے معانقہ کیا اور میاں عبد الرشید کی خیریت دریافت کی میاں نے جواب دیا کہ ان کو گجرات میں رکھا گیا ہے۔ اسی وقت ایک راست بیان امیر پہنچا۔ اس نے میاں عبد الرشید کی شہادت اور اہل دائرہ پر تمام جور و مظالم کی تفصیل بادشاہ کے گوش گذار کی۔ اکبر نے غضب ناک ہوکر پوچھا کہ یہ ظلم کس کے ہاتھ سے عمل میں آیا۔ امیر موصوف نے کہا کہ خواجہ سنجر ان مظالم کا ذمہ وار ہے اکبر نے کہا۔ اوہو۔ سنجر مطلق العنان ہوگیا ہے۔ پھر اس نے ایک شخص کو حکم دیا کہ جاکر سنجر کو پکڑ لائے۔ کہ معلوم تو ہو اس نے کس کے حکم سے یہ ستم توڑے۔

سنجر کا وکیل دربار میں موجود تھا۔ اس نے جاکر یہ اطلاع اس کو پہنچادی۔ سنجر یہ قصہ سن کر ایسا نا۔ ۔ ہوا کہ پھر اکبر کی خدمت میں نہیں گیا۔ بادشاہ نے میاں کو (خواجہ) عبدالصمد کے حوالے کیا اور تاکید کر دی کہ نہایت احترام سے رکھنا۔ خواجہ عبدالصمد میاں کو ساتھ لے کر اپنے گھر چلے۔ راستہ میں خیال آیا۔ کہ شاہی حکم ہے کہ تم انہیں عزت سے رکھنا۔ ادھر یہ حال ہے۔ کہ میاں قید وبند میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے واپس دربار میں پہنچے اور طوق وزنجیر کے کاٹنے کی اجازت حاصل کی۔ الغرض اٹھارہ مہینوں کے بعد میاں مصطفٰےؔ قید سے چھوٹے۔ جب بادشاہ فتحپور سیکری پہنچے میاں کو ساتھ لے گئے۔ وہاں پہنچ کر علماء کو بلایا اور میاں کو بلاکر مجلس مناظرہ منعقد کی۔ مناظرہ کئی روز تک جاری رہا۔ اس کی تفصیل ایک رسالہ کی صورت میں خود میاں مصطفٰےؔ نے بیان کی ہے ؎

بادشاہ نے ایک روز سو اشرفیاں اور پرکالہ کا تھان میاں کو دیا۔ اشرفیاں باہر نکل کر انہوں نے لٹا دیں۔ پھر بادشاہ نے ہنڈون کے قریب جھوٹو وارہ ایک گاؤں میاں کی جاگیر میں دینا چاہا۔ آپ نے قبول نہیں کیا اور بولے کہ میراث تو مہدی کی ٹولی پر حرام ہے۔ بادشاہ نے میاں کے فقیروں میں سے میاں اسمٰعیل اور ملک جی خضر کو بلاکر سمجھایا۔ کہ میاں کو گاؤں قبول نہیں ہے۔ تم ان سے خفیہ یہ گاؤں لے لو اور اس کا حاصل میاں کی اولاد پر صرف کرو۔ فقیر خاموش رہے۔ بادشاہ نے گاؤں کا پٹہ لکھ دیا۔ یہ گاؤں اتنا بڑا تھا۔ کہ اس میں تین سو کولھو تھے۔ ان امور سے میاں کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ اور خلق اللہ کا مرجع بن گئے۔ لوگوں کی رجوع کی یہ حالت تھی۔ کہ جمعرات کے دن فتحپور شہر میں مٹھائی نہیں ملتی تھی۔ لوگ حلوائی سے دریافت کرتے۔ وہ کہتا آپ کو معلوم ہو آج دنیا میاں مصطفٰےؔ کی خدمت میں تلقین ہونے گئی ہے۔ اس لئے پان اور شیرینی نہیں ملتے میاں کی

یہ بڑھتی شہرت دیکھ کر عالموں کو حسد آیا اور شکایت لے کر عبدالنبی کے پاس پہنچے۔ اور بولے۔ یہ ظلم تم نے کیا ہے۔ جو مصطفےٰ مہدوی کو یہاں بلوایا اور اسلام میں اتنا بڑا رخنہ پیدا کیا۔ تم بادشاہ کے مرشد ہو۔ اب بھی کوئی تدبیر کرو۔ دیکھتے نہیں کہ ہم رات دن انگاروں پر لوٹتے ہیں۔ عبدالنبی نے میاں کو بلا کر ملامت کی۔ اور گھر میں قید کر دیا۔ اس حالت میں چار دن گذر گئے۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر اکبر تک پہنچ گئی۔ کہ عبدالنبی نے میاں کو قید کر دیا ہے۔ اکبر کو بہت طیش آیا۔ کہ میرے حکم کے بغیر ان کو قید کر دیا۔ اسی شخص نے عبدالنبی کے پاس عالموں کے جانے اور شکایت کرنے کا تمام قصہ کہہ سنایا۔ بادشاہ نے ایک چاکر عبدالنبی کے پاس بھیج کر پچھوایا۔ کہ تو نے کس کے حکم سے میاں کو قید کیا ہے۔ عبدالنبی کا وکیل دربار میں موجود تھا۔ اس نے پہلے سے پہلے جاکر اپنے آقا کو اطلاع دے دی۔ عبدالنبی متحیّر رہ گیا۔ اسی وقت میاں مصطفےٰ کے پاس آیا اور بولا کہ آپ فوراً اپنے ڈیرے تشریف لے جائیں۔ میاں نماز عشا پڑھ کر ابھی بستر پر دراز ہوئے تھے۔ بولے۔ اب تو میں نہیں جا سکتا۔ میری طبیعت خراب ہے۔ عبدالنبی نے کہا۔ کہ آپ کے واسطے پالکی تیار ہے۔ اس میں بیٹھ کر تشریف لے جائیے میاں نے کہا۔ میں کبھی پالکی میں نہیں بیٹھا اور نہ بیٹھوں۔ عبدالنبی نے کہا بہلی موجود ہے۔ اس ہی جائیے۔ اس کی یہ تشویش دیکھ کر میاں اُٹھے اور بہلی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ اتنے میں بادشاہ کا نقیب آیا اور میاں کے متعلق دریافت کیا۔ عبدالنبی نے کہا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ میاں میرے ہاں قید ہیں۔ وہ اپنے گھر موجود ہیں۔ جاکر دیکھ لو ؛

چند روز کے بعد میاں بادشاہ سے رخصت ہوکر بیانہ کی طرف روانہ ہونے لگے۔ انہوں نے اپنے فرزند اور فقیروں کو بلایا اور کہا کہ جلد مجھے بیانے پہنچاؤ۔

فتحپور کے لوگوں کا ان پر کچھ قرض بھی تھا۔ انہوں نے بے باقی کے لئے تقاضا کیا۔ میاں نے کہا۔ اس وقت تو ادائگی مشکل ہے۔ مگر تمہاری تسلی کے واسطے ہم قبیلہ اور دو آدمی چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے ہی ہمیں فتوح کی رقم کہیں سے پہنچی تمہارے قرضہ کی رقم بھجوا دیں گے اور اپنے قبیلہ کو بلوالیں گے۔ اس سے قرضخواہوں کی تسکین ہو گئی۔ میاں کے جسم پر قید و تشدد کی کافی علامات موجود تھیں۔ بدن میں طاقت مطلق نہیں رہی تھی۔ ان کو پلنگ پر لٹایا اور لے نکلے ذیقعد کی ۱۴ ار کو فتحپور سے چلے۔ بیانہ پندرہ کوس تھا۔ جب وہاں پہنچے۔ آموں کے ایک جھنڈ میں آپ کا پلنگ اتارا اور عرض کی۔ یہ مقام بڑا پُر فضا ہے۔ حکم ہو تو ٹھہر جائیں۔ میاں نے فرمایا۔ آگے بڑھو۔ الغرض اس طرح مُریدوں نے کئی جگہ تھم تھم کر پوچھا۔ آپ ہر مرتبہ یہی کہتے رہے کہ آگے بڑھو۔ چلتے چلتے شہر کے مغرب میں تین تیر پرتاب کے فاصلہ پر آ گئے۔ یہاں آم اور گولر کے درختوں کے جُھنڈ تھے۔ میاں کو یہ جگہ پسند آئی۔ پلنگ اتارا اور رہ پڑے۔ رات کو فتح خاں نے قرض کے متعلق دریافت کیا۔ جب رقم معلوم ہو گئی۔ بولا۔ کہ خدا نے کچھ رقم بھیجی ہے بہتر ہے۔ کہ اس سے قرضہ ادا کر دیا جائے۔ چنانچہ فوراً فتحپور کو آدمی دوڑا دیا۔
یہ مہینے کی اٹھارویں تاریخ تھی۔ ۱۹ ار کو مہدی کے عرس کے روز سوا پہر دن چڑھے سنہ ۹۸۴ھ میں باون برس کی عمر میں میاں مصطفٰے جنت کو سدھارے۔ جب دفن سے فراغت ملی۔ اس وقت قبیلہ کے لوگ فتحپور سے پہنچے۔ آخری ملاقات نہ ہو سکی۔

میاں عبداللہ

میاں مصطفٰے کے خلیفہ ان کے فرزند میاں عبداللہ ہوئے۔ یہ تمام مصائب

میں اپنے والد کے شریک رہے۔ بڑے مبارک ذات اور صاحب کرامات تھے۔
انہوں نے فقیروں کو بلا کر ہر ایک کی تشفی کی۔ کچھ دن گذرے تھے اور میاں مصطفیٰ
کی جدائی کا داغ ابھی تازہ تھا۔ کہ کسی نے میاں عبداللہ سے کہہ دیا۔ کہ فلاں فلاں
فقیر نے بادشاہ سے گاؤں قبول کر لیا ہے۔ میاں عبداللہ نے دونوں کو اپنے
سامنے طلب کیا اور پوچھا۔ انہوں نے گاؤں لینے کا اقرار کیا اور کہا کہ بادشاہ
نے ہماری درخواست کے بغیر از خود عنایت کیا۔ جب مانگے بغیر ملا لے لیا
میاں جی بولے۔ اگر میاں مصطفیٰ کو علم ہو جاتا۔ یقیناً تم کو نکال دیتے۔ اب
بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم گاؤں سے دست بردار ہو جاؤ۔ انہوں نے جواب دیا کہ
ہم گاؤں چھوڑنے کے لئے طیار نہیں۔ جو بھائی ہمارے ساتھ رہیں گے۔ ہم
گاؤں کی آمدنی ان کے ساتھ بانٹ لیا کریں گے۔ اور میاں کی قبر کے مجاور
رہیں گے۔ میاں عبداللہ بہت خفا ہوئے۔ اور بولے۔ جہاں کہیں ملک و
املاک کا تعلق ہو گا۔ بندہ نہیں رہنے کا۔ اگر تم یہ گاؤں نہیں چھوڑتے۔ میں یہاں
سے رخصت ہوتا ہوں۔ مریدوں نے دریافت کیا کہ یہاں سے نکلے۔ تو پھر
کہاں جا کر رہیں گے۔ میاں نے جواب دیا۔ میں سنتا ہوں۔ رانا کے علاقہ میں
مسلمان کی مطلق عزت نہیں۔ میں وہاں جا کر رہوں گا۔ تاکہ خدا کے سوا کوئی بھی
ہماری عزت نہ کرے۔ فقیروں نے کہا۔ اور پہنو گے کیا۔ جواب دیا۔ اس علاقہ
میں ساگوان کا درخت ہوتا ہے۔ جس کے بڑے بڑے پتے ہوتے ہیں۔ ستر
چھپانے کے واسطے ایک پتہ کافی ہو گا۔ مریدوں نے کہا۔ آپ کو جانے کا اختیار
ہے۔ مگر ہم نہیں جائیں گے۔ میاں نے کہا۔ تم اپنی مرضی کے مختار ہو۔ چند
روز میں یہاں رہوں گا۔ میاں کی وفات کو ابھی چالیس دن نہیں گذرے۔
دوسرے روضے کی تیاری میں بھی کام باقی ہے۔ اس کے بعد میں یہاں قم بھر

نہیں ٹھہروں گا۔ سب نے کہا۔ جب آپ کا دل چاہے سدھاریں۔ ادھر مُریدین
نے علیحدہ کونسل کی اور یہ فیصلہ کیا۔ کہ اگر ہم سب متفق رہیں گے۔ میاں بوجہ
نوعمری ہم کو چھوڑکر اکیلے نہیں جائیں گے۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سال تھی۔
جب میاں مصطفیٰ کی وفات کو چالیس یوم گذر گئے۔ اور روضہ کا کام بھی ختم ہوچکا
میاں نے سفر کی تیاری کی۔ خرچ کی فکر تھی۔ خدا نے اسی وقت کچھ فتوح بھیج
دی۔ مریدوں کو بلاکر کہا کہ یہ روپیہ لو اور بازار سے میرے واسطے ایک گھوڑا
خرید لاؤ۔ انہوں نے کہا۔ آپ ہماری مرضی کے خلاف سفر کو جاتے ہیں اسلئے
ہم تو تعمیل ارشاد نہیں کریں گے۔ غرض میاں جی خود بازار گئے اور ایک بیل
خرید کر لائے۔ اس پر گدڑی ڈالی۔ بیوی کو سوار کیا۔ اور بیل کی ڈور ہاتھ میں
پکڑے پکڑے روانہ ہو گئے۔ مرید مرد اور عورت یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جب
آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس وقت بیچلے نامی فقیر بے تاب ہوگیا اور پیچھے
دوڑا۔ جب میاں کے پاس پہنچ گیا۔ ہاتھ جوڑکر عرض کی۔ آپ کسی صورت
سے بھی یہاں رہیں گے۔ میاں نے کہا۔ جہاں دنیا کا تعلق ہوگا۔ میں نہیں ہونگا
بیچلے بولا۔ جب آپ یہاں نہیں رہتے۔ تو میں یہاں رہ کر کیا کروں گا۔ چلئے
جہاں مخدوم کی مرضی ہو۔ بیچلے کے بعد باقی فقیروں نے ایک ایک دو دو کرکے
آنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ تمام مُرید چلے آئے۔ بیانہ میں صرف وہی دو فقیر
رہ گئے۔ جنہوں نے بادشاہ سے گاؤں قبول کیا تھا۔ میاں نے عورتوں اور بچوں
کے خیال سے آہستہ آہستہ سفر کیا۔ اور کئی روز کے بعد آنبیر پہنچے۔ آنبیر کا راجہ
بادشاہ کا نوکر تھا۔ اس کا نام مان سنگھ تھا۔ وہ میاں مصطفیٰ اور میاں عبداللہ سے خوب
واقف تھا۔ آنبیر میں اس کا ایک وزیر تھا۔ جو ذات کا سنگھی تھا۔ جب راجہ کو میانجی
کے آنبیر پہنچنے کی اطلاع ملی۔ اور یہ بھی علم ہوا کہ وہ رانا کے علاقہ میں آباد ہونے کی

نیت سے جارہے ہیں۔ اس نے اپنے وزیر کو خط لکھا۔ جس میں مرقوم تھا۔ کہ میاں جی عبد اللہ رانا کے علاقہ میں جانے کی غرض سے مسافرانہ آکر آنبیر میں ٹھہرے ہیں۔ تم ان سے درخواست کرو۔ کہ وہ آنبیر میں ہی رہ پڑیں سنگھی یہ خط پاکر سیدھا میانجی کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑے عجز و الحاح سے آنبیر میں رہنے کی درخواست کی۔ میانجی نے اس کی درخواست کو مان لیا۔ سنگھی بہت مدارات سے پیش آیا۔ تحفے تحایف بھیجے اور دائرہ کے واسطے موضع ہاڈی پورہ میں زمین بتائی۔ دائرہ آباد ہوگیا۔ اور اس پر دو تین سال گذر گئے۔ اب میانجی اپنے والد کے روضہ کی زیارت کو بیانے تشریف لے گئے۔ زیارت و طواف سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے ان دونوں فقیروں کو بلایا اور کہا۔ میں سنتا ہوں۔ تم نے پادشاہ سے اور پٹہ لکھوایا ہے۔ لاؤ مجھے تو دکھاؤ۔ وہ پٹہ لائے۔ میانجی نے پڑھا۔ اس میں میاں مصطفےٰ کی اولاد کا نام درج تھا۔ میاں جی نے انہیں ملامت کی۔ کہ تم نے ستم کیا۔ جو میاں مصطفےٰ کی اولاد کے نام پر پٹہ لکھوالیا۔ آپ کو طیش آیا اور سند کو چاک کرکے تالاب میں پھینک دیا۔ اس کے بعد آنبیر کو روانہ ہوگئے اب وہ دونوں پٹہ دار فقیر بھی ہمراہ ہولئے ؛

آنبیر میں دمودر نامی ایک نیک ذات مہاجن رہتا تھا۔ جو میاں جی کی خدمت میں بھی آتا جاتا اور گاہ گاہ آپ کی نصیحت بھی سنتا۔ ایک دن میاں جی مبارک قیامت کا ذکر فرما رہے تھے۔ کہ گرد کی کثرت سے دنیا تاریک ہو جائے گی۔ تمام درخت اور پہاڑ گرد میں غائب ہوجائیں گے۔ دمودر نے قیامت کا یہ مذکور سنا۔ اس کے دل میں خدا کا خوف آیا۔ انہی دنوں میں اتفاق سے ایک شدید آندھی آئی۔ گرد اٹھی۔ درخت اور پہاڑ غائب ہوگئے۔ اور

دنیا پر تاریکی چھا گئی ۔ دمودر نے یہ کیفیت معائنہ کی ۔ سمجھا کہ قیامت نمودار ہو گئی ۔ اور دنیا کا خاتمہ آگیا ۔ خوف زدہ ہوا اور میاں جی کی خدمت میں حاضر ہو کر بولا ۔ کہ میں مسلمان ہوتا ہوں آپ مجھے راہ ہدایت بتائیں ۔ میاں جی نے اسے گلے لگایا ۔ کلمہ پڑھا کر مسلمان بنا لیا ۔ اور شیخ برہان نام رکھا ۔ یہ خبر بستی میں پھوٹی اور شیخ دمودر کے رشتہ داروں نے اسے فہمائش کی ۔ مگر وہ نہ مانا ۔ انہوں نے اسے قید و بند میں رکھا ۔ پھر بھی وہ اسلام سے نہیں پھرا ۔ آخر انہوں نے اسے پھانسی میں ڈال دیا ۔ اس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ جب اسے آزاد کرتے ۔ جھٹ میاں کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ۔ ایک روز اس نے عرض کی کہ میں اس قید و تشدد سے تنگ آگیا ہوں ۔ مجھے آپ سے جدائی کی تاب نہیں ۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ اپنے ہاتھ سے مجھے قتل کر دیں ۔ تاکہ اس دوگونہ عذاب سے چھوٹوں ورنہ یہاں سے کسی اور جگہ نقل مکان فرمائیں کہ میں زندہ رہ سکوں ۔ میاں نے اپنے فقیروں کو طلب کیا اور کہا ۔ دیکھو شیخ برہان نے ہماری خاطر اپنے قبیلہ اور رشتہ داروں کو ترک کر دیا ہے ۔ یہ انصاف نہیں ۔ کہ شیخ مصیبت بھریں اور ہم چین کی چڑیاں اڑائیں ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ کہ ہم یہاں کی سکونت ترک کر دیں ۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا اور شیخ برہان کو سمجھا دیا ۔ کہ ساتھ نہ آنا ۔ کچھ دن بعد موقع پا کر چلے آنا ۔ آخر وہ دن آیا ۔ جب میاں عبداللہ نے آنبیر کو خیرباد کہی ۔ کھنڈیلے کا راجہ رائے سل تھا ۔ اس کا کارندہ دئی داس تھا ۔ اس علاقہ میں پٹھانوں کی ایک بستی بھی تھی ـــــ پٹھانوں کو میاں کے ساتھ بہت محبت تھی ۔ ان کی آرزو تھی کہ میاں ہماری بستی میں رہنا قبول فرمائیں ۔ دئی داس سے بھی کہتے رہتے تھے ۔ کہ میاں جی کو کھنڈیلے لا کر آباد کرو ۔ آخر اس نے میاں جی کی خدمت میں ایک عرضداشت لکھی ۔ دو پٹھان

یہ عرضداشت لے کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں سے ایک کا نام خضر خان ترین اور دوسرے کا محمود خان شنوانی تھا۔ عرضی پیش کی اور زبانی منت وسماجت کی۔ میاں نے بالآخر کہا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا ؛

۹۹۹ھ ۱۵۹۰ء تھا۔ اور آنبیر میں رہتے پندرہ برس گذر چکے تھے۔ جب میاں نے ذیحجہ کا چاند دیکھ کر کھنڈیلہ کی طرف کوچ کیا۔ بچوں اور عورتوں کا ساتھ تھا۔ اس لئے کوچ بہت آہستہ ہوتا۔ پھر بھی ۹ ر ذی حجہ کو کھنڈیلے کے پاس پہنچ گئے۔ دو کوس کا فاصلہ باقی تھا۔ میاں نے ڈیرا کر دیا۔ پٹھان اطلاع دینے کو آگے بڑھے۔ دئی داس حاضر ہو گیا۔ ضیافت کی اور نذر دی۔ ۱۰ ر ذیحجہ کو کھنڈیلے سے مشرق میں بفاصلہ تین تیر پرتاب ایک تالاب کی پال پر ڈیرا ڈالا۔ درختوں کے نیچے عورتوں کی بہلیاں ٹھہریں۔ گیارہویں کو دئی داس آیا اور عرض کی۔ کہ دائرہ کے واسطے چل کر زمین دیکھ لیجئے۔ میاں نے دئی داس کے ساتھ پھر کر تمام زمین دیکھی۔ مگر سوائے اس زمین کے جہاں پڑاؤ تھا۔ کوئی جگہ پسند نہیں آئی۔ بولے۔ ہم تو یہیں آباد ہوں گے۔ دئی داس بولا۔ مبارک ہو۔ تالاب کے قریب پتھریلی زمین کی ٹیکری تھی۔ تھوہر کے درخت کثرت سے تھے۔ سب سے پہلے مسجد کے واسطے زمین انتخاب ہوئی۔ اس کے بعد مریدوں کو زمینیں ملیں۔ وہ اپنے اپنے گھر بنانے میں مشغول ہو گئے دئی داس نے اپنی عرضداشت میں راجا کو مفصل کیفیت لکھ دی۔ اس کا جواب آیا۔ کہ سب میں بڑا گاؤں جو عمدہ ہو اور خوب آباد ہو۔ خدا کے واسطے میاں کے نذر کر دو۔ دئی داس نے آکر عرض کی۔ میاں نے جواب دیا کہ اگر گاؤں لینا منظور ہوتا۔ تو اکبر بادشاہ سے کیوں نہ لیتے۔ پھر اس نے عرض کی۔ کوئی کنواں باوڑی تو قبول فرمایئے۔ آپ نے پھر نفی میں جواب دیا اور کہا البتہ ہمارے

آدمیوں کو جلانے کی لکڑی کے لیئے نہ روکا جائے۔ دنی داس نے کہا ۔ کہ راسل آباد کا سارا جنگل نیز بیٹا ہلا اور پال تیلکی با وڑی رای سل کی طرف سے میاں کے نذر ہیں ۔

کھنڈیلے میں آباد ہونے کی اطلاع جب شیخ برہان کو پہنچی ۔ کوئی بہانہ بنا کے اس نے جنگل کا راستہ لیا۔ اور کھنڈیلہ کا رخ کیا۔ رشتہ داروں کو جب اس کے غائب ہونے کی حقیقت معلوم ہوئی۔ سمجھ گئے کہ وہ ان مسلمانوں کے پیچھے گیا ہے۔ دو آدمی اس کی تلاش میں روانہ کئے۔ وہ اس کے کھوج نکالتے چلے اور راستے میں جا پکڑا۔ واپس چلنے پر مجبور کیا ۔ اس نے کہا۔ میں تمہیں یہ سونے کی انگوٹھی اس شرط پر دیتا ہوں ۔ کہ تم خاموشی کے ساتھ واپس چلے جاؤ اور میرے رشتہ داروں سے کہہ دو کہ میں نہیں ملا ۔ دونوں آدمی انگوٹھی لے کر لوٹ گئے ۔ برہان کے رشتہ داروں نے اور آدمی تلاش میں بھیجے۔ وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے چلے اور برہان کو ایک گاؤں میں جا پکڑا۔ برہان نے گاؤں کے ایک پٹھان سے مدد مانگی اور کہا کہ میں میاں جی مبارک بدن کا فقیر ہوں ۔ یہ لوگ میرے دشمن ہیں اور مجھے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔ پٹھان نے پناہ دے دی۔ اور پلنگ کے تلے رزائیاں گدیلے ڈال کر اسے چھپا دیا۔ برہان کے گرفتار کرنے والے آئے اور پٹھان کے گھر پر آکر شور مچا دیا کہ تم نے ہمارے غلام کو چھپا لیا ہے۔ پٹھان کو تلاشی دینی پڑی مگر برہان نہیں ملا۔ وہ بولے۔ کہ ہمارے چور کے کھوج تمہارے گھر تک آگئے۔ ہم اب شہر میں فوج بھیجنے جاتے ہیں ۔ تم سے فوج والے معاملہ فہمی کریں گے۔ ادھر برہان نے پٹھان سے کہا مجھے جلد از جلد میاں کے پاس پہنچا دو۔ پٹھان نے سواری کو گھوڑا دے دیا اور ایک آدمی ساتھ کر دیا۔ برہان بخیریت کھنڈیلہ پہنچ گیا۔ آخر پہنچ کر ان آدمیوں نے

حاکم کے سامنے شکایت کی ۔ کہ گاؤں میں ایک پٹھان رہتا ہے ۔ دامودر اس کے گھر میں گھس گیا اور پھر ہمیں نظر نہیں آیا ۔ ہمیں یقین ہے کہ اس پٹھان نے اسے کہیں غائب کر دیا ۔ حاکم نے فوج بھیج دی اور حکم دیا کہ گرفتار کر لاؤ ۔ فوج نے آکر پٹھان کا گھر گھیر لیا اور اس سے پوچھا ۔ اس نے کہا ۔ تمہارا آدمی آیا تو تھا مگر اب وہ کھنڈیلہ پہنچ گیا ہے ۔ سوار یہ سن کر آنبیر لوٹے اور حاکم سے رپورٹ کی ۔ حاکم نے کھنڈیلہ چٹھی لکھی ۔ کہ ہمارا غلام مال و متاع لے کر کھنڈیلہ بھاگ گیا ہے ۔ دمودر اس کا نام ہے ۔ تم اسے گرفتار کر کے بھیج دو ۔ یہ کتابت جب کھنڈیلہ میں دئی داس کے پاس پہنچی ۔ وہ پڑھ کر سہم گیا ۔ تحقیقات کر کے میاں کی خدمت میں آیا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی ۔ سنتا ہوں آپ کے پاس دمودر آیا ہے ۔ میری درخواست ہے ۔ کہ اسے آپ مجھے بخش دیں ۔ میرے پاس حاکم آنبیر کی چٹھی آئی ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ دامودر کو فوراً بھیج دو ۔ نہیں تو فوج لیکر کھنڈیلہ آتا ہوں ۔ مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکوں ۔ میاں نے یہ سن کر برہان کی طرف دیکھا ۔ برہان نے جواب دیا کہ میں نہ کسی کا چور ہوں نہ کسی کا غلام ہوں ۔ خدا کا بندہ ہوں ۔ آنبیر جانے کو تیار ہوں ۔ مجھ پر جو گذرے گی صبر سے برداشت کروں گا ۔ خدا میرا مالک ہے ۔ دئی داس نے دو آدمی اس کے ساتھ کر دیئے جو اسے آنبیر پہنچا آئے ۔ دامودر کے رشتہ داروں نے اس کے بیڑیاں ڈال دیں ۔ طرح طرح سے اس پر عذاب کرنے اور سچے دین سے برگشتہ کرنے کی کوششیں کرتے رہے ۔ مگر وہ ثابت قدم رہا ۔ ہر وقت کلمہ اور درود پڑھتا رہتا ۔ جہاں موقع پاتا ۔ ہڈی اٹھا لاتا اور رسوئی میں ڈال دیتا ۔ الغرض ایسی حرکتوں سے گھر والوں کو دق کرتا ۔ نہ ان کا پکایا کھاتا ۔ وہ بھی اس سے تنگ آگئے قرار دیا ۔ کہ اسے قید رکھنا بے سود ہے ۔ بہتر ہے کہ چھوڑ دیں ۔ چنانچہ اس کی

بیڑیاں کاٹ دیں۔ پھر اس کی بیوی کو بلایا اور کہا کہ اگر تم اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو جا سکتی ہو ہم نہیں روکتے۔ اور یہاں رہو تو یہ تمہارا گھر ہے۔ تم پر کوئی جور و جبر نہیں ہوگا۔ وہ بولی۔ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔ اس طرح برہان بھائی قید سے آزاد ہو کر کھنڈیلے میاں کے پاس پہنچ گیا۔ میاں جی مبارک بدن بہت خوش ہوئے۔ ان کی صحبت کے اثر میں اس نے الحمد پڑھنی سیکھ لی ؎

میاں عبداللہ کھنڈیلے آجانے کے بعد صرف سات سال اور زندہ رہے کل اٹھائیس سال عمر پائی۔ ۲۶ محرم ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء کو انتقال فرمایا۔ آپ کے دو فرزند تھے (۱) میاں امام جن کی عمر اس وقت چار سال کی تھی۔ (۲) شیخ عبدالوہاب جو تین سال کے تھے۔ میاں جی مبارک بدن پانچ بھائی تھے۔ (۱) شیخ یحییٰ (۲) شیخ احمد امام یہ تینوں ایک والدہ سے تھے۔ شیخ احمد نے جب تک میاں امام بالغ نہ ہوئے بھائی کی گدی سنبھالی۔ جب امام جوان ہو گئے خلافت ان کو مل گئی۔ امام کئی سال مسندِ ارشاد پر فائز رہے اور پچیس سال کی عمر میں جب ۱۰۶۳ھ / ۱۶۲۶ء تھا وفات کی۔ ان کے چھوٹے بھائی میاں عبدالوہاب جانشین ہوئے۔ گویا اصل خلافت میاں جی مبارک بدن کے بعد انہوں نے کی۔ آپ نے ایک مرتبہ آنبیر کا سفر کیا بھائی برہان کو بھی ساتھ لیا۔ برہان کے رشتہ داروں کو خبر ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ شیخ عبدالوہاب بہت خوب انسان تھے۔ تیئیس سال خلافت کر کے ۵ رمضان کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ انہوں نے تین فرزند چھوڑے (۱) میاں شیخ عماد (۲) میاں شیخ ملتجی (۳) میاں شیخ عبدالحلیم۔ میاں شیخ عماد کو خلافت ملی اور بیس سال کی عمر میں چار ماہ کم یا چار زائد مسند خلافت پر بیٹھے ؎

خلافت پہ بیٹھے سو حضرت عماد برس بیس ہور چار کم یا زیاد

وہ مریدوں پر باپ سے ... زیادہ شفیق اور مہربان تھے۔ یتیموں اور بیواؤں کے

خبر گیراں تھے۔ مہمان کی بڑی مدارات کرنے اور سخاوت میں تو گویا حاتم ثانی تھے۔ عمر بھر روپے پیسے کے ہاتھ نہیں لگایا۔ مسجد۔ باوڑی۔ باغ۔ حوض اور روضہ انہیں کی تعمیر سے ہیں۔ حج کا ارادہ کیا۔ پہلے فرہ پہنچ کر مہدی کی زیارت کی۔ پھر بیت اللہ گئے۔ ۲۵ ذی حجہ کو ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت کی۔ ان کے تین فرزند تھے۔ (۱) میاں شیخ عیسیٰ جو ابھی مسند ارشاد پر قایم ہیں۔ انہی کے دور میں مثنوی فیض عام از عبد الحمد ۹ شعبان ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء کو تالیف ہوئی ہے۔ جو ان صفحات کا ماخذ ہے۔ (۲) میاں شاکر مرحوم (۳) میاں مجتبیٰ جو بوقت تصنیف فیض عام زندہ ہیں۔ یہاں تک فیض عام ہماری ہادی تھی۔ باقی سلسلے کی تاریخوں و زمان حیات معلوم کرنے کے لئے ہمارے ذرایع معلومات ناکافی اور مختصر ہیں۔ فقیر اللہ بن عبد الرحمن بن عبد المجید بن عبد الشاکر بن عماد الدین بن عبد الوہاب بن شاہ عبد اللہ بن میاں مصطفےٰ کتاب بحر النکات تصنیف میاں عبد اللہ کی ایک نقل ۱۲۳۶ھ میں تیار کرتا ہے۔ خاتمہ سے بعد کے ورق میں اس نے بزرگان مہدویہ و خانوادۂ دائرہ کی تاریخیں غالباً اپنی طبع زاد درج کی ہیں۔ ان میں میاں عیسیٰ کی تاریخ وفات ۱۱۵۱ھ شعر ذیل کے پہلے مصرع سے برآمد ہوتی ہے ؎

"آن آفتاب دین حلیم چو ماہتاب"
ہادی الورا بحلم و شفقت رہ صواب

میاں عیسیٰ کے جانشین میاں محمد اسحاق ہیں۔ جو ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں فوت ہوتے ہیں۔ اور تاریخ وفات شعر ذیل کے مصرع اول سے معلوم ہوتی ہے ؎

"رہنماے دلکشاے کاملے صاحب صدر"
شاملے در حج اکبر خاص تا روز حشر

ان کے بعد میاں نجم الدین متوفی ۱۲۰۹ھ ہیں۔ شعر آیندہ کا مصرع اول مادۂ تاریخ کا حامل ہے۔ ؎

"بود زاہد مرشدی در دایرہ قطب کمال"
نام نجم الدین صاحب چون بدر روشن جمال

اب ہم فقیر اللہ کی رہنمائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مگر ساتھ والے ورق پر کسی نامعلوم شخص نے اسی صدی میں کسی وقت ان اسما کی تاریخیں دی ہیں بندگی میاں رفیع القدر ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء تاریخ وفات مادہ ذیل سے برآمد ہوتی ہے۔ ع "کہ جنت رسیدند آن عالی وقار" کاف بیانیہ مصرع میں داخل مادہ ہے۔ ان کے بعد میاں محمد عظیم کا نام ہے جو ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں اس دار فانی سے رحلت کرتے ہیں۔ آخری نام میاں محمد خدا بخش کا ہے جن کا سال وفات ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء مذکور ہے ۔

یہ تاریخیں کوئی تعجب نہیں اگر قیاساً دی گئی ہوں۔ کیونکہ ان بعض جزویات سے جو دی گئی ہیں مطابق نہیں آتیں۔ مثلاً میاں عبداللہ کی عمر میاں مصطفےٰ کی وفات کے وقت جو ۹۸۴ھ میں واقع ہوئی ہے۔ سولہ سال بتائی ہے۔

؎ میانجی مبارک بدن کی عمر جو سولہا برس کی اتھی سربسر

خود ۱۰۰۴ھ میں بعمر اڑتیس سال انتقال کرتے ہیں۔ گویا اپنے والد کے بعد صرف بیس سال اور زندہ رہے۔ بس ۱۶ + ۲۰ = ۳۶ چھتیس سال عمر پائی۔ یا یہ مانا جائے کہ ۱۰۰۶ھ میں فوت ہوئے ۔

شیخ امام جو میاں عبداللہ کی وفات کے وقت ۱۰۰۴ھ میں چار سال کے تھے ؎

برس چار کا تھا اول نیکنام جسے بولتی تھی خلق سب امام

ظاہر ہے کہ ۱۰۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ جب پچیس برس کی عمر میں وفات پائی ۱ء ے

بڑاں بیٹھ سن توانوں کی عمر برس بیس ہور پانچہ کی سربسر

تو ان کی وفات ۱۰۲۵ھ میں ہونی چاہیئے۔ نہ ۱۰۳۶ھ میں ے

انتہا سن ہجری جداں یک ہزار دگر برس چھتیس اندر شمار

یا ان کی عمر ۳۵ ہونی چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبدالمجید کی غلطی ہے۔ فقیراللہ نے صاف ۱۰۲۶ھ دیے ہیں۔ یا کاتب چھبّیس کو چھتّیس لکھ گیا ؛

عبدالمجید نے میاں عبدالوہاب کا سال وفات نہیں دیا۔ صرف اتنا لکھ دیا ہے۔ کہ تیئیس ۲۳ سال خلافت کی ے

کتے سال تیویس لک در اصل خلافت کری بیٹھ کرے بدل

اس موقعہ پر فقیراللہ ہماری دستگیری کرتا ہے۔ اور شعر ذیل میں تاریخ وفات ۱۰۴۹ھ دیتا ہے ے

"کان شاہ دین توکل دل ہمچو انبیا" سالار فرقہ ناجی و سردار اتقیا

ان کے جانشین میاں عمادالدین بیس سال کی عمر میں ۱۰۴۹ھ میں سجادہ پر آکر ۶۴ سال تک مرشدی کر کے ۱۱۱۳ھ میں کم و بیش نوّے سال کی عمر میں وفات پاتے ہیں ے

بھی سن کان دھر توانونکی عمر سو کم بیش نوّے برس کی خبر

بیس اور چوسٹھ چوراسی سال ہوتے ہیں نہ نوّے۔ اس سے ہمیں گمان گذرتا ہے کہ ان بزرگوں کے سالہائے وفات بعد میں کسی نے اندازہ کر کے مرتب کر دیے ہیں ؛

اہلِ دائرہ کے قلمی آثار

میاں مصطفےٰ اہلِ دائرہ کے مذہبی پیشوا کوئی مشہور و معروف ادیب و اہلِ قلم

نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی قلمی یادگاریں بہت کم چھوڑیں۔ نثر میں جو کچھ لکھا ضرورتاً لکھا۔ اور نظم اسی وقت لکھی جب ذوقِ طبیعت نے ابھارا۔ ان کے مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے۔ جس کا ذکر عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ کہ ازمکتوبات او بوی فقر وفنا می آید۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شایع ہوچکا تھا۔ ان میں مصنّف نے آیات وحدیث مثنوی ورباعی واشعار فارسی کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ بعض وقت پورا خط نظم میں لکھ ڈالا ہے ان مکتوبات کو شرف الدین منیری اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مکتوبات کے برابر نہیں رکھا جا سکتا۔ نہ ان سے اس عہد کے گذرنے والے واقعات یا خود مصنّف کی آپ بیتی پر روشنی پڑتی۔ میاں مصطفےٰ جس دنیا میں چلتے پھرتے رہتے بستے نظر آتے ہیں۔ اس کو ہماری گناہ ومعصیت کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کی نگاہ عقبےٰ اور عاقبت پر جمی ہوئی ہے۔ سب سے زیادہ یہ خطوط ان کی فروتنی، غربت اور مسکنت، پاک نفسی اور پاک طینتی کی گواہی دیتے ہیں۔ صبر ورضا۔ تسلیم وتوکل میاں کا امتیازی نشان ہے۔ ترک دنیا واہل دنیا۔ ذکر دوام وتجرید تمام ان کا دائمی نصب العین ہے۔ وہ خود بیدار ہیں اور دوستوں آشناؤں کو بیدار کرنے سے نہیں تھکتے۔ ہر نفس ان کے نزدیک نفس بازپسیں ہے

مے

وقت آخر آمدہ ہشیار می باید شدن　　روز وشب باسعی جان در کار می باید شدن

خواب غفلت رانبایدیار کردن درجہان　　یار من زین خواب بد بیدار می باید شدن

مکتوبات کے علاوہ میاں مصطفےٰ ایک رسالہ کے بھی مالک ہیں۔ جس میں اس مباحثہ کی روداد ہے جو شہر احمد آباد میں خان اعظم کے روبرو ان کے اور علماے گجرات کے درمیان واقع ہوا۔ یہ ایک نہایت مختصر رسالہ ہے ؞

میاں مصطفےٰ کے فرزند میاں عبداللہ تحریر و انشا میں شاید اپنے پدر بزرگوار سے بازی لے گئے ہیں۔ ان کی مثنوی بحر النکات جس کا اس سے قبل ذکر آ چکا ہے۔ میرے زیر نظر ہے۔ جو ۱۰۰۰ھ میں یعنی مصنّف کی وفات سے ایک سال قبل تالیف ہوتی ہے۔ اس کی ابتدا ہے:۔

اے جلوہ گر آمدہ بہر ساز اوراق ز مصحف رخت باز

حمد و نعت و نعت خاتم ولایت و مدح صدیق ولایت و میاں مصطفےٰ کے بعد اصل مثنوی شروع ہوتی ہے۔ یہ مثنوی ایک لمبے خط کی صورت میں فضائل مآب میاں شیخ عابد کے نام ہے۔ ابتدائے مثنوی میں اپنے مخاطب کو لکھتے ہیں:۔

یقین دانی کہ این الفاظ منظوم برای انشراح تست مرقوم
وگرنہ نامدا ز انواع عرفان درازی سخن پیش بزرگان
دگر منظور بادا این نوع زہا کہ بعد از ختم نامہ گشت پیدا
میان نامہ وآنہا چو بینی زباغ مثنوی گلہا بچینی
شد این نامہ ز عبداللہ محرر کند انفاس عابد را معطر
موافق جستمش چون با صفات اسم نہادہ آمدش بحر النکات اسم

ابتدا میں اور امور کے علاوہ مہدویوں کے لئے باب نصیحت و پند کھولا ہے۔ اور جھوٹے مہدویوں کی خبر لی ہے ؎

فروشی نام مہدی را بنانی خری زان بہر خود بدتر زیانی
ازان بہتر بود کاری کنی گر کہ سیر و ہی روی باشی تو چاکر
کنی خدمت بہ پیش بت پرستان برای قوت خود چون زیر دستان

اس کے بعد صدیق ولایت کی ایک نقل۔ مہدی کی ایک نقل۔ پھر ایک چور کی حکایت ہے۔ جو کسی پیر کا مُرید ہو گیا تھا۔ پیر نے اس سے وعدہ لیا کہ اگر چوری تجھ سے

چھوٹ نہیں سکتی۔ تو کم از کم اس کے اقدام کے وقت دائرۂ انصاف سے تجاوز نہ کرنا۔ اس کے بعد دو جماعتوں کا تقابل جس میں ایک قرآن اور تقلید اجماع کی پابند ہے اور دوسری جہالت اور غلو پرستی کی وادی میں بھٹک رہی ہے۔ آیندہ مہدی کے سفر خراسان کی حکایت۔ شگفتن بستان تصدیق الخ اور مخاطبۂ دل وغیرہ۔ خاتمہ کے اشعار ہیں :-

بصد عجز و نیازش گیر دامن | بگو با ذوق جان کای شمع روشن
بنور خویش روشن کن درونم | کہ ہم سوی تو گردد رہنمونم
بآن حسن نمودم رہ دہ کہ زودم | رہاند خوش ز زشتیہای بودم

حجم یک صد صفحات،

اب غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ جن کی تعداد پینتیس ہے۔ فقر و فنا کم کم اور مستی و رندی اور صراحی وخم کے مضامین بکثرت ہیں۔ دو غزلیں سرود کے وصف میں ملتی ہیں۔ پہلی غزل کا مطلع ہے ؎

شیشہ بساغر ہنوز راز ندادہ برون | نار زخمہ فگند شور بہ مجلس درون

میاں عبداللہ اپنی غزلوں میں کوئی تخلص نہیں لاتے۔ چونکہ کلام میں صفائی کم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشق سخن کا موقعہ کم ملا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے ضرورتاً لکھا ہے۔ خاتمہ میں ایک قطعہ میں اپنی اس بیجال گوئی پر معذرت کرتے ہیں۔ اور تاریخ اختتام دیتے ہیں :-

بامیدی کہ حق این گفتن بیجال مرا | زبس احسان و کرم عفو کند در محشر
سال اتمامش اگر کس طلبد از ہجرت | بر ہزار و سہ شدہ ختم نماند مضمر

میاں عبداللہ ایک مجموعۂ مکتوبات کے بھی مالک ہیں۔ پہلا اور دوسرا مکتوب میاں سید محمود کے نام۔ تیسرا بنام میاں اسمٰعیل از سید حمید در حمایت

عقاید میاں عبداللہ ساتھ ہی میاں عبداللہ کا اضافہ بسبیل ضمیمہ ۔ چوتھا خط بنام شیخ ابراہیم ۔ پانچواں بمیاں شیخ عابد ۔ یہ خطوط اس عام اعتراض کا جواب ہیں ۔ جو مرکزی شاخ مہدویہ بالعموم میاں مصطفےٰ پر کیا کرتی تھی ۔ کہ وہ حقیقت میں بے پیرے اور بے مرشدے ہیں ۔ یہ نزاع بہت دیر تک چلتا رہا ہے ۔ بلکہ صدی ڈیڑھ صدی تک فارسی اور اُردو میں اس پر بہت رسالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔

بعض خط میاں عماد الدین متوفی ۱۱۱۳ھ کے یادگار ہیں ۔ ان میں سے دو میری نظر سے گذرے ہیں ۔ پہلا خط سید میراں کے نام ہے ۔ بلکہ ان کے خط کا جواب ہے ۔ جس میں پھر وہی قدیمی اعتراض سوپ میں پھٹکا گیا ہے ۔ کہ میاں مصطفےٰ خود رو تھے اور کسی پیر سے تلقین نہیں ہوئے ۔ میاں عماد جواب میں کہتے ہیں کہ میاں کو علم لدنی حاصل تھا ۔ اس لئے انہیں کسی مرشد اور پیر کی ضرورت نہیں تھی ۔ ہمارے نزدیک میاں مصطفےٰ کی درخشاں خدمات اور قربانیوں سے تجاہل برتنا اور ایک ادنےٰ فروگذاشت کو لے کر اچھالنا مرکزی شاخ مہدویہ کی سنگ دلی اور بے حسی کی دلیل ہے ؎

بخون غلطیدہ دست و تیغ و غازی ماندہ بی تحسین
تو اول زیب اسپ و زینت برگستوان بینی

میاں عماد کا دوسرا خط ۱۰۸۹ھ کا نوشتہ ہے ۔ جب وہ براہ خشکی حج کعبۃ اللہ کو تشریف لے جا رہے تھے ۔ یہ خط مقام ڈھاڈھر سے بھیجا گیا ہے ۔ اور ان مظالم کی روئداد کا حامل ہے ۔ جو بربنائے تعصب مذہبی ڈھاڈھر کے لوگوں نے ان پر توڑے ۔ ڈھاڈھر کا حاکم مرزا خاں پسر جیون خاں ہے ۔ جس نے داراشکوہ کو پکڑ کر اورنگ زیب بادشاہ کے حوالہ کیا تھا ۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ایک بے ضرر سے اختلاف کی بنا پر ان بے چارے مہدویوں کو کیسی

کیسی تعدیوں کا نشانہ بنایا گیا۔

علماء ان سے مناظرہ کے لئے ایک مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ ان نوواردوں کو بلایا جاتا ہے۔ یہ جاتے ہیں۔ صحن مسجد میں چار سو آدمی جمع ہیں۔ انہیں درمیان میں جگہ دی گئی۔ ان سے نام پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا۔ عماد۔ کسی بے حمیت نے کہہ دیا۔ عماد نہ کہو حمار کہو۔ پھر سوال ہوا۔ کہ مہدی کے متعلق کیا کہتے ہو۔ آگیا یا آنے والا ہے؟ انہوں نے جواب دیا "مہدی علیہ السلام آمد و رفت"۔ اس پر لوگ گرم ہو گئے اور چاروں طرف سے لعنت ہونے لگی۔ پھر پوچھا کہ یہ تمہارے پاس کون بیٹھا ہے؟ انہوں نے کہا میرا فرزند ہے۔ کہنے لگے کہ پہلے ہم اس کا بند بند جدا کریں گے۔ بعد میں تجھے قتل کریں گے۔ ان کا جواب تھا۔ "این ضعیف گفت ماہ مبارک مولود است مبارکباد"۔ اس موقع پر سردار مجلس جس کا نام سری تھا اٹھا۔ اس نے نہایت بے رحمی سے میاں عماد کو حلق سے پکڑ لیا۔ پھر سب نے مل کر ان باپ بیٹوں پر حملہ کر دیا۔ کسی نے ہاتھ پکڑ لئے۔ کسی نے سر کے پٹے اور کسی نے ڈاڑھی پکڑ لی۔ ان کے قرآن اور کتابیں چھین کر سب کو پارہ پارہ کر دیا۔ یہاں تک کہ قرآن شریف کے احترام کو بھی بھلا دیا۔ یہ چھ آدمی تھے۔ چھٹوں پر سب طرف سے لات اور گھونسوں کا مینہ برستا رہا۔ ان کا دم لبوں پر آگیا۔ ان میں ایک منصب دار سید تھا۔ غل مچانے لگا۔ نامعقولو کیا کرتے ہو۔ ان کی جان نکل رہی ہے۔ یہ اپنے عقیدہ سے رجعت نہیں کریں گے۔ آخر بصد مشکل ان کو چھوڑا۔

میں اپنی محدود معلومات کی بنا پر فارسی زبان میں اہل دائرہ کی دیگر مساعی پر روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اور صفحات آیندہ میں ان کی اُردو تالیفات پر نظر ڈالتا ہوں۔

اردو یا ہندی جیسا کہ ان ایام میں کہلاتی تھی۔ ابتدا ہی سے مہدویوں میں ان کے ہندوستان میں مختلف صوبوں کے ساتھ تعلقات کی بنا پر مقبول تھی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ان کے دینی پیشوا نے منجملہ دیگر فرائض کے ایک فرض مہاجرت از وطن بھی لازمی قرار دیا تھا۔ خود حضرت میران سید محمد بھی ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہجرت کرتے رہے۔ ان کی وفات پر مہدویوں کے دس دائرے ہو گئے۔ جو اپنے اپنے پیشوا کے ماتحت اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ اخراج اور دیگر سیاسی وجوہ کی بنا پر بھی ان کو آوارہ گردی کرنی پڑتی تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر اردو کے ساتھ جو ہندوستان کے ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ان کا تعلق ابتدا ہی سے قایم ہو گیا تھا۔ فقرے۔ شعر اور دوہرے جو اس فرقہ کے دینی پیشوا کی زبان سے ادا ہوئے کتابوں میں محفوظ ہیں "آچھو جی آچھو"۔ ایک موقعہ پر بزبان گوجری (گجرات کی اردو) آپ کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ زاد الفقرا کے دیباچہ میں مرقوم ہے۔ کہ پیر پیران یعنی میران سید محمد مہدی موعود علیہ السلام در بیان صفت فقرا بزبان گوجری فرمودہ است و آن اینست۔ ساکھی:۔

پھاٹا پہنیں ٹوکا کھائیں راول دیول کہیں سنجائیں
اس گھر آئی یاہی ریت پانی چاہیں اور سیت

میاں مصطفےٰ کے مکتوبات[1] میں آتا ہے۔ کہ "حضرت میران جیو گاہ گاہ بزبان ہندوستان درمیان یاران خویش فرمودہ اندکہ" ہموں تموں میانے خدا بھیتر کی محبت ہے جیو، ہموں تموں میانے خدا بھیتر کی محبت ہے جیو" میاں عبداللہ کے خط میں جو شیخ ابراہیم کے نام ہے۔ یہ جملہ آتا ہے:۔

---

[1] منقول از مکتوب ہفتاد و دوم۔ مکتوبات میاں مصطفےٰ قلمی مملوکہ سید خیر الدین صاحب وکیل ٹھکانجات جے پور۔

" می آرند کہ این دوہرہ وقت رحلت بر زبان حضرت میران گذشتہ است :-

دوہرہ :-

بیرا نت پکھال توں کپڑ دھوے مدھوے اوجل ہوسے پچھوٹ سی اس نیدرے مت سوے

سید خوندمیر متوفی ۹۳۰ھ کی طرف یہ دوہرہ منسوب ہے :-

دوہرہ :-

ایک ملامت بھوکھ دکھ عالمگیری بار چلن تمام رسول کے جن کے یہ اختیار[1]

میاں دلاور متوفی ۹۴۵ھ کا یہ فقرہ مشہور ہے :- " صدقہ جاؤں جی اس باطن کے جس میں دین محمدی پرورش پاتا ہے " ؛

فیض عام میں آتا ہے۔ کہ جب میاں مصطفےٰ امور بی گئے ہیں۔ اس وقت انہوں نے ذیل کا ریختہ تحریر کیا تھا۔ جسے مصنف نے اس شعر کے نیچے نقل کیا ہے ؎

میاں نیں کتے گھر منے جاندھان کہا ریختہ یوں مبارک زبان

ریختہ فرمودن از زبان مبارک

اِس لٹکے اوپر واری ری اس غمزے کے بلہاری ری
دل بردبیک رفتار کہ خوش دین بردبیک گفتار کہ خوش
ناگاہ متاع ہوش وخرد وابستہ بدان دستار کہ خوش
اس لٹکے اوپر واری ری اس غمزے کے بلہاری ری
آمد سومن چون ماہ وشان بنشست دمی شادان وخوشان
دل خواست کہ مہانیش کند برخاست ہمی شمشیر کشان
اس لٹکے اوپر واری ری اس غمزے کے بلہاری ری

---

[1] منقول از زاد الفقرا مملوکہ سید خیر الدین صاحب وکیل ٹونکا ناجات جے پور ؛

گفتا کہ بیا تا بوسہ زنم　　گفتم کہ فدایت جان و تنم
نزدیک [چو گشتم] خندہ زدہ　　میگفت کہ خواہم پوست کنم
اس لٹکے اوپر واری ری　　اس غمزے کے بلہاری ری
چشمیست کہ دل از جاے شود　　لعلیست کہ غم از بیخ رود
گہ از سر را ہم دور کند　　گہ بگریزم دنبال کند
اس لٹکے اوپر واری ری　　اس غمزے کے بلہاری ری

(لف ۹۷ فیض عام)

اسی تالیف میں میاں کے دو گجری شعر ورق ۶۵ پر اس طرح درج ہیں:-

سمجھ کر میاں نیں یو نکتہ ندھان　　دیا کھول کر جواب گجری زبان
کہ یعنے زباں سوں پڑھا ریختہ　　جو میں بولتا ہوں تجھے بے خطا

ریختہ

رے جگ کے دھاتی دیٹھ ہیا　　موہ جان ٹھگن یہ بیکھ کیا
من تن من جوبن وار دیا　　موہ مرن جیون تجھ ساتھ دیا

مکتوبات میاں مصطفےٰ میں ان کا ایک اور ریختہ مکتوب ہفتاد و چہارم میں نقل[1] ہوا ہے۔ وہو ہذا:-

عجب این فضل خدا شد کہ یار وابستۂ ما شد　　دلش از قید رقیبان بہمہ وجہ جدا شد
ناگہان بر درم آمد کہ بیا شیم ہمین جا　　جانم از غایت شادی زپے رقص بپا شد
جم جم شادیاں روزی سہیلا سازواری گاؤ　　نت نت خوبیاں اٹھیاں خوشی کے تھال بھراؤ
پسری ناز کی شیرین ایسا کن ماٹی جایا　　بتکی شوخکی خودبین سو مرے منز بے بھایا
تگ آہستہ بتمکین سو کہو کن ہیں ڈیٹھا　　یار کی موزوں دل چین سو گھروں چل کر آیا

---

[1] یہی ریختہ مثنوی فیض عام میں ورق الف ۹۷ پر منقول ہے۔

جم جم شادیاں روزی سہیلا سازواری گاؤ — نت نت خوبیاں اد کیاں خوشی کے تھال بھراؤ
ایکہ آن حاسد بدخو تلیں تل منجسوں لڑتا — زسر کین بہر کو سو بولوں بولوں اڑتا
ایندم از ہرہ ہر سو سوخجل ہورہا بارے — سویم آن دلبر خوش روجوایا ہنس ہنس پڑتا
جم جم شادیاں روزی سہیلا سازواری گاؤ — نت خوبیاں اد کیاں خوشی کے تھال بھراؤ
روی آن ہوش برنا سوکدھیں بھی نہ بسرتا — جان زہجر رخ زیباش نس دن ڈسکی بھرتا
بگذشت آن ہمہ تشویش بھلا ہو را مانی — نو برشنگی رعنا آے پڑا لٹکے کرتا
جم جم شادیاں روزی سہیلا سازواری گاؤ — نت نت خوبیاں اد کیاں خوشی کے تھال بھراؤ

بوجہ ہم مذہبی اہل دائرہ اپنے دکنی بھائیوں کے ساتھ خواہ بحث و مباحثے کی غرض سے خواہ اور مقاصد کے واسطے برابر تعلقات قایم رکھتے تھے ۔ ان تعلقات کی بنا پر وہ دکنی زبان سے بھی تعلق میں آتے رہے ۔ یہ لوگ اصلاً گجرات کے رہنے والے تھے جہاں اردو کی وہ شاخ جسے گوجری کہا جاتا تھا رائج تھی ۔ گوجری اور دکنی زبانیں آپس میں اس قدر مشابہ ہیں کہ انسان کو ان میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے ۔ اہل دائرہ دکنی لٹریچر سے کافی گہری آشنائی رکھتے ہوں گے ۔ کہ ان کی ادبی مساعی کا پہلا نتیجہ ایک ایسی زبان میں ہے جسے دکنی کے سوائے اور نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا ۔ اس سے میری مراد مثنوی

فیض عام

ہے اور جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مذکور ہو چکا ہے ۔ عبدالحمد اس کا مصنف ہے ۔ صفحوں کی تعداد ۲۰۰ ۔ فی صفحہ سترہ شعر جس سے اشعار کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب پہنچ جائے گی ۔ اس کی ابتدا ہے :-

خدا کی کروں صفت اول بیاں — بنائے جنے سب زمین آسماں
بھی انسان کو خاک سیتی کیا — اناسرہ شرف اسکوں دیا

جنے جان کوں آگ سے کربن — پری جنّ کا تس سیں نپجا رتن
جو کچھ دیکھتا ہے یہ ارض وسما — کرنہار سب کا ہے بیشک خدا

کتاب کی سرخیاں فارسی زبان میں ہیں۔ حمد و نعت و منقبت صحابۂ کرام کے بعد مصنف اپنے فرقہ کے دینی پیشوا حضرت سید محمد کی مدح میں مصروف ہے پھر پانچوں خلفاے مہدی حضرت سید محمود ثانی مہدی۔ سید خوندمیر خلیفۂ دوم۔ شاہ نعمت خلیفۂ سوم۔ شاہ نظام خلیفہ چہارم اور شاہ دلاور خلیفۂ پنجم کی صفت بیان کی ہے۔ سبب تالیف ایک علٰحدہ عنوان کے نیچے دیا ہے۔ وہو ہذا:۔ "در بیان بنای این قصۂ فیض عام بزبان دکنی گوید" اور کہا ہے کہ میاں شیخ آدم نے میاں مصطفےٰ کی زندگی کے حالات فارسی زبان میں تحریر کئے تھے مگر ان پڑھ لوگ اس زبان سے ناواقف تھے۔ اس لئے میں نے اس کو آسان دکنی زبان میں ادا کر دیا اور فیض عام نام رکھ دیا۔ مصنف کے الفاظ ہیں:۔

اتا سن بنا اس قصہ کا تو یار — اگر تو اچھے دل سنے ہوشیار
میاں مصطفےٰ کا قصہ فارسی — بنایا تھا دل کھول جیوں آرسی
میاں شیخ آدم نبی کر کر بیاں — سو بولے تھے اسکوں مبارک زباں
وے ان پڑھیا اسکوں کیا بوجھتا — کہ جیسیں اندھے کوں نہیں سوجھتا
سہل کر کو دکنی میں جوڑی کتاب — سو آوے سمجھ میں ہر یک کوں شتاب
کیا ہے یو دکنی زباں میں کلام — رکھا ناؤں اس کا یقیں فیض عام
میں توفیق مانگوں خدا سوں یہی — کہ پورا کرے یو فضل سوں صحی
وگرنہ تو مجکوں یو طاقت کہاں — نظم جوڑنیکی لیاقت کہاں
بھی رکھتا ہوں میں اس قصہ سوں مراد — کہ ہو عاقبت بیچ عزت زیاد
میں ہوں اپنے بے علم پر معترف — اسے سو نچہ دکھنی میں بولیا حرف

سنا ہوں جو کچھ میں بزرگوں کنے | بھی دیکھا جو بعضی کتابوں منے
لکھا ہوں بہت اس قصے کوں سنبھال | نہ دم مارنیکوں مجھے ہے مجال
وے بعض جاگا لکھا ہوں نقل | کتابوں منے سوں ہے اس کا اصل
بھی ہیں عالماں فاضلاں سوں آنال | سو رکھتا ہوں امید دل میں کمال
کہ نقصان سوں گر ہویں جو خبر | کرم کے قلم سوں سنواریں پکڑ
کہ اپنی میں تقصیر بولیا اول | جو ہوں پر گنہ بے علم دراصل

یہ مثنوی میاں علیمی ۱۱۱۳ھ و ۱۱۵۱ھ کے عہد میں تالیف ہوتی ہے۔ خاتمہ کی تاریخ ۹ شعبان ۱۱۴۱ھ دی ہے۔ مصنف اپنا نام عبدالمحمد بتاتا ہے۔ چنانچہ خاتمہ کے اشعار :-

میاں شیخ عیسی کوں اول پچھان | جو ثابوت ہیں مرشدی پردھان
انوں کے عمل ہیں اے ساری کتاب | سو جوڑی ہے دکنی زباں میں شتاب
نویں چاند شعبان کی رات کوں | خدا ہیں یو آخر کیا بات کوں
اتھا سنہ ہجری جداں یک ہزار | بھی یک سو و چالیس یک در شمار
سو عبدالمحمد نبی کا غلام | خدا کے فضل سوں کیا یو تمام
اتا چاہتا ہے یو عاجز غریب | کہ ہو عاقبت زیچ نیکی نصیب

فیض عام جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے دکنی زبان میں لکھی گئی ہے مگر یہ ایسی دکنی ہے۔ جس پر راجپوتانہ اور شمالی ہندوستان کا بھی اثر نمایاں ہے۔ اچھنا لگن۔ ہزاراں۔ آنال۔ لگر۔ نول۔ سٹنا۔ کدن۔ نمن۔ وو نچ (وو ہی) جاکو (جاکر) پو (پر)، نکو (کلمۂ نفی) خالص دکنی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ذیل کے الفاظ شمال اور راجپوتانہ کے اثر میں مانے جا سکتے ہیں :-

تیویس (تیئیس)، ے سکتے سال تیویس لگ دراصل | خلافت کری بیٹھ کر بے بدل

گنیں (انہیں)، ؎ سوتا ریخ کی بات بولوں نفیس — گئے تھے مہینے میں سوں دن گنیں
ہوں (میں)، ؎ کہاں لگ کروں ذات کی صفت ہوں — اُٹھے چودھویں رات کا چاند جیوں
پران (جان۔دم)، ؎ تو اسد اللہ غالب صحی اسکوں جان — شتیں کا فراں ڈھاک سیتی پران
بتاواں (بتاؤں)، ؎ بھی عثمان کی میں بتاواں عمر — سو کم بیش اسی برس کی خبر
بڈارنا (نکالنا)، ؎ انوں بھی انگیں سوں بڈاریں مجھے — نہ ستّار ہو کر اباریں مجھے
وانچنا (پڑھنا)، ؎ یو ہے قول کشاف میں دیکھ وانچ — کہ ہے یہ نشانی منافق کی سانچ
رنجانا (رنج دینا)، ؎ اسے کے گنہ کر تو رنجانتا — جو فرمان اس کا نہیں مانتا
آونا (آنا)، ؎ لگے لوگ تعظیم دینے مزید — جداں آوتے شیخ عبدالرشید
جان (جانے)، ؎ کہا سب نیں مل جان ہرگز ندیں — جہاں لگ حکم بادشاہ کا نہ لیں
بوجھنا (پوچھنا)، ؎ بڑا اچب ہوا او عمر میں کمال — بوجھا اسنے لوگوں کو یک دن سوال

ظلم۔ فضل۔ عدل۔ اصل۔ نقل۔ عقل۔ رموز۔ امر۔ کفر۔ رزق۔ حلق۔ شکر۔ عمر۔ وحی۔ عکس۔ قطب۔ حلم۔ نفس۔ شہر۔ رسم۔ دفع۔ نفع۔ شرع۔ نشر۔ فکر۔ حکم۔ قبر۔ حشر وغیرہ کو بتحریک دوم باندھا ہے ؛

مجھ۔ سمجھ۔ مجلس وغیرہ میں میم کے بعد ایک نون اضافہ کر کے منجھ۔ سمنجھ۔ اور منجلس لکھا ہے ؛

نے کے استعمال میں بے قاعدگی :۔

جداں خادماں نیں یو سنکر ضرور — اسے لیگئے جب قبر کے حضور

دنیا۔ دریا۔ اختیار۔ حبشیاں۔ مکھیاں کی 'ی' کو یائے مخلوط کی طرح ادا کیا ہے۔ جواب اور صواب کو بروزن خواب لکھا ہے ؛

اس مثنوی کے مطالب اس سے قبل میاں مصطفیٰ اور میاں عبداللہ کے حالات میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں نمونۂ کلام کے لئے چند شعر ایک شہزادہ

کی حکایت سے دیبے جاتے ہیں - جو بدھا جی کی طرح دنیا چھوڑ بیٹھتا ہے -

کہا اس نیں یوں ایک تھا بادشاہ ۔۔۔ جسے تھی بڑی فوج ہور دبدباہ
اتھا مرتبے میں او ایسا کمال ۔۔۔ کہ درجے مینے تھا سکندر مثال
و لے اسکے بیٹوں کی عادت تھی یوں ۔۔۔ کہ میں بولتا ہوں تجھے کھول جیوں
او اچھتے بڑے جب منور ضمیر ۔۔۔ نکل جاتے جنگل میں ہو کر فقیر
اسی سوچ او شاہ غم میں اتھا ۔۔۔ سو دلگیر ہر یک قدم میں اتھا
کتے یوں اوسی بادشاہ کے عزیز ۔۔۔ ہوا ایک فرزند صاحب تمیز
بلا بادشاہ نیں وزیراں امیر ۔۔۔ اٹھا بول یوں کر سو روشن ضمیر
مرے بالکوں کی سو عادت تمام ۔۔۔ تمہیں جانتے ہو حقیقت مدام
انا گر مروں میں تو اس تخت پر ۔۔۔ سو بیٹھے اگر کوئی ظالم دگر
او نم پر کرے گا ظلم ہور ستم ۔۔۔ اسی بات کا ہے منجھے خوف غم
مری ٹھور فرزند میرا اگر ۔۔۔ جو ہوتا تو کرتا عدالت نشر
تمہارے پو احسان کرتا عدل ۔۔۔ کہ جیوں میں کیا ہے سدا در اصل
اسی واسطے میں بلا کر ابھی ۔۔۔ سو لوچھا ہے تمکوں بتا کر سبھی
کرو مصلحت بیٹھ کر دل ملا ۔۔۔ اچھے جس میں میرا تمہارا بھلا
انونیں یو سن بادشاہ کا امر ۔۔۔ کیا آپ میں بیٹھ سب مل فکر
پچھے بادشاہ سوں کیا عرض یوں ۔۔۔ کہ اے شہ تو کر ہم بتاتے ہیں جیوں
محل ایک خاصا چنا کر تا ال ۔۔۔ اچھے جس کنے باغ نادر نہال
بھی دیوار کوں اوسکی اونچی یتی ۔۔۔ کہ دیسے نہ جاتا سو گھوڑا ہتی
یو بالک وگر والدہ بھی سنگات ۔۔۔ رکھو اس محل بیچ تحقیق بات
بھی کنچنی گو تیا بہو یا کھلار ۔۔۔ دنیادار رکھو اس کنے بیشمار

کہ گاویں بجاویں نچاویں سدا — سکھاویں دنیا ہور بھلاویں خدا

ہووے پرورش گر انو نیں تمام — اچھے اوسکے دل میں یو خطرے مدام

نہ حق کی سنے بات ہرگز وہاں — اسی مصلحت سوں نہ چھوڑے دنیاں

یو سن بادشاہ نیں انوں کی عقل — اسی بھانت خاصا چنا یا محل

لیجا کر اوسے اوس محل میں رکھیا — وہاں پرورش اس وجہ سوں کیا

کتے رات دن وھاں سداں بیدرنگ — اتھا اوس کنے ناچ ہور راگ رنگ

محل میں رہیا او بچہ بالک مدام — جہاں لگ کہ بالغ ہوا او تمام

بڈا جب ہوا او عمر میں کمال — بوجھا اسنے لوگوں کو یک دن سنبھال

یو دیوار کے پار ہے کیا سو چیز — منجے تم کہو کھول سارے عزیز

دیا جواب لوگوں نیں جب یوں اسے — کہ دیوار کے پار خلقت بسے

اٹھا بول پھیر بادشاہزادہ یوں — منجے چھوڑ دیو کھول دیکھوں میں جیوں

کہا سبنے مل جان ہرگز ندیں — جہاں لگ حکم بادشاہ کا نہ لیں

کتے ملکو سب بادشاہ کن گئے — شتابی سوں اسکا حکم جا لئے

ہوا جب حکم بادشاہ کا ندھان — اونکلیا محل سوں سعادت نشان

جتے چاکراں خادماں لے سنگات — نکل کر چلا بھار عالی صفات

نکل کر گیا جب شہر میں گذر — پڑی جب اسے یک بڈھے پر نظر

نہ انکھیاں اتھیاں کان نا اسکوں دانت — اتھی کو بڑی پیٹھ حلقے کی بھانت

ضعیفی سوں تھے ہاڈ اسکے جدا — بھی ڈاڑھی او پر رال بہتی سدا

بھی بیٹھیاں تھیاں اسپر مکھیاں بستماں — بوجھا کھول شہزادہ نے جب پکار

کہ یو آدمی یوں ہوا کے خراب — بتاؤ منجے کھول اسکا حساب

کہا جب کہ بوڈھا ہوا یو عزیز — ضعیفی ہے اسکوں اکھے صاحب تمیز

بوجھا پھر کہ اسکو نچہ ہے یو مدام ‏ ‏ دیا سب ہمیں یوں اچھینگے تمام

دیا جواب لوگوں نیں ایسا چہ حال ‏ ‏ ہوے سبکوں بودھا اچھے سو کمال

کہا جب کہ کیا زندگانی ہے او ‏ ‏ کہ آخر کوں جسکے اچھے حال یو

(باقی دارد) ‏ ‏ محمود شیرانی

فارسی کی مثالیہ شاعری

فارسی شاعری کی مختلف اقسام و انواع کے متعلق کتابوں میں مفصل بحثیں آئی ہیں۔ لیکن ابھی تک 'مثالیہ شاعری' کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں لکھا گیا۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ آج ہم گلستانِ خیال کے اس پہلو پر اجمالی سی نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں۔ کہ مثالیہ شاعری کیا ہے؟ اس نے فارسی شاعری پر کیا کیا اثر ڈالا؟ اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کا انسانی زندگی اور مشاہدہ کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ اگرچہ شعر العجم وغیرہ میں اس مضمون پر بعض اشارات ملتے ہیں۔ لیکن اس پُر لطف نوعِ سخن کے متعلق کسی قدر مزید بحث کی گنجایش ہے ؎

صد سال می توان سخن از زلفِ یار گفت
در بندِ آن مباش کہ مضمون نماندہ است

تمثیل اور تخیل مثالیہ شاعری کا دارو مدار تشبیہ اور تخیل پر ہے۔ جس کا شاعری میں بہت بڑا درجہ ہے۔ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر ہم شعر کے اجزائے ترکیبی میں سے اس جزوِ ممتاز کو خارج کر دیں۔ تو شاید شعر کا لطف بالکل ختم ہو کر رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر کسی شاعر کی قوت تخییل قوی اور زبردست ہوگی۔ اسی قدر اس کا شعر مؤثر اور قوی ہوگا۔ یا بقول شبلیؒ "جس قدر بلند پرواز طایر ہوگا اسی قدر اس کے لئے فضا کی وسعت درکار ہوگی"[۱]

---

[۱] شعر العجم۔ حصہ ۴۔ ص ۳۹،

بعض کور ذوق حضرات یہ کہتے ہیں۔ کہ تخییل کا کام زیادہ سے زیادہ یہ ہے۔ کہ ایک سادہ بات کو مختصراً بیان کرنے کی بجائے لمبا اور مفصل طریقہ اظہار اختیار کیا جائے۔ جو بلاغت کے خلاف ہے۔ مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ ہمارا محبوب بہت خوبصورت ہے جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تو اس کے لئے شاعر یہ طریقہ اختیار کرتا ہے ؎

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
همہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند (نظیری)

یا مثلاً کہنا یہ ہے۔ کہ شراب کے بغیر غم کی کلفت دور نہیں ہو سکتی۔ تو شاعر اس کو بیان کرنے کے لئے یہ پیرایہ اختیار کرتا ہے ؎

بے کیمیائے مستی تبدیل غم محال است
یا مے حلال فرما یا غم حرام گردان (نظیری)

یا مثلاً شاعر کہنا یہ چاہتا ہے۔ کہ عاشق حسن دوست کو دیکھ لینے کے بعد اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔ یہاں تک کہ عبادت اور نماز کو بھی بھول جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس مقصود کو ادا کرنے کے لئے یہ انوکھا طرز بیان اختیار کیا گیا ہے ؎

فرض و سنت بہ تماشائے تو از یاد م رفت
پردہ بر روئے فگن یا ز من ایمان مطلب (نظیری)

ایجاز اور تخییل

سچ یہ ہے۔ کہ یہ اعتراض شاعری کی ماہیت سے بےخبری کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں۔ کہ جدید دنیا شاعرانہ خیال آرائیوں کو پسند نہیں کرتی اور ہر بات میں کفایت شعاری اور اختصار کا خاص خیال رکھا جاتا ہے لیکن یہ بات بالیقین کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح

یہ کارخانۂ عناصر جذبات کی چاشنی کے بغیر بے رنگ اور بے رونق ہے اسی
طرح شاعرانہ تخییل کے بغیر نہ صرف شاعری بلکہ جذبات کی ساری دنیا بھی بے کیف ہے
شعر تو خیر بہت نازک اور لطیف چیز ہے۔ خود نثر، تاریخ، فلسفہ اور سائنس بھی
تخییل کی اثر اندازی کے بغیر باعثِ کشش نہیں چنانچہ۔ ایچ۔ جی۔ ویلز اپنے
سائنٹیفک نظریات کو شاید اس قدر مقبول نہ بنا سکتے۔ اگر ان کا طرزِ نگارش
شاعرانہ نہ ہوتا۔ غرض دنیا میں شاعر جو خیالی تصویریں بناتا ہے۔ ان کے لیئے
اگر تخییل کا رنگ روغن استعمال نہ کیا جائے۔ تو تصویر تو کیا خاکہ بھی تیار نہ ہو سکے
نظیری اسی مضمون کو ادا کرتا ہے ؎

بیان شوق بتقریر در نمی آید
نمی شود کہ سخن مختصر تو ان کردن (نظیری)

تخییل اور مشاہدات

تخییل کی وسعت کے لئے ضروری ہے کہ واقعات
وحقایق کا بکثرت اور گہرا مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ
ہر خیال مشاہدات و واقعات یا ان سے اخذ کردہ تشابہات پر قایم ہوتا ہے۔
خواہ فی الواقعہ اور فی الخارج ویسا نہ ہوتا ہو۔ تشبیہ و استعارہ سے شعراء جو
نتایج قایم کیا کرتے ہیں۔ ان میں تخییل بعض اوقات، بلکہ اکثر اوقات
یہی اختراعی مشابہت پیدا کر دیا کرتی ہے ؎

مرکب تشبیہ اور تمثیل

مفرد تشبیہ جب ترقی پذیر ہوئی۔ تو شعراء نے مرکب
تصویریں بنائیں۔ اور بالآخر یہی مرکب تصویریں
تمثیل کے درجہ تک پہنچ گئیں۔ غرض "تمثیل کا آغاز تو تشبیہ سے ہوا لیکن تخییل
نے اختراعی مشابہت سے بھی واقعی تشبیہ کا کام لینا شروع کر دیا اور تمثیلی شاعری
کا دامن وسیع ہو گیا"[1]

---

[1] مرآۃ الشعر (شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن دہلوی) ص ۲۱۶

غرض تمثیلی شاعری تخییل کی رہین منت ہے۔ جس کی آبیاری واقعات ومشاہدات اور امور خارجی ونفسی کے گہرے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا میدان مفرد تشبیہ سے بہت وسیع اور اس کا اثر بیشتر اوقات اس سے کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شاعر اپنے دعوے کے اثبات کے لئے حیات حسیّ کے واقعات سے استشہاد کرتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ تاثیر اور اثر کے لئے اس سے بڑھ کر کون سا پیرایۂ بیان ہوسکتا ہے؟ اسی کا یہ نتیجہ ہؤا۔ کہ تمثیل کی شاعری ایک باقاعدہ صنف بن گئی۔

مثالیہ کی تعریف یہ ہے۔ کہ شاعر ایک دعوے کرتا ہے اور پھر اس پر شاعرانہ دلیل پیش کرتا ہے۔ خواہ یہ دلیل منطقی لحاظ سے درست ہو یا غلط۔ مثالیہ کی دلیل مثال کے رنگ میں ہوتی ہے۔ جس سے دعوے کا اثبات مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً

فروتنی است نشانِ رسیدگانِ کمال
کہ چون سوار بمنزل رسد پیادہ شود

دعوے یہ ہے کہ جو لوگ کامل ہوتے ہیں۔ وہ فروتنی اختیار کرتے ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے۔ کہ سوار جب منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ تو پیادہ ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً یہ شعر کہ ؎

بر صوفی بے وجد وبال است عبادت
بر شیشہ کہ خالی است زمی سجدہ حرام است

دعوے یہ ہے۔ کہ وجد کے بغیر عبادت بے کیف اور بے اثر ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ صراحی جب شراب سے خالی ہو جاتی ہے۔ تو پھر اس کو اوندھا نہیں کیا جاتا۔

مثال بعض اوقات بطور دلیل ہی نہیں۔ بلکہ بطور تاکید دلیل بھی ہوتی ہے۔ مثلاً عربی کے اس شعر میں ؎

اصبر علی حسد الحسود فان صبرك قاتله
فالنار تاکل بعضها ان لم تجد ما تأكله

حاسد کے حسد کی پرواہ نہ کرنے کے لئے تو یہی دلیل کافی ہے۔ کہ حاسد خود ذلیل ہو جائے گا۔ لیکن اس کی تاکید اس مثال سے کی گئی ہے۔ کہ جب اور کچھ نہ رہے تو آگ خود اپنے اجزا کو کھایا کرتی ہے۔

تمثیل شاعری میں کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ مثالیہ قسم کے شعر عرب شعرا اور انوری و خاقانی کے کلام میں بھی ملتے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے اکابر شعرا نے بھی تمثیل و مثال کا استعمال کیا ہے۔ لیکن قدما کے ہاں ایسے اشعار کی کثرت نہیں۔ بلکہ تمثیلی انداز شاذ و نادر ہے۔ اور درحقیقت یہ بات فارسی شاعری کی ارتقائی ماہیت کے عین مطابق بھی ہے۔ کیونکہ قدما کی شاعری اپنے عنفوان شباب میں ہونے کی وجہ سے سادہ تھی اور اگرچہ خاقانی اور انوری نے استعارات و کنایات و تلمیحات کے استعمال میں سادگی اور سلاست کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ تاہم جدت اور تازگی ضرور موجود تھی۔ لیکن خیال آفرینی اور ایک ادا کئے ہوئے مضمون کے لئے نئے انداز بیان کی ضرورت متاخرین کو ہی پیش آئی۔ مثالیہ کا زیادہ رواج ہندی اور عراقی اسلوب کے طرز دانوں نے کیا۔ اور متاخرین نے اس کو چمکایا۔ جس کی تفصیل یہ ہے:۔

فارسی شاعری کے تین طرز

فارسی شاعری اسلوب کے اعتبار سے تین دبستانوں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے ہر ایک دبستان ایک طرز خاص کا علمبردار ہے۔ سب سے پرانا طرز خراسانی، پھر عراقی اور

پھر ہندی ہے۔ طرز خراسانی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ خراسان میں ترقی پائی۔ اور اس کے اکابر شعرا نے صفاریوں۔ سامانیوں اور سلجوقیوں کے زمانے میں اس طرز کو ترقی دی۔ ان لوگوں نے طول طویل قصاید کو رواج دیا۔ اور غزلیں کم لکھیں۔ مناظر طبعی و قدرتی پر طبع آزمائیاں کیں۔ انکی تشبیہات و کنایات و استعارات متاخرین کے مقابلہ میں بہت سادہ اور عام فہم تھیں۔ فردوسی۔ رودکی۔ منوچہری۔ فرخی اور ناصر خسرو اس طرز خاص کے ماہر تھے۔

طرز عراقی طرز عراقی کی ابتدا اور ترقی چھٹی۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں ہوئی۔ اس میں طویل قصاید کم لکھے گئے اور ان کے بجائے غزلیات کا رواج زیادہ ہوا۔ دقت اور لطافت الفاظ کا خاص خیال رکھا جانے لگا اور علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات شاعری میں داخل ہوگئیں۔ اس طرز خاص میں سعدی، حافظ اور خواجو وغیرہ نے نام پایا۔ اس طرز کا مرکز عراق، اصفہان، شیراز اور اس کے مضافات ہیں۔

طرز ہندی تیسرا طرز جو بہت حد تک طرز عراقی سے مماثل ہے۔ طرز ہندی کہلاتا ہے۔ یہ اسلوب تیموریوں کے زمانے میں بہت رواج پذیر ہوا۔ سلطان حسین بیقرا اور میر علی شیر بھی اس طرز کے دلدادہ تھے۔ اور اس زمانے سے شروع ہو کر آخر تک یہ رنگ قایم رہا۔ یہ لوگ پیچیدہ گئے خیال سے کام لیتے تھے۔ اور ان کا سب سے بڑا میدانِ کمال 'خیال' کی دنیا ہے۔ ان کے استعارات بعید از فہم اور تشبیہیں نازک ہوتی ہیں۔ اور بات بات میں تکلف سے کام لیتے ہیں۔ بابا فغانی جو اپنے زمانے کے مجتہد تھے۔ بہت دلپسند انداز میں لکھتے تھے۔ اور ان کے بعض متبعین مثلاً شہیدی قمی، حیرتی،

عرفی، عرفی، فیضی وغیرہ نے بھی اس خاص صنف میں معتدل رنگ کو قایم رکھا۔
میرزا صائب نے اس طرز کے ایک خاص شعبہ یعنی تمثیل کو اپنایا۔ اور بہت
حد تک اس کی خوبصورتی کو نباہنے کی کوشش کی۔ ان کی تقلید غنی کاشمیری،
ناصر علی اور بیدل وغیرہ نے کی۔ لیکن صائب نے اپنے کلام میں اس کثرت
سے مثالیہ کا استعمال کیا۔ کہ ذوق پر بار ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بہت
سے نقادان فن اس کو بوجہ ابتذال انحطاط کی علامت خیال کرتے ہیں[1]۔

اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جلال اسیر، قاسم دیوانہ اور ان کے
بعض ہم عصروں اور شاگردوں نے "طرز خیال" کی ابتدا کی۔ یہ خاص طرز ہندوستان
میں بہت مقبول ہوئی اور صائب، غنی اور دوسرے مثال گو شعرا بھی اس سے
بہت متأثر ہوئے۔ اور انہوں نے بھی اسی رنگ میں لکھنے کی کوشش کی۔
طرز خیال میں ایک خاص کمزوری یہ ہے۔ کہ اس میں خیال بندی اس انداز تک
غلو کر گئی ہے۔ کہ بعض اوقات اشعار بے معنی ہو جاتے ہیں۔ علی الخصوص
جب محسوسات کو معقولات سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ تو مضامین بہت پیچ در پیچ
اور خلاف فطرت ہو جاتے ہیں۔ جو بعض اوقات ذوق سلیم پر گراں
گذرتے ہیں۔ مثلاً صائب کا یہ شعر ؎

بخیۂ کفشم اگر دندان نما شد عیب نیست
خندہ آرد کفش من بر ہرزہ گردی ہای من

یا مثلاً یہ شعر ؎

مشت سوزن بدلم زان مژہ تا ریختہ اند
گریہ از پارۂ دل دوختہ پیراہن چشم

---

[1] مثمر از خان آرزو (قلمی یونیورسٹی لائبریری)، ورق ۵ ب۔

مثالیہ کی خصوصیات مثالیہ شاعری اگرچہ ایک خاص صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن فی الواقعہ خیال بندی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ بعض شعراء کا مثالیہ کلام ایجاز و اختصار کے منافی ہے۔ جس میں مثالیں بہت دور از کار اور معمولی ہوتی ہیں۔ میرزا صائب، غنی کاشمیری، سعید اشرف، سالک یزدی، ناصر علی کلیم، قلی سلیم، طالب آملی کا کلام لطف اور لذت سے لبریز ہے۔ لیکن ان کے مقلدوں اور پیروؤں کی شاعری بے مزہ ہے اور پامال مضامین کی کثرت کی وجہ سے طبیعت بہت جلد اچاٹ ہو جاتی ہے ٭

مرزا صائب مثال گو شعرا کے گل سرسبد ہیں۔ ان کے کلام میں عشقیہ مضامین کی کمی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اخلاقی مضامین بے اندازہ ہیں سالک یزدی اور غنی وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ اور شاید ان کی شاعری کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی ہے۔ کہ ان شاعروں نے اخلاقیات کو مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

سرنوشت واژگوں را راست می سازد دنیا
نقش معکوس نگیں از سجدہ می گردد درست (فائق)

ناصر علی سرہندی خود اعتمادی کی فضیلت میں لکھتے ہیں ؎

اہل ہمت را نباشد تکیہ بر بازوے کس
خیمۂ افلاک بے چوب و طناب استادہ است

ترقی در تنزل بودہ است اقبالمنداں را
کہ ابراہیم ادہم شد تمام از دولت افتادن (؟)

کلیم کا خیال ہے۔ کہ ظالم کی عمر کوتاہ ہوتی ہے۔ اس کی دلیل اور مثال یہ ہے

کہ سیلاب نہایت جوش اور قوت سے بڑھتا ہے۔ لیکن آن کی آن میں ختم ہو جاتا ہے

بر ستمگر بیشتر دارد اثر تیغ ستم
عمر کوتہ از تعدی می شود سیلاب را (کلیم)

غیور اور خوددار کسی سے استعانت کے روادار نہیں ہوتے۔ بیدل اس کا ثبوت یہ دیتے ہیں۔ کہ آئینہ شکست کا علاج مومیائی سے نہیں کرتا ؎

بیدل از خویشان نمی باید اعانت خواستن
مومیائی چارہ فرمای شکست شیشہ نیست

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے۔ مثال گوؤں کے بادشاہ صائب نے اس نوع سخن سے اخلاقی تعلیم و تلقین کا کام لیا ہے۔ اور مثالوں کے ذریعے واقعات ثابتہ کا انکشاف و اعلان کیا ہے۔ لیکن بعض شعراء مثلاً فغانی اور نظیری کے ہاں مثالیہ انداز میں عشقیہ اشعار بھی بکثرت موجود ہیں۔ نظیری کہتے ہیں ؎

از پے آشوب ما در زلف دارد شانہ را
شورش زنجیر در شور آورد دیوانہ را

معشوق کی شہرت عاشق کے عشق اور سوز و گداز پر منحصر ہے اور اسی سے معشوق کا نام پیدا ہوتا ہے۔ نظیری اس کی دلیل میں کہتے ہیں۔ کہ میوہ کی پرورش کے لئے باغبان کا ہونا ضروری ہے ؎

ز عاشق می شود معشوق را نام و نشاں پیدا
ثمر نیکو نیاید تا نیاید باغباں پیدا (نظیری)

محبت میں کامل بننے سے ہی وصال محبوب مل سکتا ہے۔ کیونکہ ایک عقیدہ ہے۔ کہ اگر کوئی نابالغ مرجائے تو اس کا مقام اعراف ہوتا ہے۔ بہشت تو

صرف باکمالوں کا حصّہ ہے ؎

بہشت روزیِ نابالغِ محبّت نیست
کسیکہ طفل بمیرد مقامش اعراف است (نظیری)

مثالیہ اور مشاہدہ

مضمون کے شروع میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ مثالیہ شاعری کی استواری اور عظمت تخییل پر قایم ہے۔ اور تخییل کے لئے ضروری ہے۔ کہ مشاہدہ کا میدان وسیع ہو۔ شاعر اس قوت سے تمام اشیائے عالم پر دقیق نظر ڈالتا ہے۔ ہر چیز کی خصوصیات کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے ہر ہر وصف کو دیکھتا ہے اور اپنی تصویر خیال کو آراستہ کرنے میں اس سے کام لیتا ہے۔ تشبیہ کی اقلیم بھی استعارہ کی طرح نہایت وسیع ہے۔ جس میں شاعر بلا روک ٹوک اپنے اشہب فکر کو دوڑاتا پھرتا ہے۔ وہ تمام چیزوں کے متعلق اپنا معیار قایم کرتا ہے۔ مشترک اوصاف سے متضاد معانی پیدا کرتا اور متضاد اوصاف میں اشتراک ثابت کرتا ہے۔ تعجب ہے کہ فارسی شاعری کے متعلق ایک غلط بات کس طرح اور کس نے پھیلادی کہ اس میں مشاہدہ کائنات کا عنصر بہت کم ہے۔ اور اس کا روئے خطاب محض گل و بلبل سے ہے۔ دَر حقیقت یہ الزام ان لوگوں نے لگایا ہے۔ جو گل و بلبل کی اہمیّت سے بے خبر ہیں اور انہوں نے فارسی شاعری کے بحرِ ذخّار کی سیر نہیں کی۔ بلکہ صرف ساحل کے نظّارہ تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ ورنہ یہ بات ثابت کرنی مشکل نہیں کہ فارسی زبان کا شاعر اپنی شاعری کا سارا موادّ گرد و پیش کے مشاہدہ سے مہیّا کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کبھی کبھی غیر مبہم پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے۔ اور اپنے دل کی بات اشاروں میں اور ایک فلسفہ کے رنگ میں کہتا ہے لیکن یہ کہنا کہ اس کا مشاہدات سے کچھ تعلق نہیں۔ افترائے محض ہے ؛

فارسی شاعری میں تشبیہ کا مطالعہ نہ صرف یہ بتلاتا ہے۔ کہ اس کا مشاہدات سے گہرا ربط ہے۔ بلکہ ہم اس کے وسیع مطالعہ سے اس شاعری سے متعلق سوسائٹی کا بھی نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ مثلاً ایران میں 'آب ریزان' یا آب پاشان کا میلہ لگتا ہے۔ اس دن لوگ تیوہار مناتے ہیں، آب و گلاب ایک دوسرے پر پھینکتے ہیں۔ اور اپنی خوشی کا اظہار طرح طرح سے کرتے ہیں۔ ہمارے ایک شاعر نے اس کا حال ایک شعر میں بیان کرتے ہوئے اس دلکش تقریب کا نقشہ کھینچا ہے

یزد میں آب ریزاں کا تیوہار منایا جا رہا ہے۔ خوش جمال لڑکیاں اس تقریب کو منا رہی ہیں۔ بعض گلیوں اور کوچوں میں یہ منظر اتنا عام اور بے پردہ ہے۔ کہ دیکھنے والے پری جمالوں کے حسن کو دیکھ کر دم بخود رہ جاتے ہیں نظیری کہتا ہے ؎

آب پاشان است در کوے پری رویان یزد
تا نمانی پاے در گل چشم بر روزن مکن

اسی شاعر کا شعر ہے ؎

از سیاہ چشمان ہندی آب در چشمت نماند
آبریزان می شود در یزد چشمے آب دہ

ایران میں جب کوئی مرنے لگتا ہے۔ تو یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس میں زندگی کے آثار کہاں تک ہیں۔ آئینہ اس کے ہونٹوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ تاکہ جنبش لب سے کچھ اندازہ ہو سکے۔ محسن تاثیر اس کا ذکر اس رنگ میں کرتے ہیں :-

غمگساران دیارِ ما بہ تشخیصِ نفس
پیش لب گیرند چون آئینہ روے سادہ را

سعید اشرف کہتے ہیں :-

دیدہ چون محتاج عینک گشت فکر خویش کن
بر نفس دارند روز واپسین آئینہ را

مختصراً یہ کہ فارسی شاعری کا سرسری مطالعہ بھی اس راز کو منکشف کر دیتا ہے۔ کہ شاعر جس ماحول میں بستا ہے۔ اس میں محض گل و بلبل سے ہی نہیں بلکہ تمام گرد و پیش کے تأثرات سے کام لیتا ہے اور جہاں مواد حاصل کرتا ہے وہاں اس معاشرت کا منظر بھی پیش کرتا جاتا ہے۔ شاعرانہ مضامین تو خیر شاعری کا موضوع اصلی ہیں ہمارے شعرا، اپنے شعر میں بعض ایسی اصطلاحی اور فنی معلومات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جو ہمیں اس فن کی کتابوں میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ صرف مصطلحات وارستہ سے میں نے یہ چند اصطلاحیں شعرا کے اشعار سے اخذ کی ہیں۔ مثلاً

اسلیمی خطای (فن مصوری) ص۲۴
اقطاع (سلطنت) ص۲۷
انسی، وحشی (خطاطی: قلم) ص۲۹
پاے کلاغ (”) ص۴۰
بت اشرفی (مسکوکات) ص۴۲
طلاے دوبتی (”) ص۴۲
برات (سلطنت) ص۴۷
پرچین کاری (تعمیر) ص۵۴
تصویر سایہ دار (سنگ تراشی) ص۷۷
تیغ بخاک کردن (شکار) ص۸۲

جامۂ صورت (مصوری) ص ۸۵

حکم بیاضی (سلطنت) ص ۱۰۵

خطِ جواز (") ص ۱۱۵

ورق خام (") ص ۲۵۱

اس سے یہ بخوبی ثابت ہوا۔ کہ ہماری شاعری کا موضوع صرف گل و بلبل اور شمع و پروانہ ہی نہیں۔ بلکہ اس چمنستان کی آبیاری کے لئے شاعر ہر ہر جوئے خیال سے پانی لاتا ہے۔ یہاں ہم نے تشبیہ کا ذکر محض اجمالاً کیا ہے۔ کیونکہ اصل مضمون تمثیل کے متعلق ہے۔ جو سراپا مشاہدۂ واقعات پر مبنی ہے۔ جیساکہ پہلے بیان ہوا ہے۔ مرزا صائب اس فضا کے طایر بلند پرواز ہیں۔ اس لئے ذیل کی مثالوں میں اکثر انہی کے کلام سے استشہاد کرتے ہوئے گذشتہ دعوے کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے ۰

صائب کے مثالیہ مضامین

مرزا صائب کو بعض خاص مضامین اور اشیا سے خاص انس ہے اور ان کے تتبع میں ان کے مقلدین کے ہاں بھی وہ مضمون بتغیر الفاظ موجود ہے۔ مثلاً آئینہ، آسیا برق، بلبل، تاک، حباب، خضر، خورشید، گوہر، بحر، سیلاب، عنقا، شبنم و آفتاب، سرو، طفل دیوانہ، قفس، کشتی، صدف، مجنون، نگین وغیرہ مرزا کے کلام میں جو مثالیں ہیں۔ وہ بہت حد تک اسی خزانہ سے جمع کی گئی ہیں ۰

آئینہ۔ خدا معلوم یہ مغلبہ تمدن کے تکلفات و آرایش کے اثرات ہیں یا شعرا کی اپنی دلچسپی کہ ہمارے مثالیہ شعرا نے آئینہ اور اس کے اوصاف کے بارے میں بہت شغف سے کام لیا ہے۔ سلیم فرماتے ہیں :-

نیک و بد زمانہ بروں کردہ ام ز دل — آئینہ ہر چہ دید فراموش می کند

کلیمؔ جو اپنے زمانے کی عام بے مہری کے شاکی ہیں۔ آئینہ کی کشادہ روئی پر متعجب ہیں :۔

زبسکہ چین جبین در دیار ما عام است
کشادہ روئے آئینہ جائے حیران است

آئینہ کسی کے عیب نہیں چھپاتا۔ اور اس وصف میں وہ صاف دل لوگوں سے مشابہ ہے :۔

راز ما صافی دلان پوشیدہ نتوان یافتن
ہر چہ دارد خانۂ آئینہ بیرون در است (بیدلؔ)

آئینہ میں جو شخص اپنا منہ دیکھتا ہے۔ آئینہ اس کا عکس قبول کر لیتا ہے۔ اسے کسی کی نیک روئی و زشت روئی سے غرض نہیں :۔

خدمتِ دلہا کن اینجا کفر و دین منظور نیست
آئنہ از ہر کہ باشد مفت روشنگر بود (بیدلؔ)

آئینہ عکس سے بوجھل نہیں ہوتا :۔

بار دل عاشق نشود جلوۂ دہر
آئینہ ز عکس خویش سنگین نشود (قدسیؔ)

سلیمؔ آئینہ کے متعلق یہ خیال باندھتے ہیں :۔

لاف از نسب مزن کہ چو آئینہ در جہاں
آدم نمی تواں شدن از روئے دیگراں (سلیمؔ)

صائبؔ آئینہ کو کس صوفیانہ مضمون کی جلوہ گری میں استعمال کرتے ہیں :۔

محو و اثبات جہاں در دیدۂ حیران یکے است
فارغ است آئینہ از آمد و شد تمثالہا

شمع | آئینہ کی طرح شمع بھی مثالیہ شعراء کا محبوب مضمون ہے۔ ابتدا سے آخر تک کوئی ایسا شاعر نہ ہوگا۔ جس نے شمع و پروانہ کا ذکر نہ کیا ہو۔ ہمارے مثال گو شعراء نے بھی اس روشن چیز سے بہت محفل آرائی کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ چراغ بھی آتا ہے۔ جو اپنی افسردہ روشنی کے باوجود بہت کچھ جاذب توجہ رہا۔ اور شعراء سے دادِ تحسین وصول کرتا رہا۔ ناصر علی لکھتے ہیں :-

طلوعِ اخترِ دولت نصیب ناکس شد
سرِ چراغ بہ امدادِ خس بلند شود

صائب چراغ تخیل کو روغن تشبیہ سے یوں روشن کرتے ہیں :-

بود ملال بمقدار مال ہر کس را
بقدر روغنِ خود ہر چراغ می سوزد

سلیم وسعتِ مشرب کا سبق چراغ سے حاصل کرتے ہیں :-

مشربِ پروانہ دارم در طریقِ دوستی
شادمی گردم چراغ ہر کہ روشن می شود

صائب "چراغ تلے اندھیرا" کا مضمون یوں باندھتے ہیں :-

تیرہ بختی لازمِ طبعِ بلند افتادہ است
پاے خود را چون تواند داشتن روشن چراغ

صحبت ناجنس سے احتراز کی تلقین یوں ہوتی ہے :-

صحبتِ ناجنس آتش را بفریاد آورد
آب در روغن چو می ریزد کند شیون چراغ

سیلاب | سیلاب واقعی ایک توجہ خیز اور تخیل انگیز چیز ہے۔ اس کی ہیبت اور خوفناک شور و شیون کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنہیں کبھی کوہستانی

سیلاب کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔ اس کا جوش، اس کا سر کے بل گرنا، اس کی خانہ براندازی، اس کا کف بر دہان ہونا، اس کا پتھروں سے سر پھوڑنا، اس کا بے پرواہی سے خان و مان کو برباد کرنا اور اس قسم کے بیسیوں مضامین شاعروں نے سیلاب سے نکالے ہیں۔ جن کے متعلق بے شمار اشعار صائب اور دوسرے شعراء کے ہاں ملتے ہیں۔ جن کی تفصیل تطویل کا باعث ہو گی۔

ان بے شمار مثالوں اور تمثیلوں کو جو مثال گو شعرا کے ہاں ملتی ہیں۔ اگر جمع کیا جائے اور ان سے ان شعرا کے مشاہدات کا اندازہ لگایا جائے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے باکمال شاعر حقیقت میں فطرت کے نباض، نفسیات انسانی کے ماہر، علل و بواعثِ امور کی حقیقت سے آگاہ اور مظاہر و آثارِ قدرت سے پورے پورے واقف تھے۔ ان کے کلام میں انسانی جذبات کی لطیف سے لطیف نزاکتوں کا احساس موجود ہے۔ اور وہ شعر و سخن کی دنیا میں الہام سے ہی نہیں بلکہ اپنے مطالعہ و مشاہدہ کے بل پر بھی جیتے تھے۔ انہوں نے اخلاق کے وہ وہ نکتے مؤثر پیرایہ میں بیان کئے جو واعظین و معلمانِ اخلاق سے ممکن نہ تھے۔ مثالیہ شاعروں کے کلام میں جا بجا ہمیں قوانینِ قدرت، حقایق مسلّمہ، مناظر قدرت اور مظاہر طبعی، افعال و کردار انسانی، نفسیاتی کیفیات، تعلقات نسب و نسل کی پیچیدگیاں رسوم و رواج اور معاشرت کی باتیں اس کثرت سے دستیاب ہوتی ہیں کہ ہمیں اپنے شعرا کی قوتِ مشاہدہ کا قایل ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے۔ کہ فارسی شاعری محض گل و بلبل تک منحصر ہے۔ افسوس ہے۔ کہ آخری مثال گوؤں نے تقلید اور پیروی کے جذبہ کی وجہ سے اس خاص صنف کو نیا رنگ نہیں دیا۔ ورنہ یہ شاعری حقیقت کے قریب ہونے کی وجہ سے اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوتی۔

سیّد محمد عبداللہ

تبصرہ و تنقید

تذکرۂ بے نظیر :- تالیف سید عبدالوہاب افتخار دولت آبادی بہ ترتیب و تصحیح سید منظور علی ایم - اے - (سلسلہ انتشارات جامعہ الٰہ آباد سلسلہ عربی و فارسی جلد اوّل)، سینٹ ہاؤس الٰہ آباد، ۱۹۴۰ء، تعداد صفحات مطبوعہ ۱۶۶، طبع بحروف سربی، ملنے کا پتہ: کتابستان الٰہ آباد، قیمت عہ/ (دو روپے)۔

یہ تذکرہ نہایت کمیاب تھا - اب الٰہ آباد یونیورسٹی نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے - سید منظور علی ایم، اے، نے ۳۶-۱۹۳۵ء میں بحیثیت ریسرچ سکالر اس کو ڈاکٹر زبید احمد صاحب کی نگرانی میں مرتب کیا تھا - اب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کی نظر ثانی سے شائع ہوا ہے۔

تذکرۂ بے نظیر ان شعرائے ایران و ہندوستان کا تذکرہ ہے - جو بارہویں صدی ہجری کے پہلے ۷۲ سال میں ہو گذرے ہیں - مؤلف نے اس کو ۱۱۷۲ھ میں مکمل کیا - اس کے اہم مآخذ حسب ذیل ہیں (۱) سرو آزاد - (۲) تذکرۃ الشعراء علی حزین (۳) حیات الشعراء محمد علی خاں متین، اشعار کا انتخاب مؤلف نے خود کیا ہے - تراجم نسبتہً مفصل ہیں[1] خزانۂ عامرہ (تالیف آزاد ۱۱۷۶ھ) اور گل رعنا تالیف لچھمی نرائن شفیق (۱۱۸۱ھ) کے مآخذ میں اس کتاب کا شمار ہے (فہرست ریو ص ۹۷۷ و ۳۷۴، فہرست بانکی پور ج ۸ ص ۱۲۹)، کتابخانہ انڈیا آفس میں ایک ضخیم تذکرہ ۹۳۶ ورق کا موجود ہے (دیکھو فہرست ۶۹۲)

---

[1] مؤلف نے اپنا حال اور اپنے کلام کا انتخاب ص ۳۳ تا ص ۳۸ پر دیا ہے۔

جس پر مؤلف کا نام درج نہیں ہے۔ مولف فہرست کتاب خانہ مذکور نے اس کو تذکرہ بے نظیر سمجھا۔ مگر یہ گمان اس کا موجودہ تذکرہ سے غلط ثابت ہوتا ہے۔

یہ اڈیشن ایک ہی نسخہ پر مبنی ہے جس کی کتابت ۱۱۹۵ھ میں مکمل ہوئی اصل نسخہ خاصہ اچھا ہوگا اس لئے کہ صحت کے اعتبار سے متن اچھا ہے۔ البتہ کہیں کہیں غلطیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً ص ۵ س ۱۵ پر عُجالہ چاہیئے (بجائے عجّالہ)، ص ۷ س ۱۵ پر پیش بردہ چاہیئے (بجائے بیش بردہ)، ص ۱۴ س ۹ پر "وماھذا السیف الالیقتلا" درست نہیں۔ کوئی لفظ رہ گیا ہے۔ شاید "وما من ھذا السیف الخ" ہو۔ اسی صفحہ کی سطر ۲۱ میں مثل المفروق کی بجائے مثل المطوّق چاہیئے، ص ۷۷ س ۱۱ پر پُرتیر چاہیئے (بجائے پرتیز)، ص ۸۹ س ۸ پر دوست چاہیئے (بجای دولت)۔

آسان اُردو: انجمن ترقی اردو جوبلی ہل بنجارہ روڈ حیدرآباد۔ دکن نے آسان اردو میں تصنیفات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس میں رسالہ ہذا کا پہلا نمبر ہے۔ یہ رسالہ خاص طور پر بالغوں کے واسطے لکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد نوآموزوں کی لیاقت اور استعداد بڑھانا اور مفید معلومات سے انہیں آگاہ کرنا ہے اس نقطۂ نظر سے یہ تالیف پوری کامیاب ہے۔ اس کی زبان نہایت سادہ اور سہل ہے اور تمام مطالب آسان پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔

رسالۂ آسان اردو کے تین چار حصے ہیں۔ پہلا تاریخی جس میں مختلف مشاہیر کے حالات ہیں۔ دوسرا سماجی جس میں تین کہانیاں ہیں۔ "علمی تحریریں" تیسرے حصہ کا عنوان ہے۔ جو بجلی۔ ریل گاڑی۔ لاسلکی اور حفظان صحت پر کارآمد اور صحیح اطلاع کا حامل ہے۔ حصۂ نظم میں انیس، حالی، اکبر، اقبال، غالب اور ظفر وغیرہم کی نظمیں اور رباعیاں ہیں۔

مشاہیر کے حالات میں جس کا عنوان 'حالاتِ زندگی' ہے بعض غیر تاریخی روایتوں نے جگہ پالی ہے۔ مثلاً یہ قصہ کہ علاء الدین حسن شاہ بانیِ خاندان بہمنیہ نے اپنے آقا گانگو برہمن کی یاد میں اپنے آپ کو 'گانگو بہمنی' کہنا مشہور کیا۔ اگرچہ مؤرخ فرشتہ اس کا راوی ہے بالکل غیر تاریخی معلوم ہوتا ہے۔ قدیم مآخذ میں اس کا کہیں مذکور نہیں۔ بہمن اور برہمن میں سوائے اس کے کہ لفظی رعایت ہو اور کوئی مناسبت نہیں بہمن حسن کا نام ہے اور 'بہمن شاہ' نام اس کے بعض سکوں پر بھی پایا جاتا ہے عصامی کی فتوح السلاطین میں جسے ڈاکٹر آغا مہدی حسین آگرہ کالج نے مرتب کیا ہے حسن کے حالات میں شعر ذیل آتا ہے ؎

بسیرت فریدون و بہمن بنام	شدہ کنیتش بو المظفر مدام

یہی نہیں بلکہ یہ خاندان اپنے آپکو بہمن بن اسفندیار کی یادگار بتاتا ہے چنانچہ عصامی لکھتا ہے:-

بہرکار چون نام خود احسن است	چراغ خوش از دودۂ بہمن است

ایک اور موقعہ پر کہا ہے :-

دو صد لشکر از قوت یک تن است	کہ ہم بہمنی ہست وہم بہمن است

فرشتہ ایک رسالہ کا بھی ذکر کرتا ہے جو احمد نگر کے شاہی کتبخانہ میں اس کی نظر سے گذرا تھا۔ اس رسالہ کا موضوع خاندان بہمنیہ کی اصل و نسب کی تحقیقات تھی اور لکھا تھا کہ وہ بہرام گور کی اولاد ہیں جو ساسان بن بہمن کی نسل میں تھا۔ فتوح السلاطین میں جو بہمنی خاندان کی سب سے قدیم تاریخ ہے 'گانگو' یا 'گنگو' برہمن کا جو علاء الدین کا آقا کہا جاتا ہے کہیں مذکور نہیں آتا۔

'آسان اردو' میں خواجہ غریب نواز (شیخ معین الدین چشتی) کا مولد خراسان بتایا ہے حالانکہ وہ سجستان میں پیدا ہوئے تھے اسی بنا پر سجزی انکی نسبت ٹھہری جسے جہلا نے 'سنجری' مشہور کردیا۔ ان کا سالِ وفات ۶۳۶ھ لکھا ہے جو یقیناً غلط ہے فرشتہ نے ۶۳۳ھ دیا ہے۔ ابو الحسن تانا شاہ کے حالات میں تاریخ عہد سے قطع نظر کرکے نعمت خان عالی کے بعض بیانات پر زیادہ اعتبار کیا گیا ہے۔ آسان اردو کی لکھائی چھپائی

ایثار:۔ ایک چھوٹا سا ناول نورالحسن صاحب کی تصنیف ہے جسے انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے سلسلۂ اشاعت میں اس کا نمبر ۲ ہے۔ دو دوست واجد اور محمود کثرت ازدواج پر بحث کرتے ہیں کیونکہ محمود کے چچا ابا مشتاق کو بڑھاپے میں نئی شادی کا شوق سوجھا ہے۔ واجد کی دلائل سے قائل ہو کر محمود چچا ابا کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر الٹا اثر ہوتا ہے۔ بڑے میاں اپنی ضد پر اڑ جاتے ہیں اور نئی شادی رچاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ رشتہ داروں سے قطع تعلق ہوتا ہے۔ جن میں ان کی بڑی بیوی بدرالنسا اور بیٹی فخرالنسا بھی شامل ہیں۔ مشتاق صاحب کی نئی دلہن ماہ لقا ایک نہایت مغرور، خود غرض اور بے عقل عورت معلوم ہوتی ہے جو اپنی سوت اور سوت کی لڑکی کو مشتاق سے حکماً بلواتی ہے، وہ نئے گھر میں آتی ہیں۔ مشتاق ڈبل نمونیہ کے شکار ہو کر اس عالمِ فانی سے رخصت ہوتے ہیں۔ دلہن اپنے میکے واپس پہنچتی ہے۔ ادھر یک نشد دو شد مشتاق کے بھائی اشتیاق یعنی محمود کے والد ہیضہ کر کے راہی ملک بقا ہوتے ہیں۔ اب محمود تمام خاندان کا کفیل و مختار رہ جاتا ہے۔ واجد فخرالنسا کے ساتھ اپنی شادی کیلئے محمود سے درخواست کرتا ہے۔ محمود اس رشتہ کو بہت پسند کرتا ہے۔ ادھر محمود کی ماں بھی فخرالنسا کو محمود کی دلہن بنانا چاہتی ہے اور محمود کو اس رشتہ پر رضامند کرنا چاہتی ہے مگر محمود واجد کیلئے کوشش کرتا ہے۔ فخرالنسا محمود سے محبت کرتی ہے اور خود محمود کو بھی فخرالنسا سے دلی عشق ہے لیکن محمود کو اپنے اس جذبہ کی اس وقت اطلاع ہوتی ہے جب وہ واجد کا رشتہ فخرالنسا سے کر چکتا ہے دولہا دلہن کو ایک شاد کام ازدواجی زندگی کا موقعہ دینے کیلئے محمود ایک رات گھر سے غائب ہو جاتا ہے اور ایسا غائب ہوتا ہے کہ آج تک پتہ نہ چلا۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

محمود کی اس قربانی کی بنا پر افسانہ کا نام ایثار رکھا گیا ہے لیکن دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ایسے ایثار کو انتہائی حماقت کے نام سے یاد کرینگے جس کی پاداش میں دو جانیں تا دم مرگ ناشاد و نامراد زندگی بسر کرنے پر مجبور رہوں۔ چھوٹی تقطیع۔ ۷۶ صفحات۔ قیمت ۸ر۔

ملنے کا پتہ:۔ معتمد انجمن ترقی اردو۔ بنجارہ روڈ۔ حیدرآباد۔ دکن،

وقال: كان مجد الدين يتولّى النقابة على الطالبين، و
انشد نی لنفسه ما يكتب على قوس بندق :-

حملتنی راحة فی جودها للخلق راحه
فانا اهل بنیل وهی اهل للسماحه

توفّی فی رجب سنة احدی وثمانین وخمسمائة

(٣٠١) مجد الدين بن عبد الله بن محمد بن علی الجَرباذَقانیّ القاضی

كان من القضاة الاعاظم وارباب الفضائل الغزيرة من الاعاجم، له فی الفقه طبع كالبحر الزاخر، وفی الادب فكر كالغيث الهامر،

(٣٠٢) مجد الدين بن عبد الله بن محمّد بن علیّ الهمذانی القاضی

من اولاد القضاة والعلماء، وقدم بغداد وشهد عند قاضی القضاة عزّ الدين احمد بن الزنجانی فی شهر ربيع الآخر سنة احدی وثمانین وستّمائة وكان رفيقی لمّا وُلّیَ تدريس المدرسة التتشية وكنتُ برباط الابری؛

(٣٠٣) مجد الدين ابو القاسم عبد الله بن محمّد ابن عمر الاصفهانی المحدّث

مجد الدين عبد الله بن محمّد بن محمّد بن ابی بكر الطبری نزيل المدينة شرّفها الله تعالى

ذکره الحافظ جمال الدین احمد بن علی القلانسی

فی شیوخه، وقال: اجاز لنا من المدینة شرّفها

الله تعالی سنة ثلاث وسبعین وستمائة؛

(۳۰۴) مجد الدین عبد الله بن جلال الدین محمد

ابن بهاء الدین ابی المکارم محمد بن النجیب

الکاشغری

احد الاولاد النجباء، وله اخوة کرام ذوو فضائل و

معانی وآداب رأیتهم سنة ست وسبعمائة بتبریز؛

(۳۰۵) مجد الدین عبد الله بن محمد بن مسعود

البغدادی

اقام بتبریز واستوطنها، ذکر لی انّه سمع الحدیث

ببغداد، ورأیته سنة اربع وسبعمائة؛

(۳۰۶) مجد الدین ابو محمد عبد الله بن محمد بن یحیی بن خمیس

الجزری الخطیب

قرأت بخطه فی جملة کتاب کتبه:-

اقول لعینی حین جادت بوصلها

وانسانها فی لجّة الدمع یغرق

خذی بنصیب من محاسن وجهها

دعی الدمع للیوم الذی نتفرق

(۳۰۷) مجد الدین ابو الفضل عبد الله بن شهاب الدین

---

[1] راجع ایضاً الجواهر المضیئة لعبد القادر القرشی (۱: ۲۹۱) والفوائد البهیه ص ۱۰۶، وذیل بروکلمن ۱: ۳۸۰؛ وکتابه المختار للفتوی کتاب شهیر فی الفقه الحنفی؛

ابی الثنا محمود بن مودود بن بُلدَجی - نزیل بغداد المَوصِلی القاضی المحدّث المدرّس

شیخنا الامام العالم المحدّث الفقیہ القاضی، قدم بغداد سنة ستّین وستّمائة، وشہد عند قاضی القضاة عزّ الدین الزنجانی سنة ثلاث و سبعین وستّمائة، ووَلِیَ القضاء بالکوفة واعمالها ثُمّ فُوّض الیہ التدریس بمشہد الامام ابی حنیفة، فکان علی ذلک الی ان توفّی، وکان واسع الروایة موصوفًا بالفہم والدرایة، عارفًا بالفروع والاصول کثیر المحفوظ، سمعنا علیہ کتاب جامع الاصول فی احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلّم بروایتہ عن مصنّفہ المبارک[1] بن الاثیر، روٰی عنہ وعن اخویہ عزّ الدین علی[2] وضیاء الدین نصر اللہ[3] وسمع صحیح البخاری علی ابی الحسن علیّ[4] بن روزبہ وابی بکر مسمار[5] بن العویس، وسمع الخطب النباتیّة علی عمر[6] بن طبرزد، وکتاب نہج البلاغة علی النقیب

---

[1] ہو مجد الدین ابن الاثیر (م ۶۰۶ھ) صاحب النہایة فی غریب الحدیث، و جامع الاصول، [2] عزّ الدین بن الاثیر (م ۶۳۰ھ) صاحب تاریخ الکامل و اسد الغابة، [3] م ۶۳۷ھ وہو صاحب المثل السائر؛ [4] ہو علی بن ابی بکر بن روزبہ (م ۶۳۳ھ)؛ الشذرات (۵ : ۱۶۰)، [5] قال الزبیدی انہ محدّث بغدادی ولم یذکر سنة وفاتہ؛ تاج العروس (۳ : ۲۸۰)؛

[6] م ۶۰۷ھ؛ الشذرات ۵ : ۲۶؛

کمال الدین حیدر بن محمّد بن زید، وسافر الی الشام، وروی عن جماعة، وله تصنیف، وکتب خطّه بالاجازة قدیمًا وقد اجازه ابن الصفّار[1] والرضیّ[2] الطوسی وابن السّمعانی[3]، وزینب[4] بنت الشعری وغیرهم، ومولده بالموصل فی اواخر شوّال سنة تسع وتسعین وخمسمائة وتوفّی فی المحرّم سنة ثلاث وثمانین وستّمائة، ودُفِن فی قبّة الامام ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ؛

(٣٠٨) **مجد الدین** ابو محمّد **عبد الحمید** بن عبد السیّد بن علیّ البُرسُفیّ[5] الفقیه الفرضیّ کان فقیهًا عالمًا وفرضیًّا حاسبًا، [قال:] قال ثعلب مارُوِیَ فی التوسّط احسنُ من قول علیّ بن ابی طالب علیه السلام. انّ دین الله تعالیٰ بین الغالی والمقصّر، فعلیکم بالنُّمرُقة الوسطیٰ، فانّ بها یلحق المقصّر والیها یرجع الغالی؛

---

[1] م ٦٣٣ھ، انظر کتاب الکاشف ص ١٢٣، [2] ابو بکر القاسم المقدّم ذکره، [3] مؤیّد بن محمّد (م ٦١٧ھ)، الشذرات ٥: ٧٨، [4] فخر الدین عبد الرحیم بن عبد الکریم (م ٦١٧ھ)، الشذرات (٥: ٧٥)، [5] م ٦١٥ھ، الشذرات ٥: ٦٣، [6] البُرسُف قریة من سواد بغداد فی طریق خراسان؛ معجم البلدان (١: ٥٦٦)؛

(۳۰۹) مجد الدین ابو الفضل عبد الحمید بن محمّد بن ابراهیم الخوارزمیّ الفقیه

کان فقیهاً عالماً بامور الناس کثیر الاطلاع علی تواریخ الخلفاء وسیرهم؛ قال: کان موسیٰ بن عبد الملک[1] متحاملاً علی نجاح[2] بن سلمة شدید البغض له، فلمّا سلّم الیه تلف فی یده لما طالبه بالمال، فقال المتوکّل یوماً لابی العیناء[3]: ما قولك فی نجاح بن سلمة؟ فقال: اقول فیه کما قال اللہ تعالیٰ: فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ؛ فضحك المتوکّل وتغیّر لموسی، وعلم موسی انه أُتِیَ من ابی العیناء فتوعّده بالقتل فقال: یا مُوسَىٰ أَتُرِيدُ أَن تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ؛ فترضّاه بمالٍ حتّی امسك عنه؛ روی عن مجد الدین ابی سعد عبد اللہ بن عمر بن ابی نصر احمد بن ابی سعد منصور الصفّار النیسابوریّ

---

[1] هو موسی بن عبد الملك الاصفهانی صاحب دیوان الخراج، توفّی سنة ۲۴۶ھ؛ الوفیات (۲: ۱۴۱ بما بعدها) [2] هلك سنة فی ذی القعدة سنة ۲۴۵ھ؛ انظر تاریخ الطبری ۳: ۱۴۴۰ و تاریخ الکامل حوادث سنة ۲۴۵ھ

[3] هو محمّد بن القاسم بن خلّاد الادیب الظریف المتوفّی سنة ۲۸۲ او ۲۸۳ھ، ترجم له ابن خلّکان فی الوفیات (۱: ۵۰۴ بما بعدها) وذکر هذه القصّة ایضاً و غلط فی موضعین منها؛

(۳۱۰) **مجد الدین** ابو البقا عبد[1] الدائم بن تاج الدین عبد الرحیم بن عبد الرحمن بن محمود۔ یعرف بابن بُلدجی الموصلیّ الفقیہ المعدّل

کان عالمًا ادیبًا انشد فی بعض امالیہ :-

واشرقت الدنیا بانوار عدلہ ۔۔۔ فآفاقہا زُھرٌ واکنافہا خُضرٌ

وزاد بہ الدین الحنیفیّ رِفعۃً ۔۔۔ فللدّین والدنیا بدولتہ الفخرُ

(۳۱۱) **مجد الدین** ابو الفرج عبد الرحمٰن بن احمد بن عبد الرحمٰن الداوودیّ البَلَخیّ القاضی بالحدیثۃ

ذکرہ القاضی تاج الدین یحیی بن القاسم بن المفرّج التکریتیّ فی تاریخہ ، وقال: کان شیخًا عالمًا فاضلًا دیّنًا کثیر التعبّد ، وَلِیَ قضاء الحدیثۃ بعد موت القاضی بھا ، یحیی بن ابی الشتاء ، ولم یزل علی تدریسہ وقضائہ الی ان مات بھا ؛ قال: وکتب لِیَ الاجازۃ بما سمعتہ علیہ وصورتھا : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سمع مِنّی الولد العزیز الصالح الفقیہ المقری یحیی بن القاسم بن المفرّج نفعہ اللہ بعلومہ ومسموعاتہ بقراءتی تدریسًا من کتاب الوسیط للامام ابی الحسن علی بن احمد الواحدی[2] عن ابی الفضل احمد بن طاھر النیسابوری عن المصنّف وذکر کتبًا اُخر ؛

---

[1] ھو غیر ابی الحسین عبد الدائم بن محمود اخی عبد اللہ بن بلدجی الذی ترجم لہ عبد القادر القرشی فی الجواھر المضیئۃ (۱ : ۲۹۸) ، [2] م ۴۶۸ ھ ؛

(٣١٢) **مجد الدين عبد الرحمن بن عبد الله بن الحسن بن علي بن عبد الله البغدادي**

من بيت الولاية والرياسة، وسمع معنا مجد الدين [بن] عبد الله من الصاحب محي الدين ابی محمد يوسف[1] ابن الجوزی استاد الدار، واجتمعت به فی تبريز سنة خمس وسبعين وستمائة، وكان بينی وبينه صحبة، ورجع الی بغداد وولی بعض الاعمال، وتوفی فی شهر ربيع الآخر سنة ثلث وثمانين وستمائة، ودفن بمشهد الحسين عليه السلام؛

(٣١٣) **مجد الدين** ابو الفتح عبد الرحمن بن عبد المجيد ابن عبيد الله العُبيدی التبريزی المؤذن

كان شيخا صالحا عارفا بالتواريخ والسير، كثير المطالعة فی كتبهم (كذا)، قرأت بخطه فی كراسة قد انتخبها وجمعها لنفسه ان[2] ابا العباس[3] الاصفهانی، وكان فی غاية السقوط والرقاعة، فولی [؟ ولی] الوزارة للمتقی؛ وكان ببغداد فی ايامه قرد مُعَلَّم، فقال له القراد: اترضى ان تكون عطارا؟ فيقول برأسه: نعم، ويعدّ له الصنائع فاذا قال له: اترضى ان تكون وزيرا؟ فيقول برأسه: لا؛

(٣١٤) **مجد الدين** ابو محمد عبد الرحمن بن فضل الله

---

[1] م ٦٥٦ھ؛ [2] ل: منها ان، [3] انظر نبذا من اخبار الاصفهانی فی كتاب الاوراق للصولی (اخبار الراضی والمتقی) بحسب الفهرس؛

ابن الحسن النور ابنشتيُّ المحدّث
من المحدّثين المتأخّرين العارفين بالحديث
وعِلَلِه وفقهه وناسخه ومنسوخه وتفسيره ؛

(٣١٥) **مجد الدين** ابو الرضا **عبد الرحيم** بن ابي بكر
بن سالم المزدنيّ المُقرِي

كان من قرّاء العلماء وكان اديبًا ؛ [قرأت بخطّه :]
حكى عليّ بن يقطين انّه رأى الحسن بن راشد واقفًا
بباب يحيى بن خالد فمضى فى حاجة له ورجع وهو
واقفٌ ، فقال له : انت واقفٌ بباب هذا بعدُ ؟ فقال :
نعم ! وما وقف موسى بباب فرعون اكثر ؛ فبلغ ما جرى
بينهما يحيى بن خالد فاستدعى ابن راشد وقضى
حوائجه ، ثمّ قال : الحمد لله الذى لم يجعل معك
عصًا ينقلب عينها ولا جعلنى ادّعى ما ادّعاه فرعون ،
فانصرف ابن راشد وهو خجِلٌ ؛

(٣١٦) **مجد الدين عبد الرحيم** بن الحسن بن عبد القاهر
بن الحسن الشهرزورى الموصلى

(٣١٧) **مجد الدين** ابو القاسم **عبد الرحيم** بن حمد بن
اسماعيل البالسيّ الكاتب

كتب : اسعد الله الحضرة المولويّة بعزٍّ دائم الخلود ومجدٍ
شامخ العمود ، وايّدها بعيشٍ ناضر العود ظاهر السعود ،
ولا برح سيب نوالها على العفاة مدرارًا ، وسيف اقبالها

علی العداة مغواراً ، ولازالت السعادة تخدمها لیلاً و نهاراً والسلامة تصحبها سرّاً وجهاراً ؛

(٣١٨) **مجدُ الدین** ابو محمد **عبدالرحیم** بن عبدالعزیز بن الحسین الشّروانیّ الصوفی

من کلامه ، قال : اخبرنی شهاب الدین یعقوب بن المجاور بدمشق ، قال : اخبرنی بهاء الدین علیّ بن محمد بن الساعاتی ، قال : سایرت الفقیه الاجلّ مرتضی الدین نصر الشیزری فجری من الحدیث ما اوجب ان قال :—

انّ هذی النفوس للموت تسعیٰ

واستجازنی فقلت :—

فاذا قیل مات لم یک بِدْعا

(٣١٩) **مجدُ الدّولة** ابو الحسن **عبدالرّشید** بن مسعود بن محمود بن سُبُکتکین الغزنویّ صاحب غزنة

کان من اولاد السلاطین ذوی الهمم العَلیّة ، ولاجله صنّف . . [١] . . . کلیله ودمنه ، وترجمها من اللغة العربیّة الی اللّغة الفارسیّة وشحنها بالحکایات و الابیات ؛

---

[١] بیاض بالاصل ولا نعلم الذی اراده المصنّف کما لم نعرف شیئًا من احوال المترجم عبدالرشید ؛ امّا کتاب کلیله ودمنه فاوّل من ترجمهٗ الی اللغة الفارسیّة نثراً هو نصرالله بن محمّد بن عبدالحمید ، فانّهٗ ترجمهٗ لبهرام شاه الغزنویّ قریبًا من سنة ٥٣٩ ؛

(٣٢٠) **مجد الدين** ابو البركات **عبد السلام بن ابی محمد**
عبد الله بن ابی القاسم الخضر بن محمد۔ یعرف
بابن تیمیة۔ الحرانی الفقیه المحدث

من بیت العلم والفقه والدیانة والخطابة والتحدیث،

قرأت بخط شیخنا المفید عز الدین عمر بن دهجان

البصری، وکتبه لی بخطه فی ثبتی: سمعت علی الشیخ

الجلیل العالم الفاضل بقیة الاماثل مجد الدین ابی

البرکات عبد السلام بن ابی محمد عبد الله بن الخضر

الحرانی الفقیه الحنبلی المدرس المصنف جزء الانصاری

بسماعه من ابی علی ضیاء بن الخرنف، وحدث ببغداد

بجامع الحقیبة من الجانب الغربی، بکتاب منتقی الاحکام

من جمعه، فسمعه جماعة وحضرت السماع مجلسا

او مجلسین سنة احدی وخمسین وستمائة، و

توفی الشیخ فی لیلة عید الفطر سنة اثنتین وخمسین

وستمائة[1]؛

(٣٢١) **مجد الدین** ابو طاهر **عبد السلام بن محمد**
ابن عبد الجبار بن محمد القومسی الفقیه

قال: ولی المنصور سلیمان بن راشد الموصل وضم الیه

الفا من العجم، وقال له: قد ضممت الیک الف شیطان

تذل بهم الخلق، فلما دخل الموصل عاثوا فی نواحیها،

---

[1] انظر ترجمته فی الشذرات (٥: ٢٥٧) و بروکلمن (١: ٣٩٩)؛

وقطعوا الطُرق ، وانتهى الخبر الى المنصور فكتب اليه يوحنّا ، فكتب فى الجواب : وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا ؛ فضحك المنصور وصرفهم واستبدل بهم ؛

(۳۲۲) مجد الدين ابو الخير عبد الصّمد بن احمد ابن عبد القادر بن ابى الجَيْش القُطفُتِىّ البغدادىّ الخطيب المحدّث المقرى

شيخنا العالم العامل بقيّة السلف الصالح من مشاهير العلماء والقرّاء ، كثير التلاوة للقرآن المجيد ، وتفقّه على مذهب الامام احمد . ولمّا تمّت عمارة مسجد قمريّة تقدّم اليه للصّلوٰة فيه فلازمه ، واشتغل بالاحاديث النبويّة والعلوم الادبيّة وتولّى مسجد دار سوسيان ، ورتّب بعد الواقعة فى الخزن بدار الشاطئ ، وتقدّم له بالخطابة بجامع الخليفة فخطب فيه ، وانشا خُطَباً بليغةً وسمّها بكتاب صنوف الضيوف فى الخطب المرتّبة على الحروف ، وصنّف لنفسه مشيخة ذكر فيها مشائخه ، ومن سمع عليه الحديث ومن انشده من اصحابه ، و كان ولده فى المحرّم سنة ثلاث وتسعين وخمسمائة و توفّى يوم الخميس سابع عشر شهر ربيع الاوّل سنة ستّ وسبعين وستّمائة ، وصُلّى عليه بجامع بهليقا وبجامع المنصور[1]

---

[1] راجع لترجمته الى تذكرة الحفاظ (۴ : ۲۵۵) و الحوادث الجامعة (ص ۳۹۶) وتاريخ العراق (۱ : ۲۸۸) والشذرات (۵ : ۳۵۳) ؛

وعملت تعزيته بالمستنصرية وتكلم فيه شيخنا جلال الدين ابن عكبر ورثاه بابيات اولها :-

بكى الدين والقرآن والنسك والزهد
لفقدك مجد الدين وانتحب المجد

فيها :-

الى الصمد العالى دعيت كرامة كذا الذى يدعى الى الصمد العبد
وامسيت جاراً لابن حنبل الذى به نصر الاسلام والتفم الرد[١]

ودفن بحضرة الامام احمد رضى الله عنه ؛

(٣٢٣) **مجد الدين** ابو على عبد الصمد بن الحسين ابن محمود بن على الاشنهى[٢] الفقيه الفرضى

كان فقيهاً حاسباً فاضلاً ، حدث بسنده عن الحسن عن عبد الله بن مغفل قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إنّ اسوأ الناس سرقة الذى يسرق من صلاته ، وانّ ابخل الناس من بخل بالسلام ، وانّ اعجز الناس من عجز عن الدعاء ؛

(٣٢٤) **مجد الدين** ابو الفضل عبد الصمد بن الشافعى ابن على النهاوندى الواعظ

ذكره القاضى تاج الدين يحيى بن القاسم بن المفرج التكريتى فى تاريخه ، وقال : كان احد الفقهاء بالمدرسة

---

[١] مقطوع بحاشية الاصل والتكميل عن القياس ؛ [٢] نسبة الى اشنه بلدة فى طرف اذربيجان ؛ معجم البلدان (١ : ٢٨٤)

النظاميّة ، وهو فقيه مجوّد وواعظ متكلّم من بيت العلم والتصوّف ، سمع دروسی بالنظاميّة ، وکان يحضر الدرس ولا يفوته من کلامی شیئ ، قال : وسمع منّی کتاب مسند الامام الشافعی بقراءة کمال الدين ابی سالم محمد بن طلحة النصيبیّ فی سنة عشر وستّمائة ؛

(٣٢٥) مجد الدين ابو محمّد عبد الصّمد بن ابی الکرم ابن رستم العسکریُّ الاديبُ

انشد لابن الرومی - وقد اجاد ماشاء :-

مدیحی عصا موسیٰ و ذلك انّنی ضربت بها بحر الندی فتضحضحا

فياليت شعری ان ضربت بها الصّفا انبعث لی منه سحائب سُيّحا

کتلك التی ابدت قوی لارض يابساً وابدت عيوناً فی الحجارة سفّحا

سامدح بعض الباخلين لعلّه ان اطّرد المقياس ان يتسمّحا

يعنی بعصا موسی التی ضرب بها البحر فيبس وضرب بها الحجر فانبجس ؛

(٣٢٦) مجد الدين ابو العزّ عبد الصّمد بن المظفّر بن ابی الفرج التکريتیّ المقری

کان من المشائخ القرّاء العلماء ؛ روی باسناده عن عبد الله بن عبّاس رضی الله عنهما قال : قال رسول الله صلی الله عليه وسلّم : من سمّع سمّع الله به ، ومن رايا رايا الله به ؛ قال : يقال : سمّعتُ بالرجل تسميعًا اذا ندّدت به وشهّرته ؛ وعن ابن المبارك انّه قال لمّا رواه :

سمّع الله به اسامع خلقه؛

(٣٢٧) **مجد الدين** ابو الفضل **عبد العزيز بن اسماعيل** ابن عبد المجيد السّاويّ الفقيه

حدّث بسنده الى كعب بن عُجْرة قال . قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : يا كعبُ الصلاة نورٌ، والصوم جُنّةٌ، والسّكينةُ مَغْنَمٌ، وتركها مغرمٌ، كلّ الناس غادون فبائعٌ نفسَهُ فموبقها، وفادٍ نفسَهُ فمُعتِقُها؛

(٣٢٨) **مجد الدين** ابو المعالى **عبد العزيز بن جَنْتَمُود** من موالى تاج الدين زيرك البخاريّ الأمير

قدِمَ بغداد سنة ثمانين، واتّصل ببنت الامير فلك الدين محمد بن الدويدار الكبير، وكان شابّاً كيّساً عاقلاً مليح الصورة، حسن الكتابة كثير المحفوظ، وكان قد اجتمعت به بمراغه سنة احدى وسبعين وستّمائة، وممّا انشدنى من محفوظه :-

قد صيّرنى الهوى اسيرالذلّه ... واستنهكنى وما بجسمى عِلّه
واستأصل هجرُهُ بصبرى كُلّه ... لاحول ولاقوّة الّا بالله

(٣٢٩) **مجد الدين عبد العزيز بن الامام العالم حجّة الدين** المصرى الفقيه [79b 80a]

سمع عوالى امام الهجرة ابى عبد الله مالك بن انس الاصبحيّ على الشيخ الامام كمال الدين ابى الحسن علىّ بن

---

[1] م ١٥ م انظر ترجمته فى اسد الغابه (٤ : ٢٤٤)؛

شجاع بن سالم القرشی بقراءة ولده محی الدین[1] ابی الفضل محمّد سنة ستّ وثلاثین وستّمائة؛

(٣٣٠) **مجد الدین** ابو المحاسن **عبد العزیز بن علیّ بن منصور الاربلیّ النّسابة الفقیه**

قال: سأل زیاد دَغْفَلَ[2] النّسابة عن العرب فقال: الجاهلیّة للیمن، والاسلام لمُضَر، والفتنة لرَبیعة؛ قال: فاخبرنی عن مضر؛ قال فاخِرْ بکنانة وحارِبْ بقَیس ففیها الفرسان والنجدة، فامّا اسد ففیها ذُلٌّ ونَکَدٌ؛

(٣٣١) **مجد الدین** ابو محمّد **عَبد العزیز بن الحسَین ابن الحسَن الخلیلیّ الدّاریّ**

ذکره شیخنا صدر الدین ابراهیم بن شیخ الشیوخ سعد الدین الحمّویھی الجوینی فی **مشیخته**؛

(٣٣٢) **مجد الدین** ابو محمّد **عَبد العزیز بن شهاب الدین عمر بن القاسم التکریتیّ الفقیه**

ذکره عمّه[3] فی کتاب الاختصاص فی التاریخ الخاص فی ذکر من قرأ علیه من اهله وروی عنه؛ وکان فقیهًا بالنظامیّة، وانشد:—

---

[1] ذکره المصنّف فی موضعه (ص ١١٧ ب ١١٨ الف) [2] نظر اخبار دغفل (ومنها ما ذکره المصنّف) فی العقد الفرید (٢: ٣٠٢)

[3] هو القاضی تاج الدین یحیی بن القاسم؛

تخيّر صالح الاعمال واعجل　　فانّ العمر ضيف لا يعود
هى الايّام بالاحداث حبلى　　هى الاقدار حاملة وسود

(٣٣٣) مجد الدين ابو الفتوح **عبد العزيز بن هاشم ابن ابى الحسن بن الكبش الشهرابانىّ الكاتب**

من بيت معروف بالتصرّف والتصدّر، عارف بالاعمال والعمّال، خدم فى ايّام الخلفاء، ورأيته وهو شيخ عارف بفنّه عند شيخنا وصاحبنا نجم الدّين ابى الفضل احمد ابن علىّ بن ابى الفرج البوّاب البغدادىّ سنة ثلاث و ثمانين وستّمائة وكتبت عنه اناشيد؛

(٣٣٤) مجد الدين ابو محمّد **عبد الغافر بن اسماعيل الفارسىّ الصوفى**

كان من العلماء، وله قناعة تمنعه عن التطلّع عمّا [وكذا] فى ايدى الناس، وكان دائم الخلوة، وانشد:—

لا يأسف المرء للارزاق ان قصرت
ولا يطيلنّ طول الدّهر من أمله
انّ المنايا لذى الآمال راصدة
والرزق اسرع نحو العبد من أجله

(٣٣٥) مجد الدين عبد الكريم بن حاجى بن الياس المراغىّ

رأيته بمحروسة السلطانيّة فى المرّة الثانية سنة ست

---

[١] له ذكر فى تاريخ العراق (١ : ٢٥٠)؛

عشرة وسبع مائة، وكتبت منه ما لم اعرفه من الاحوال؛

(۳۳۶) مجد الدين ابوسعد عبد اللطيف بن الحسن ابن احمد بن الحسن بن عبد اللطيف الفهري الهمذاني الخطيب

رأيته واجتمعت بخدمته بمدينة همذان لما توجهت الى الحضرة صحبة النقيب الطاهر رضي الدين[1] علي ابن طاوس في شوال سنة اربع وسبعمائة؛ فرأيته لطيف الاخلاق جميل الهيئة حسن الجملة والتفصيل واحضر نسبه الى امين الامة ابي عبيدة بن الجراح، وذكر ان منصب الخطابة فيهم، والنسب الذي ذكره هو عبد اللطيف بن الحسن بن احمد بن الحسن بن عبد اللطيف بن عبد الواحد بن احمد بن بندار بن بشر بن بشير بن سعد بن سعيد بن ابي الفضيل بن فلاح بن ابي عبيدة؛ ولا يصح نسبه عند ارباب المعارف؛

(۳۳۷) مجد الدين ابو المجد عبد اللطيف بن هبة الله بن شفروه[2] الاصفهاني الشاعر

كان شاعراً مجيداً وله ديوان بالفارسية يشتمل على الفنون

---

[1] هو رضي الدين علي بن رضي الدين علي بن طاوس، توفي والده سنة ۶۶۴ھ ولم اعلم سنة وفاته؛ انظر روضات الجنات ص۳ ۳۹۶-۳۹۶؛ [2] لعله من ولد شرف الدين محمد شفروه الشاعر الفارسي الشهير؛

وكان يحاضر بالاشعار العربيّة ، وسمعت عنه انّهٗ نظم
باللغتين وانشد :ـ

كُن حيث شئت من البلاد فانت من قلبي قريبٗ
حُزت الملاحة فاستوٰى عندي حضورك والمغيبٗ

(٣٣٨) مجد الدين ابو المجد عبد الماجد بن سلمان
بن الحسين الطسفونجيُّ الواعظُ

كان واعظًا حافظًا حسنَ الوعظ ، حدّث بسندهٖ عن ابي
هريرة رضي الله عنه قال : ثلاث من كنوز البرّ ، كتمان
الصدقة ، وكتمان المرض ، وكتمان المصيبة ؛ قال الاحنف
لاصحابه : أتعجبون من اخلاقي وحلمي ؟ قال : عَرَض
لي وجع فتمنّيت ان ألقىٰ بعض اهلي فاشكو اليه ، فقال لي
صعصعة بن مُعَاوِيَةَ ، لا تشك الذي بك الى مخلوق
مثلك ، بل اشك ما تجدهٗ الى عالم السرّ فهو الذي يعافيك ؛

(٣٣٩) مجد الدين ابو الفضل عبد المجيد بن ابي بكر
ابن محمّد يعرف بابن قاضي باصيدا الاربليّ القاضي
رأيتهٗ بمراغة سنة خمس وستين وستمائة ، وصعد
الى الرصد وكتبت عنه :ـ

تَرَى حُرِّمَت كتب الاخلاّء بينهم
ابِنْ لي ام القرطاس اصبح غاليا
فما كان لو سايلتنا كيف حالنا

لہ طسفونج مدینہ کبیرة فی شرقی دجلہ ، ذکرھا یاقوت فی معجم البلدان (۳ : ۵۳۷)؛

فقد دهمتنا نكبةٌ هي ماهيا

فهنيك عدوّى لاصديقى فانّنى

رأيت الاعادى يرحمون الاعاديا

(٣٤٠) مجد الدين ابو الفضل عبد المجيد بن الحسن ابن الحسين بن العلا

كان عالمًا بالآداب ومعرفة وجوه الاعراب ؛

(٣٤١) مجد الدين ابو محمّد عبد المجيد بن الحسن ابن عبد الوارث النهاوندىّ الصوفى

ذكره جمال الدين ابو عبد الله محمّد بن سعيد بن الدبيثى فى تاريخه، وقال : هو نهاوندىّ الاصل، بغدادىّ المولد والمنشأ ، سمع ابا البدر ابراهيم بن محمّد الكرخىّ وطبقته ، كتبنا عنه ، ومولده فى شهر رمضان سنة احدى وثلاثين وخمسمائة وتوفى ليلة الجمعة ثانى شهر رمضان سنة اثنتى عشرة وستمائة ؛

(٣٤٢) مجد الدين ابو طاهر عبد المجيد بن خليل ابن داود بن الخضر الورامينىّ الكاتب

كتب الى بعض الرؤساء :-

يا من له الفضل الغزير ومن به	ترجى الامور بفعله المحمود
انت الذى بهر الانام مناقبًا	ومآثرًا جلّت عن التحديد

١م ٥٣٩ هـ ؛ الشذرات (٤ : ١٢١)، ٢ بليدة قرب الرّى ذكرها ياقوت فى معجم البلدان ؛

انت الذی شیّدت ارکان لندای ‏ بجمیل رأیک ارفع التشیید

فاسعد بنیروز اتاک معظّماً ‏ فلقد اتاک مبشّراً بخلود

(۳۴۳) مجد الدین ابو محمّد **عبد المجید** بن عبد الله ابن ابراهیم الجرجانیّ الادیب [80 b, 81 a]

کان ادیباً عالماً ظریفاً، قال : جاء رجلٌ الی مزید فقال لہٗ : اُحِبّ ان تخرج معی فی حاجۃٍ لی ، فقال : ھذا یوم الاربعاء ولستُ اَبرح بیتی ، فقال لہ الرجل : وما تکرہ من یوم الاربعاء وفیہ ولد یونس بن متّٰی ؛ فقال : لا جرم ابتلعہ الحوت ؛ قال : وفیہ ولد یوسف ایضاً ، فقال : قد عرفت ما تمّ علیہ من اخوتہ ومن حبسہ ، قال : فیہ نُصِر رسول الله صلّی الله علیہ وسلم علی الاحزاب ، فقال : بعد ان " زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ "[1] ؛

(۳۴۴) مجد الدین ابو علی **عبد المجیّد**[2] بن عبد الله بن عبد الرحمٰن یعرف بابن الصبّاغ البغدادیّ الحکیم الطبیب یعرف بسنجر

الحکیم الفاضل والطبیب الکامل ، اشتغل وحصّل وکتب ودأب ، وعاشر الوزراء والملوک ، ولازم الصاحب شرف الدین ھارون واباہ الصاحب شمس الدین محمّد ابن الجوینیّ سفراً وحضراً ، وقدم بغداد سنۃ ثمان

---

[1] القرآن الکریم سورۃ الاحزاب (۳۳) الآیۃ (۱۰) ؛ [2] انظر ترجمتہٗ فی تاریخ العراق (۱ : ۴۱۱) ، والدرر الکامنۃ (۲ : ۴۲۳) ایضاً ؛

وثمانين فى ايّام السلطان العادل ارغون، ومعه فرمان بخزانة كتب المستنصريّة، وان يكون يعتبر الاطبّاء والصيادلة بالعراق، فمن ارتضاه اقرّه على عمله ومن لم يرضه يستبدل به من يراه اهلاً للتدبير والعلاج وحفظ الصّحة والمزاج وهو الآن بصدد من يشتغل عليه فى علم الطب وقد شرع فى تصنيف كتاب مفيد يشتمل على اقسام الطبّ العلميّ والعمليّ، وتوفّى ليلة الجمعة غرّة شعبان سنة خمس عشرة وسبعمائة؛

(۳۴۵) مجد الدين ابونصر عبد المجيد بن عمر بن احمد المعروف بابن القدرة القاضى

كان من اعيان القضاة الرواة، عارفاً بالآداب والفقه والتفسير، وله تصنيف فى ذلك، تخرّج به جماعة من الائمّة والفقهاء والعلماء؛

(۳۴۶) مجد الدين ابوعلىّ عبد المجيد بن عمر بن رجب الحارثى الكاتب

كان من الرؤساء العارفين، قدم مراغة الى حضرة مولانا السعيد نصير الدين، وكان شيخاً حسناً، وقد سمع الحديث من شيخنا الصاحب الشهيد محى الدين ابى محمّد يوسف بن الجوزىّ وغيره؛

(۳۴۷) مجد الدين ابومحمّد عبد المجيد بن عمر بن يوسف العراقىّ القاضى

كان من اماثل القضاة ، رأيت بخطه تذكرة كتبها الى بعض (؟ لبعض) فضلاء عصره ، يشتمل على الامثال والاخبار ؛ افتتحها بقوله :—

انى اذا امكنتنى ساعة سعة   زيّنت بالبذل اصافى واحوالى
ولا اردّوان اصبحت ذا ضجر   من الخصاصة فى اٰمال سؤّالى
إمّا الشكور فيزيّنى فى اعانته   أو الكفور فعرضى صنتُ بالمالِ

(۳۴۸) مجد الدين ابو المظفر عبد المجيد بن محمد التبريزى ملك تبريز الرئيس باذربيجان ؛

الرئيس المقدّم ، والملك العالم المعظّم ، صاحب الهمّة العليّة ، والنفس الابيّة ، كان من اعدل الحكّام فى رعيّته وكان له القرب والاختصاص فى حضرة السلطان الاعظم هولاكو ، رأيته بتبريز سنة سبع وخمسين وستّمائة وذكروا عنه انّه كاتب بركة بن باتو فاستشهد بنواحى تفليس مع سيف الدين بتيبكجى ، وعزيز الدين اسعد رئيس كرجستان فى شهر رجب من سنة ستّين وستّمائة ودفن برباط استحدثه لنفسه ظاهر باب الرىّ ، ولم يخلف بعده بتلك الخطّة من يقاربه فى السخاء والعطاء وخدمة الاكابر والعلماء ؛

(۳۴۹) مجد الدين ابو الخير عبد المحمود بن صالح بن على بن نباتة الحرّانى ثمّ الفلّوجىّ[2] الخطيب

---

[1] وقع ذكره استطراداً فى تاريخ العراق (۱ : ۲۱۷) ، [2] نسبة الى الفلّوجة والفلّوجة الصغرى والكبرى قريتان كبيرتان من سواد بغداد ؛ معجم البلدان (۳ : ۹۱۵ - ۹۱۶) ؛

قال: الحمد لله الواحد الاحد القيّوم الصمد، الذى امطر سرائر العارفين كرائم الكلم من غنائم الحكم الاح لهم لوائح القِدم فى صفائح الهِمَم؛ ودلّهم على اقرب السبل الى المنهج الاوّل وردّهم من تفرّق العِلَل الى عين الازل؛

(٣٥٠) مجد الدين ابو الكرم عبد الملك بن ابراهيم ابن محمّد الأُرْمَوِيّ المحتَسِبُ

كتب على تقليدٍ كُتِبَ لاجله من ديوان الخليفة: الحمد لله الذى هدانا لطاعة امير المؤمنين وشكره وحبانا باصطناعه وبرّه والرغبة والرغبة الى الله تعالى مع التوفيق لما له زلفة عند امير المؤمنين فيما قلّدنيه من مصالح المسلمين، واياه جلّ اسمه اسأل السلامة من الزلل و العصمة فى القول والعمل؛

(٣٥١) مجد الدين ابو الحارث عبد الملك بن شعبان ابن مرزوق اللخميّ الاسكندريّ الكاتب

انشد له الحافظ محبّ الدين ابو عبد الله بن النجّار فى غلام رومىّ:-

قلت له لمّا بدا بوجهه ❊ تحت ظلام الفرع كالمشترى
كيف اكتسبت خدّاك من حمرة ❊ وانت تدعى من بنى الاصفر

وانشده الملك الكامل محمّد بن العادل صاحب مصر بيتًا مفردًا، وطلب منه ان يجيزه وهو:-

لا شك انك قاتلي   والله وانقطع الكلام

فاجازه بقوله :-

ودمي بجدك ان جدت عليك يشهد والسلام

قال : ومولده سنة ست وسبعين وخمسمائة ؛

(٣٥٢) مجد الدين ابو الفضل عبد الملك بن عبد السلام بن اسماعيل اللمغاني نزيل بغداد المدرس الحنفي

من بيت الفقه والعدالة والقضاء ومجد الدين اخو اقضى القضاة كمال الدين عبد الرحمن، وقد تقدم ذكره[1]، قال شيخنا تاج الدين : تصرف في الاعمال الديوانية، و استنابه شرف الدين عبد اللطيف ابن النجاري[2] سنة ست عشرة وستمائة، وشهد عند قاضي القضاة عماد الدين ابي صالح نصر بن عبد الرزاق ؛ قال شيخنا تاج الدين ؛ وفي سنة ثلاث واربعين رتب مجد الدين مدرسًا بمشهد الامام ابي حنيفة والمدرسة الموفقية ، واقر على وكالته للامير ابي القاسم عبد العزيز بن المستنصر بالله ، وتوفي في[3] ذي الحجة سنة ثمان واربعين وستمائة عن سبع وستين سنة ؛

---

[1] انظر كتاب الكاف (ص ١٩٥) ؛ [2] المتوفي سنة ٦٢٣ هـ ؛ الشذرات (٥ : ١٦١) ؛ [3] ذكره عبد القادر القرشي في الجواهر المضية (١ : ٣٣١) ، وقال دفن بالخيزرانية ؛

س

صدر البيت	قافيه	بحر	مجلد	صفحه
				۳٦۷:۱۷)
اذاما	أطلسُ	طويل	۴	۲۳۴
سريعٌ	يتنفّسُ	〃	۴	۳۸۸
فصبّحها	مُغلّسُ	〃	۵	۱۲۴
ولستُ	أعبسُ	〃	٦	۴۷۱
على	فموعّسُ	〃	۷	۱۰٦
ألم	يتأبّسُ	〃	۷	۳۱۷
لبيضٌ	جرجسُ	〃	۷	۲۳٦
سيعلم	حبلبسُ	〃	۷	۳۵۷ (= ۴۰۳)
وصهباءِ	تخنسُ	〃	۷	۳۷۴
ولولا	خنعسُ	〃	۷	۳۷٦
فصبّحه	أطلسُ	〃	۸	۱۸
فباتت	عضرسُ	〃	۸	۱۸
وألقت	تغطسُ	〃	۸	۳۴
قد	أفرسُ	〃	۸	۱۴۱ (= ۷۲:۲۰)
أباحسنٍ	تقلسُ	〃	۸	٦۳
اذا	المقايسُ	〃	۸	۷۱
هلمّوا	تكدّسُ	〃	۸	۱۷٦ (=

صدر البيت	قافيه	بحر	مجلد	صفحه
راوهلمّ				۳۱۲:۱۷)
فهل	مكركسُ	طويل	۸	۸۰
فهذا	المتلمّسُ	〃	۸	۱۹۴ (= ۳۴:۹)
وقد	تمرّسُ	〃	۸	۱۰۰
وانّي	أتميّسُ	〃	۸	۱۰۹
وأعطاه	يُسدِسُ	〃	۱۳	۴۷۰
أقاتلُ	المكيّسُ	〃	۱۴	٦٦
يكون	أخمسُ	〃	۱۸	۱٦۷
ترى	لامسُ	〃	۱	۱۳۹
فما	دامسُ	〃	۱	۲۷۰
خناطيلُ	الروائسُ	〃	۱	۳۸۸ (= ۳۹۵:۷، ۲۳۷:۱۳)
ففاضت	غامسُ	〃	۱	۴۲۹
ألا	بائسُ	〃	۲	۴
وأشعث	العرامسُ		۲	۲۲۱[1]
سبحلاً	الحبائسُ		۲	۲۲۵ (= ۲۴۴:۷)

[1] انظر ايضا (۱۱: ۷۷)۔

صدر البیت	قافیته	بحرہ	مجلد	صفحة
علی	مُتَکاوِسُ	طویل	٣	٦٥
وطعنةٍ	قالِسُ	″	٣	١٨٥
والمحنَ	المَعاطِسُ	″	٣	٤٢٠
ألا	یائِسُ	″	٤	٣١٤ (=
				٥: ١٢٥،
				١٣٤،
				٩: ٢٦،
				١٠: ٥٣،
				١٣: ٥٦،
				١٥: ٢٧٥)
اذا	لابِسُ	″	٥	٥٤ (=
				١٣: ٢٦٨)
إلَی	الفَوارِسُ	″	٧	٢٦٦ (=
				٨: ٤٣،
				٩: ٨٥)
اذا	ناعِسُ	″	٧	٢٨٢
خَفِیف	المُغامِسُ	″	٧	٢٩٠
لنا	الأحامِسُ	″	٧	٣٥٨
تَعَیَّنِینَ	حائِسُ	″	٧	٣٦١
[illegible]	خُنابِسُ	″	٧	٣٧٥

صدر البیت	قافیته	بحرہ	مجلد	صفحة
اذا	المُداعِسُ	طویل	٧	٣٨٧
ونَحنُ	مُتَشاخِسُ	″	٧	٤١٥
فلا	الطَّوامِسُ	″	٧	٤٣٢ (=
(او ولا)				١٢: ١٥٠)
إنّا	عاطِسُ	″	٨	١٩
وعَیطًا	العَوانِسُ	″	٨	٢٧
أخو	فمُغامِسُ	″	٨	١٣٦ (=
				١٣: ١٣٤)
ألا	الأكادِسُ	″	٨	٧٧
فلَو	الكَوادِسُ	″	٨	٧٧
ودُونِیَ	مُتَکاوِسُ	″	٨	٨٤
وماءٍ	اللَّغاوِسُ	″	٨	٩٢
ولِلّهِ	هَساهِسُ	″	٨	١٣٥
وأبصَرنَ	یابِسُ	″	٨	٢٢٠ (=
(او وأبصرتُ)				١٠: ١٧٤،
				١٨: ٣١٨)
لقد	قارِسُ	″	٩	٢٨٤
یَسُومُونه	بمارِسُ	″	٩	٦٣
فلَمّا	مُتَشاوِسُ	″	٩	١٢٧
تعادی	لابِسُ	″	٩	٢١٢

صدر البیت	قافیته	بحره	مجلد	صفحة
کمـا	الکوانسُ	طویل	۹	۳۸۴
ألستُ	نائسُ	〃	۹	۴۸۰
رمتنی	الأوانسُ	〃	۱۰	۲۱۶[1]
وأحتمل	المغامسُ	〃	۱۰	۴۴۰
اذا	القناعسُ	〃	۱۱	۱۱۹
وموضعٌ[2]	آنسُ	〃	۱۲	۲
ومیّا	یابسُ	〃	۱۲	۱۰۲
ورمل	الخنادسُ	〃	۱۲	۴۰۱ (=
(والخنادسُ				۱۳: ۱۳۳)
أذودهم	الخوامسُ	〃	۱۳	۲۷۸
فما	دامسُ	〃	۱۶	۲۷۴
وقد	فارسُ	〃	۱۷	۳۸
ومنزل	آنسُ	〃	۱۷	۵۶
فلا	عانسُ	〃	۱۷	۴۱۰
فلو	لامسُ	〃	۲۰	۸۹
لظبیة	الرّوامسُ	〃	۲۰	۹۵
أوابلُ	ویبیسُ	〃	۱۳	۴
وأشعث	نکسُ	〃	۴	۶۱
یقول	بأسِ	〃	۴	۱۱۸ (=

صدر البیت	قافیته	بحره	مجلد	صفحة
				۶: ۳۱۷)
أصمّ	الرّمسِ	طویل	۶	۴۱۸
ولمّا	نفسی	〃	۷	۲۷۳ (=
				۱۸: ۲۷۲)
فطاف	والسّدسِ	〃	۷	۴۰۹
أجاعلةٌ	عبسِ	〃	۸	۵۲
کأنّ	الحبسِ	〃	۹	۴۰۱
قفا	عنسی	〃	۱۴	۱۵۱
یثیر	مخمسِ	〃	۵	۱۷۹ (=
				۶: ۳۷۰)
علی	أجبسِ	〃	۷	۳۳۳
وقفت	أخرسِ	〃	۷	۳۴۸
ولله	مقیسِ	〃	۷	۳۶۴
وردت	معسعسِ	〃	۸	۱۵
فصبّحه	سنبسِ	〃	۸	۱۷ (=
				۲۷۹)
فأدرکته	المقدّسی	〃	۸	۵۰ (=
				۱۲: ۳۷)
وقد دسّت	مقندسِ	〃	۸	۶۷

[1] انظر ایضا (۹: ۲۷۱) — [2] انظر ایضا (۱۷: ۵۶) —

صدر البیت	قافیہ	بحر	مجلد	صفحہ
			۶	۱۴۰،
			۸	۱۳۸،)
حتیٰ	وَحَبَّاسُ	بسیط	۵	۱۳۸۲ (=
			۸	۱۴۰،)
اذا ملا	اَجْرَاسُ	«	۷	۱۴۷
فان	ابناسُ	«	۷	۳۱۳
من	واتیاسُ	«	۷	۳۳۲
یا مَیَّ	فَرَّاسُ[۱]	«	۸	۱۱ (=
				۴۱ ،)
لَیثُ	اَعْرَاسُ	«	۸	۱۱
قد	اَنکاسُ	«	۸	۱۲۸
حتیٰ	شَمَّاسُ	«	۱۳	۱۵۷
بینا	النَّاسُ	«	۱۶	۲۱۲
یا مَیُّ	والنّاسُ	«	۱۹	۲۵۱
وقد	مَقْبُوسُ	«	۳	۱۴۲۲ (=
			۱۵	۲۴۸،)
ولیس	کَیْسُ	«	۴	۳۶۱
جاوزتها	مَعْکُوسُ	«	۸	۲۲
لم	الکَرَادِیسُ	«	۸	۷۶

صدر البیت	قافیہ	بحر	مجلد	صفحہ
استودع	القَرَاطِیسُ	بسیط	۱۰	۲۶۶
دع	الکَاسِی	«	۱۱	۱۳۹۸ (=
			۱۵	۲۵۷،
			۲۰	۸۸،)
اذا	الرَّاسِ	«	۲۰	۳۶۴
لو کنتَ	المَرَسِ	«	۴	۱۸۳ (=
			۸	۱۰۰،
			۲۰	۱۱۵،)
فی	مُلْتَمَسِ	«	۱۹	۲۲۹
مَلُّوا	أضْرَاسِ	«	۳	۲۴۶
وقد	تَنَاسِی	«	۷	۱۷۴ (=
				۲۰۵،
			۸	۱۱۵،
			۱۹	۲۹۲،
اللهُ	نِبْرَاسِ	«	۷	۱۳۶۹ (=
			۸	۱۱۰،
لو کان	عَبَّاسِ	«	۷	۳۷۰
بِتْنا	دِرْوَاسِ	«	۷	۱۳۸۳ (=
			۱۴	۱۷۷،)

[۱] انظر ایضاً (۱۹ : ۲۵۱)۔

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
جارٌ	أرماسِ	بسيط	٧	٤٠٦
واللهِ	بأكياسِ	″	٨	٨٥
إنّي	بأكياسِ	″	١٣	٣٢٤
تَمَنّا	بالنّواقيسِ	″	٣	١٨٨ (=
				٨ : ١٢٦)
وابنُ	القناعيسِ	″	٧	٢٧٢ (=
				٨ : ٦١، ٩٨،
				١٧ : ٢٥٨)
حيّ	المواعيسِ	″	٧	٣١٢
قد	الضّغابيسِ	″	٧	٤٢٦ (=
				١٢ : ٣٥٢)
ابنا	القداميسِ	″	٨	٥٢
لا	القوسِ	″	٨	٦٩
والتّيمُ	المدانيسِ	″	١٤	٣٤٢
هل	تضرُبيني	″	١٥	٣٥
انى	مرموسِ	″	١٧	٢٩٢
حيّ	مأنوسِ	″	١٨	٢٢٤
اذ	المرسا	″	٥	٤٢٣
نجّي	نبراسا	″	٦	٥٧

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
تلك	أكداسا	بسيط	٨	٩٨
ماحيّةٌ	أضراسا	″	٨	٩٨
انا	قيسُ	وافر	١٥	٥٠
فأعلوهم	فرسُ	″	٨	٤٣
قبيلتانِ	عمّاسُ	″	٨	٢٥
كأنّ	عروسُ	″	١	١١٣
فما	الخسيسُ	″	١	١٤٨ (=
(او وَمَا)				٧ : ٣٦٣،
				٢٠ : ١١٩)
أغرّك	علطبيسُ	″	٣	٢٥٩
من	ينوسُ	″	٥	٥٦
خلا[1]	شوسُ	″	٧	٣٤٩
ولو	الدّردبيسُ	″	٧	٣٨٤
فباتوا	هموسُ	″	٧	٤٠٧
أنى	السّريسُ	″	٧	٤١٠
وما	ضروسُ	″	٧	٤٢٣
رأى	الغميسُ	″	٨	٣٦
فلو	الفريسُ	″	٨	٤٢
حملت	قبيسُ	″	٨	٤٩ (=

[1] انظر ايضا (١٨ : ١٩٣)

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
ودع	مُضَرَّسُ	كامل	٧	٤٢٤
وعلمتُ	تُمَّسُ (او قُومَسُ)	"	٨	١٦٦ (= ١٩١:١٤، ١٣:١٧)
ويكادُ	المُتَلَكِّسُ	"	١٦	٣٢
هَبَّتْ	يَتَوَجَّسُ	"	١٦	٢٥٠
ألقِ	النِّقْرِسُ	"	١٨	١٢
ليستْ	المَسِّ	"	١	٣٤
مَنَعَ	الشَّمْسِ	"	٧	٣٠٥
أمّا	والجُلْسِ	"	٧	٣٤٠
فأثارَ	الفُرْسِ	"	٩	٢٣٧ (= ٢٤١، ٤١:١٧)
فله	لِلتَّعْسِ	"	٩	٢٤٧ (= ١٩١:١٢)
أتني	خُنُسِ	"	١٠	٢٨٩
بيضاء	اللَّمْسِ	"	١٧	٨٨
وبجارةِ	الجِلْسِ	"	١٧	٣٠٤ (= ٢١٥:١٨)
رَهْطُ	تُضْرِسِ	"	٧	٢٩٣ (=

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
				٣٦٠)
ملك	الأتيسِ	كامل	٧	٣٣٢
قُلْ	فاجْلِسِ	"	٧	٣٤٠
ودع	المَقْدِسِ	"	٧	٣٤٠
بيضاءُ	المُتَطَرِّسِ	"	٧	٤٢٨
سَلِّ	مُتَعَبِّسِ	"	٨	١٣
ياحبَّ	مُفْلِسِ	"	٨	٤٧
كأنَّ	قَرْطَسِ	"	٨	٥٥
عفت	بالقِرْطِسِ	"	٨	١٢٦
أبلغ	كالهِجْرِسِ	"	٨	١٣٣
طَرَقَ	المُهْلِسِ	"	٨	١٣٦
فتهامسوا	مُعَرَّسِ	"	٨	١٣٧ (= ١٦٩:١٦، ٢٨٣:١٧)
أعلاقةً	المُخْلِسِ	"	١٢	١٣٤ (= ٣٤٥:١٤، ٢٨٥:١٧)
إمّا	المُخْلِسِ	"	٢٠	٣٦٣
مَنْ	الدُّرْقاسِ (او الدُّرداقِسْ)	"	٧	٣٨٤

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
تجلوا	الأعواسِ	كامل	۸	۲۹
وبئست	كالياسِ	″	۱۱	۷۹
تعلى	يبيسِ	″	۳	۴۳۵
متقارب	ضريسِ	″	۵	۴۲۲
هاتيك	مخموسِ	″	۷	۱۳۷ (= ۱۷: ۲۹۰، ۲۰: ۳۳۲)
ولقد	عبوسِ	″	۷	۱۱۴ (= ۱۳: ۱۴۹)
إن	نفوسِ	″	۷	۴۱۸
صدق	مليسِ	″	۸	۱۰۶
أما	يبوسِ	″	۸	۱۴۸
وأحل	الأرؤسِ	″	۱۲	۱۹۷
نكحت	النسا	″	۷	۳۲
أأن	شوسا	″	۷	۴۲۱
لوكنت	مسوسا	″	۸	۱۰۳
ليث	خنابس	″	۷	۳۷۵
وفي	غبيسُ	رجز	۵	۱۳۶ (= ۸: ۳۲،)
إن	يعسّ	″	۸	۳۵۶

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
تجمع	نفسُ	رجز	۹	۷۶
اجتمع	نفسُ	″	۹	۳۳۳
لاقت	فدسه	″	۸	۱۷
بساعديه	يبسُ	″	۴	۹۴
وإن	أخيسُ	″	۷	۳۷۸
عهدي	تملسُ	″	۷	۴۳۰
العيد	تلمسُ	″	۸	۴۷
أثني	الأقوسُ	″	۸	۷۰
ولا يزال	يلحسُ	″	۸	۷۰
الطير	لاحسُ	″	۸	۷۶
حرف	ملدسُ	″	۸	۹۰
العبد	والفلنقسُ	″	۱۷	۳۲۳
حجت	الدهارسُ	″	۷	۳۹۳
جاءتك	تميسُ	″	۷	۳۸۴
أم	تعوسُ	″	۷	۳۸۴
يا ليت	دختنوسُ	″	۷	۴۰۵
قد	تعريسُ	″	۸	۱۱۲ (= ۴۸،)
يا صاح	الفوسُ	″	۸	۳۸
بالموت	الفاعوسُ	″	۸	۴۶

له السطر ایضاً (۱۵: ۳۱)

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
وكم	قُفُسِ	رجز	٩	٦٢
وحاصِنٍ	قُنُسِ	″	٨	٦٦
وإنّ	بالرّوسِ	″	٨	٧٤
أنتَ	الكُرسِ	″	٨	٧٨
يا خيرَ	يلبُسِ	″	٨	٩٧
وذاتُ	القَبَسِ	″	٨	١٣١
وحاصن	الوقُسِ	″	٨	١٤٣
كأنّه	الخُمُسِ	″	٩	٢٩٥
واندرعت	يُمْسِي	″	٩	٤٣٧
يا ربِّ	لنفسِي	″	١٠	١٨٦
يبيتُ	للتّحسِ	″	١٢	١١٦
يصفرُّ	الدّارسِ	″	١٥	٣٠١
خَوى	خَمْسِ	″	١٦	٢٢٧
وحاصن	مُلسِ	″	١٦	٢٧٥
يا أمّ	بخُرسِ	″	١٨	١٦٧
فاطمَ	نفسِي	″	١٩	١٥٥
ويقتلون	الدّحسِ	″	٢٠	١٣٧
يضحكُ	المخمسِ	″	٢	٣٦٤
يجري	أقطسِ	″	٧	٣٥٩

صدر البيت	قافيته	بحره	مجلد	صفحة
وادّرعي	دَخْمَسِ	رجز	٧	٣٨٠
وقرّبوا	دَخْنَسِ	″	٧	٣٨١
مَن	يَيْئَسِ	″	٧	٣٨٩
والمشرفيّ	الرُّعَّسِ	″	٧	٤٠٣؎
بفاحمٍ	المُعلَنكَسِ	″	٨	٢٤
يا كلَّ	هَندِسِ	″	٨	١٣٨
يخرجن	المُتَمَّسِ	″	٨	١٣٠
يكون	النّوّسِ	″	٨	٧٠
بئس	اقعنسسِ	″	٨	١٠٠
حتى	المُعطِسِ	″	١٠	٢٠٢
دعوتُ	يلبسِ	″	١٢	٣٧٠
بالدّار	المُطَرَّسِ	″	٢٠	١٩٦
أعددتُ	الفارسِ	″	١	٣٢٦
ومنهلٍ	خوامسِ	″	٢	٤٥٣
منكوزةٌ	السّائسِ	″	٧	٤١١
يا ربَّ	عضارسِ	″	٨	٢٠
رُبَّ	بالمواسي	″	١	٤٧١
بانت	آسي	″	٧	٣١٦
إنّ	أقاسي	″	٧	٣٣٣

؎ انظر ايضاً (١٨ : ٣٠٧)۔

صدالبیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
اذا	یُبَسَّسا	رجز	۸	۲۴
تَقاعَسَ	البُخَّسَا	″	۸	۶۰
اِنّی	نُحَبِّسَا	″	۸	۶۹
أما	مُخَیَّسا	″	۸	۸۶
خَـوْدٌ	المُدَفَّسا	″	۸	۱۱۰
لـما	اعْبَسَا	″	۸	۱۰۶
لَبِسْنَ	تَهَسْهَسَا	″	۸	۱۳۵
أوردَها	مُخْمِسَا	″	۸	۱۴۸
أجْاه	أخْیَسَا	″	۹	۱۲۲
وبَلْدَةٍ	خُمَّسَا	″	۹	۴۵۶
تَرَى	جُلَّسَا	″	۱۰	۳۴۷
ومَهْمَهٍ	خُمَّسَا	″	۱۴	۵۵
أحْدُو	نُعَّسَا	″	۱۷	۳۹۳
بِفاحِمٍ	اعْلَنْكَسَا	″	۱۸	۳۰۷
لوكُنْتَ	ناعِسَا	″	۷	۳۸۴
قـد	فاطِسَا	″	۸	۱۷
قـد	الدَّوَائِسَا	″	۱۰	۲۸۳
أكَلْنَ	یَابِسَا	″	۲۰	۱۹۰ (= ۳۸)
ودَتَّرَ	الأنْفاسَا	رجز	۴	۲۴۳ (= ۵۴:۶، ۶۸:۸)
جاوَزْنَ	الدَّهَاسَا	″	۷	۳۴۹
بَدَّلْتَنا	قِنْعَاسَا	″	۷	۳۹۰
اِنَّا	اكْدَاسَا	″	۸	۷۶
حَیْثُ	اِلْتِبَاسَا	″	۸	۸۰
اِنّا	الهَرَاسَا	″	۸	۱۳۴
حاذَرْنَ	دِیَاسَا	″	۱۵	۲۹۱
ذا صَحَوَاتٍ	الرَّوْلاسَا	″	۱۹	۲۰۵
لَیْثٌ	والجَامُوسَا	″	۲	۱۸۵ (= ۱۳۷:۸)
اذا	الیَبِیسَا	″	۲	۳۴۸ (= ۳۲۷:۵)
وهُنَّ	لَمِیسَا	″	۲	۴۵۹
یَکْفِیكَ	النُّحُوسَا	″	۴	۶۰
کأنَّ	شُمُوسَا	″	۷	۳۳۰
اذا	حَسُوسَا	″	۷	۳۵۳
دعَوْتُ	القُدُّوسَا	″	۷	۳۰۴

ـه انظر ایضاً: (۱۴: ۵۵) ـ

ش

ص

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
أَيَّامَ	لَواصِي	کامل	۲۰	۱۱۳
ولَقَد	أَبُوصِ	"	۸	۲۶۸
وتَشَاجَرَت	بالخَرِبْصِ	"	۸	۲۸۷
يَطْوِي	خَمِيصًا	"	۱۶	۱۹۷
كِتَابَةِ	الدُّلامِصُ	"	۵	۴۱۲
كِنَانَةِ	الدِّمالِصُ	"	۸	۳۰۴
ولَقَد	بَصَايِصُ	"	۸	۲۷۱ (= ۳۶۱، ۱۱: ۲۰۷)
فيه	راقِصُ	"	۸	۳۴۶
بِمُحَوَّفٍ	مُصَامِصُ	"	۸	۳۶۰
والمُهْرُ	يَقْبِصُ	"	۱۷	۲۳۹
مَا زَالَ	فَوْتَصُهُ	رجز	۸	۳۷۲ (= ۳۷۵)
يَبِصُّ	الغَائِصُ	"	۸	۲۷۱
كَأَنَّ	نامِصُ	"	۸	۳۷۰
مُمَحَّصُ	مُصَامِصُهُ	"	۸	۳۵۸
ان	الوَبَّاصُ	"	۸	۳۲۵
بَاتَ	إِجْنِيصُ	"	۸	۲۷۶

صدر البیت	قافیته	بحر	مجلد	صفحة
جَاءُوا	مَحْصُوصُ	رجز	۸	۳۱۶[1]
فما لَهُمُ	الإمْلِيصُ	"	۸	۳۶۳
يا نَفْسُ	نَوصُ	"	۸	۳۷۲
يَشْرَبْنَ	دُعْمُوصُهُ	"	۸	۳۰۲
يَشْرَبْنَ	قَمِيصُهُ	"	۸	۳۴۸
بِثَمَنِ	الرُّخُصِ	"	۸	۱۴۴
كَأَنَّ	تُعَفِّصِ	"	۱	۱۳۷
أَنْتَ	العِصِي	"	۱۱	۷۸
لا تَضْرِبَاهَا	العِصِي	"	۱۹	۲۹۳
حتى	غَائِصِ	"	۸	۳۶۴
يَلْمَعْنَ	النَّشَائِصِ	"	۸	۳۶۵[2]
ذي مَحْزِمٍ	شَاخِصِ	"	۲۰	۱۹۳
قد	لَحَاصِ	"	۳	۲۲۳ (= ۸: ۲۸۵، ۳۵۴، ۱۱: ۹۲)
في	واصِ	"	۸	۲۸۳
فَهِي	باللِّلاصِ	"	۸	۳۰۳
قَد	الدُّلامِصِ	"	۸	۳۰۴

[1] انظر ایضاً: (۸: ۲۷۸)۔

[2] انظر ایضاً: (۸: ۳۲۱)

نومبر ۱۹۴۰ء

ضمیمہ

اورینٹل کالج میگزین

منجانب

عربک اینڈ پرشین سوسائٹی

پنجاب یونیورسٹی

لاہور

نوٹ ضمیمہ صرف عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کے ممبروں اور خریداران ضمیمہ میں تقسیم ہوتا ہے

فہرست مضامین

ضمیمہ

بابت ماہ نومبر ۱۹۴۰ء

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مہتہ ایشر داس پرنٹر چھپا اور بابو صدیق احمد خاں نے اورئنٹل کالج لاہور سے شائع کیا

خواجوی کرمانی۔ سوانح حیات اور تصانیف

(سلسلہ کے لئے دیکھو یہی رسالہ بابت ماہ اگست ۱۹۴۰ء)

یہی شعر مصنف حبیب السیر نے اختتام خمسہ کے ثبوت میں دیا ہے۔
پروفیسر براؤن بھی لکھ رہے ہیں۔ کہ کمال نامہ پانچویں مثنوی ہے۔ یہ مثنوی
شیراز کے علم پرور اور شاعر نواز بادشاہ شیخ جمال الدین ابواسحٰق اینجو کے لئے
جو خواجہ حافظ کے مربّی ہونے کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں لکھی گئی تھی،
چنانچہ اختتامِ کلام میں ایک پر زور مدح ان کی موجود ہے۔ شیراز کا دربار
اس زمانے میں اہل علم و ہنر اور خصوصاً شعراء کے لئے خاص کشش
رکھتا تھا۔ شیخ ابواسحٰق کی نظیر ابوظفر بہادر شاہ ہو سکتا ہے۔ وہ کہا کرتے
تھے ؎

حدیثِ من ز مفاعیل و فاعلات بود
وگرنہ من ز کجا سرِ مملکت ز کجا

چنانچہ ملک کے مختلف حصّوں سے شاعر لوگ کھچے چلے آتے تھے،
جب ۷۵۸ھ ہجری میں امیر مبارز الدین نے شیراز کو اپنی قلمرو میں شامل کر کے
شیخ ابواسحٰق کو تہِ تیغ کیا ہے اور وہ اپنے ساتھ رونقِ کاشانہ لے گئے۔ تو
حافظ کو کہنا پڑا ؎

راستی خاتم فیروزۂ بواسحاقی
خوش درخشید ولی دولت مستعجل بود

کمالنامہ دو ماہ میں لکھا گیا۔ چنانچہ بڑی شدّ و مدّ سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

بزدم در زمانہ کوس بیان
بگرفتم جہان بہ تیغ زبان
ہمچو مینو بنام داور دہر
ساختم در دو مہ دوازدہ شہر

شاید وہ نہ جانتے تھے کہ امیر خسرو دہلوی نے مطلع الانوار جو حجم میں اس مثنوی سے دگنا ہے دو ہفتوں میں کہہ ڈالا تھا۔ تاہم ہمیں خواجو کی قادرالکلامی میں کچھ کلام نہیں۔ آخر کتاب میں وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے نظر آتے ہیں۔ فرزند کا نام ابوسعید علی ہے۔ مجیر شاید تخلص ہے۔ تذکروں میں کہیں ان کا ذکر نہ ملا، اسے علم و ہنر کے لئے کوشش کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ بزرگوں کا ادب خاص طور پر ملحوظ خاطر رہے۔ اگر کوئی فیض حاصل کرنا ہے تو انہی بڈھوں سے جو صوفیہ کی روایات و تعلیمات کے حامل ہیں کرنا چاہیئے۔ عشق سے منع کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ پیر کی زیارت ہوئی۔ نام کی تخصیص انہوں نے نہیں کی۔ خواجو سے فرمائش کی جاتی ہے کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ چنانچہ یہی مثنوی پڑھی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

در سماع آمد از ترنم من
و آفرین کرد بر تکلم من

پھر کتاب کا نام بھی انہوں نے تجویز کیا ؎

نام نظمم کمال نامہ نہاد
وز کمالیتم دری بکشاد
خرقہ داد و اجازتم فرمود
رہ ملک حقیقتم بنمود

گویا وہ صاحبِ ارشاد بھی تھے ۔ سترہ اٹھارہ تذکرے جو نظر سے گزرے ہیں ان میں صرف میخانۂ عبدالنبی میں اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ ہمارے شاعر ماشاء اللہ پیر و مرشد بھی تھے ۔" بہ کرمان آمدہ در آنجا خانقاہی ساخت ۔ بقیۂ عمر دران خانقاہ با درویشان بخدا پرستی مشغول بودہ ۔ لیکن معاصرین کے سکوت اور مواد اثبات کی کمی سے یہ امر جو بہت سی دلچسپیوں کا حامل ہونا چاہیئے ۔ ابھی تشنۂ تحقیق ہے ۔ ان پیر صاحب کی بابت جن کا ذکر ابھی ہوا ہے اور جنھوں نے کتاب کا نام کمال نامہ رکھا ہے ۔ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ بزرگ شیخ امین الدین گازرونی ہیں ۔ جن کی مدح گل و نوروز میں بھی ہے ۔ ان کے متعلق مصنفِ آثار عجم رقمطراز ہیں ۔" امین الدین محمد بن علی بن مسعود مولدش را بلیان گازرون نوشتہ اند ۔ شیخ شیوخ زمان و مقتدای اہل عرفان ست ۔ وصیتِ حسن ارشادش گوشزد جہانیان ، گویند خرقہ از دست عم بزرگوار خود شیخ عبداللہ بلیانی متوفی سنہ ۶۸۳ھ پوشیدہ و وفاتش در سنہ ۷۴۵ھ در گازرون بودہ ۔ در خانقاہی کہ موسوم بآن جناب است مدفون است ، این رباعی از وست ،

ای دل پس زنجیر چو دیوانہ نشین	در دامن درد خویش مردانہ نشین
زآمد شد بیہودہ خود راپی کن	معشوق چو خانگی ست در خانہ نشین

حافظ کے ان مشہور اشعار میں بھی ان کا نام آرہا ہے ،

بعہدِ سلطنتِ شاہ شیخ ابو اسحٰق	بہ پنج شخص عجب ملکِ فارس بود آباد
نخست پادشہی ہمچو او ولایت بخش	کہ جانِ خلق بپرورد و دادِ عیش بداد
دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین	کہ یمنِ ہمتِ او کارہای بستہ کشاد
دگر شہنشہِ دانش عضد کہ در تصنیف	بنای کار مواقف بنام شاہ نہاد

دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل — کہ نام نیک ببرد از جہان دانش و داد
دگر مربی اسلام مجد دولت و دین — کہ قاضی بہ ازو آسمان ندارد یاد
نظیر خویش نبگذاشتند و بگذشتند — خدای عزّ و جل جملہ را بیامرزاد

یہ صاحب کمال نامہ کی تصنیف سے ایک سال بعد فوت ہوتے ہیں۔ خواجو جب بھی شیخ ابو اسحق ابراہیم مقدس گازرونی اور شیخ امین الدین گازرونی کا نام لیتے ہیں نہایت والہانہ انداز میں لیتے ہیں۔ شیخ ابو اسحق کے متعلق مقدمۂ کمال نامہ میں فرماتے ہیں ؎

چون بملک ورع نہادی روی
شد دماغت زگازرون خوشبوی
سر بایوان قرب یابی راہ
مدد از روح شیخ مرشد خواہ
ہادی راہ دین علی الاطلاق
مرشد دین حق ابو اسحق

اسی طرح کتاب گل و نوروز میں شیخ امین الدین گازرونی کی مدح میں یوں فرماتے ہیں ؎

امین ملت و دین شیخ اعظم
مہ برج حقیقت کہف عالم
الا ای پیک رنجوران مہجور
کہ چون موسی نہندت طایر طور
گرت بر گازرون افتد گزاری
بکن بہر من دل خستہ کاری

بہ بین در ملک وحدت تاجداری
بمیدانِ حقیقت شہ سواری
زبرجِ بوعلی دقاق ماھی
وز اقلیم ابو اسحق شاہی

اس سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ شیخ امین الدین شاید گازرون میں شیخ مرحوم کے مزار پر سجادہ نشین ہیں۔ اسی زمانہ کے ایک اور بزرگ شاہ علاء الدولہ سمنانی ہیں۔ جن کا سنہ وفات بموجب نفحات الانس اور دولت شاہ ۷۳۶ ہجری ہے۔ اور دولت شاہ نے تو ان کی وفات چار شعروں میں اس طرح درج کی ہے ؎

تاریخ وفاتِ شیخ اعظم سلطانِ محققان عالم
رکن حق و دین علاء دولت بر مسند خود نشستہ خورم
بیست و سیوم ز رجب بود اندر شبِ جمعہ مکرم
از ہجرت خاتم النبیین ہفصد بگذشت و سی و ششم

سب سے پہلے دولت شاہ اس بات کا ذکر کر رہے ہیں۔ کہ خواجو شاہ علاء الدولہ کے دست بیعت اور مدت تک صوفی آباد میں رہے۔ صوفی آباد مضافات سمنان سے ہے۔ اور ان کی بدولت بڑے بڑے کمال حاصل کئے۔ ایک رباعی بھی خواجو کی طرف سے منقول کی ہے۔ کہ 'در حق پیر خود گفتہ'

ہر کو برہِ علی عمرانی شد چون خضر بسر چشمۂ حیوانی شد
از وسوسہ و غارت شیطان وارست مانند علاء الدولہ سمنانی شد

اس کے بعد جس تذکرے کو بھی اٹھاتے ہیں۔ یہی چیز دیکھنے میں آتی ہے۔ ہفت اقلیم (۱۰۰۴ھ) میں بھی یہی مریدی اور یہی رباعی موجود ہے صاحب میخانہ

کہہ رہے ہیں واردات شیخ کو بھی جمع کیا ۔ یہی رباعی بھی دے رہے ہیں ۔
صوفی آباد کا ذکر بھی ہے ۔ مرآۃ الخیال (۱۱۰۲ھ) اور خزانۂ عامرہ (۱۱۷۶ھ)
میں بھی اسی بات پر زور دیا ہے ۔ اور بتایا ہے کہ خواجو ان کے نہایت
ارادت مند مرید تھے ۔ آتش کدہ (۱۱۹۵ھ) میں بھی یہی کیفیت ہے ۔
نشترِ عشق سے بھی اسی کی تائید ہو رہی ہے ۔ آثارِ عجم میں بھی یہی آثار ہیں،
تعجب ہے ۔ کہ تاریخ ادبیاتِ ایران میں جو باتیں یا روایتیں عام مشہور ہیں
عام طور پر مشکوک، اور بسا اوقات بے سر غلط بھی دی ہیں ۔ مثلاً یہ رباعی چار
تذکروں میں منقول ہوتی چلی آ رہی ہے ۔ اور مریدی کا ذکر تو سبھی کرتے ہیں
صاحب مخزن الغرائب (۱۲۱۰ھ) بھی یہ بتا رہے ہیں کہ اشعار شیخ را جمع کردہ
شیخ کا دیوان تو واقعی باڈلین کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔ لیکن ہم کس طرح
ان سب باتوں کو بغیر تحقیق کے تسلیم کر لیں، جب ہمیں خواجو کے سارے خمسہ
اور دیوان میں کوئی شعر نظر نہیں آ رہا ۔ جس سے اس مریدی اور عقیدت مندی
کا اثبات ہو سکے ۔ سب سے زیادہ تعجب یہ کہ وہ مشہور رباعی بھی ان کے
مجموعۂ رباعیات میں نہیں ملتی ۔ وہ کبھی سمنان کا ذکر نہیں کر رہے اور نہ ہی
شاہ علاء الدولہ کا نام لیتے ہیں ۔ صاحب میخانہ تو فرماتے ہیں ۔ کہ مدت تک
صوفی آباد میں پیر کے ساتھ رہے اور پھر اجازت لے کر وطن آئے اور
"بصحت رسیدہ کہ خواجو شصت و دو سال عمر گذرانده و در کرمان در سنہ
۷۴۲ ہجری شش سال بعد از آن کہ پیر روشن ضمیرش از عالم فانی بعالم باقی
خرامید بناچار سفر آخرت اختیار کرده است" ۔ چونکہ شاہ علاء الدولہ کی وفات
مسلمہ طور پر ۷۳۶ھ ہے ۔ چھ سال کی قید بھی ساتھ لگا دی ہے ۔ کس قدر
بے سر و پا بات کہہ گئے ہیں ۔ حالانکہ خواجو کی دو مثنویاں کمال نامہ اور گوہر نامہ

۷۴۴ھ اور ۷۴۶ھ میں لکھی جاتی ہیں۔ ہاں جیسا عرض کیا ہے۔ ان شاہ صاحب کا ذکر خواجو نے کسی جگہ نہیں کیا۔ جو انہیں ایک نہایت عقیدت مند مُرید ہونے کی صورت میں کرنا چاہیئے تھا۔ مگر وہ گازرون بار بار پکار رہے ہیں مثنوی اور دیوان میں اس کا اعادہ ہے۔ پیر گازرون شیخ ابواسحٰق متوفی ۴۲۶ھ کی لحد کی زیارت ان کے لئے زندگی دل کی ہے۔ گویا ان کی روح کو بار بار پکار کر کہہ رہے ہیں ؎

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا

ساتھ ہی وہ شیخ امین الدین گازرونی کی مدح بھی بڑے زور عقیدت سے کر رہے ہیں۔ شعر پہلے درج ہو چکے ہیں۔ یہ صاحب بھی اپنے زمانے کے بہت بڑے بزرگ اور صاحب ارشاد تھے۔ اور جب خواجو کمال نامہ کے انجام میں ذکر کرتے ہیں ؎

در سماع آمد از ترنّم من — وآفرین کرد بر تکلّم من
نام نظمم کمال نامہ نہاد — وزکمالیستم دری بکشاد

اور ؎

خرقہ داد واجازتم فرمود — رہ ملک حقیقتم بنمود

تو ان کو فیض صوفی آباد سے نہیں گازرون سے ملتا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر صاحب میخانہ کے اس قول میں کہ "پس از انجا بکرمان آمد وخانقاہی ساخت وبقیۂ عمر با درویشان بخدا پرستی مشغول بودہ" میں اگر کوئی شائبہ سچائی کا ہے تو اس کی تاکید کمال نامہ کے ان تین شعروں سے ہوتی ہے اور چونکہ کمال نامہ شیراز کے بادشاہ کے لئے یقیناً شیراز ہی میں لکھا گیا ہوگا۔ اس میں شک

کی گنجایش نہیں رہتی۔ کہ شیخ امین الدین گازرونی جوان دنوں ابھی زندہ تھے اور شیخ علاء الدولہ آٹھ سال قبل وفات پا چکے تھے۔ شیراز آئے ہوں۔ اور خواجو لکھتے ہیں ؎

مرشدم در رسید چرخ زنان   دست دادہ بدست ہفت تنان
شکر از لفظ در کنارم ریخت   گہر نطق بر گذارم ریخت

نہ ہی خواجو کے کلام میں ان کے تعلقات شاہ علاء الدولہ سمنانی کے ساتھ ہونے پر روشنی پڑتی ہے اور نہ ہی شاہ علاء الدولہ کی سوانح حیات سے خواجو کے ساتھ اس قسم کی شفقت و مہر آمیزی کا برتاؤ ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ کہیں نام بھی نہیں ملتا۔ بلکہ وہ تو کہہ رہے ہیں "چون آثار سمنان و اشعار سلمان ندیدہ ام" سلمان وہی سلمان ساوجی ہیں۔ جو خواجو کے معاصر ہیں۔ اس لئے مزید مواد تحقیق کے نہ ہوتے ہوئے فی الحال یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ خواجو شیخ امین الدین گازرونی کے مرید باصفا تھے۔ اور جہاں پیر کا لفظ بلا تخصیص نام کے آیا ہے۔ اس سے مراد وہی ہیں۔

گہر نامہ خواجوی کرمانی کی پانچویں مثنوی گوہر نامہ ہے۔ جو موضوع اور طرز تحریر کے لحاظ سے سب سے نرالی ہے۔ یہ مثنوی بھی ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ اس کا وزن خسرو شیریں کا ہے (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل) شاعر نے اس کا نام گوہر نامہ یا گہر نامہ دونو طرح سے دیا ہے۔ مثلاً

؎ چو کردم گوہر افشان نوک خامہ   گہر نامہ نہادم نام نامہ

اور پھر فرماتے ہیں ؎

اگر چون مشتری صاحب قرانی   بدانی ہیچہ خورشید این معانی
کہ گوہر نامۂ راگر بہای ست   بہایش دُر درج کبریای ست

اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۷۴۶ ہجری ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شب آدینہ و روز برجیس — سعود آسمان ناظر تسدیس

مہ تیر و زمہ یک نیم رفتہ — ز ہجرت ذال و واو و میم رفتہ

سعید نفیسی فرماتے ہیں کہ یہ شب جمعہ کہ ۱۵ تیر ماہ ۷۴۶ ہجری کے مطابق ہے پنجم ربیع الاول سال ۷۴۶ ہجری ہے۔ گہرنامہ کے دیباچہ میں امیر مبارز الدین بانی خاندانِ مظفری کی مدح ہے۔ اور پھر مثنوی شروع ہوتی ہے۔ مثنوی کیا ہے؟ خواجہ بہاء الدین محمود (وزیر امیر مبارز الدین۔ جن کا ذکر نہ ہی حبیب السیر اور نہ ہی دستور الوزراء میں ملا ہے) اور اس کے آبا و اجداد کی مدائح ہیں۔ خواجہ بہاء الدین نظام الملک طوسی کے چھٹی پشت سے پوتے ہیں۔ طرز بیان اس طرح ہے۔ کہ پیر دانش افروز سے خواجہ بہاء الدین کے حسب و نسب خاندان و مرتبہ کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ تو جواب ملتا ہے ؎

گہر جوئی چو او عالی گہر کیست — ہنر جوئی چو او صاحب ہنر کیست

نظام الملک طوسش جد اعلیٰ ست — شود کار نظام الملک از و راست

اس کے بعد نظام الملک طوسی پھر ان کے فرزند تاج الدین محمود حمید الملک پھر ان کے فرزند نور الدین قوام الملک۔ پھر فخر الدین، زکی الدین محمود، عز الدین یوسف، اور آخر میں اپنے ہم زمانہ اور مربی وزیر خواجہ بہاء الدین محمود کا حال بیان کرتے ہیں۔ حال بیان کیا کرنا ہے، صرف مدائح ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کتاب سے ہمیں اس خاندان کے متعلق جو تین سو سال سے زائد تاریخ ایران میں مقتدر اور معزز رہا ہے۔ معلومات ملنے کی توقع تھی۔ لیکن یہاں سوائے ناموں کے اور کیا ہے۔ البتہ تاج الدین محمود حمید الملک کا مدفن جرنداب میں اور زکی الدین محمود کا مزار دہخوارقان میں بتا رہے ہیں۔ نظام الملک طوسی کی

تاریخ شہادت بھی ۴۸۵ھ دی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کہاں شہید ہوئے اس میں سلطان ملک شاہ کے اس فرمان کی تفصیل بھی ہے۔ جس میں نظام الملک طوسی کو اپنی مملکت کا وزیر اعظم مقرر کیا ہے۔ پروفیسر براؤن نے اس زبردست عالم و فاضل سیاست دان اور معاملہ فہم وزیر کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ بادشاہ ان کی بمنزلہ والد قدر کرتے تھے۔ خواجو لکھ رہے ہیں ؎

اتابک خوانده ایش در مراتب

پدر دانسته ایش در مناصب

براؤن کی دوسری جلد پڑھ کر میری معلومات میں اس وزیر کے متعلق اس کتاب سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اختتام میں شرف الدین مظفر پسر امیر مبارز الدین کی مدح ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی کے ابیات کی تعداد بھی شعر ذیل سے مقرر کر دی ہے ؎

چو این ابیات مطبوعت پسند است

اگر خواہی کہ بشماری کہ چند است

حسابی از نظام الملک برساز

وز ان مجموع لام و نون بینداز

۱۱۱۲ سے ۹۰ کم کرنے سے ۱۰۲۲ حاصل ہوتے ہیں۔ نسخۂ ایشیاٹک سوسائٹی میں شروع کے ۳۲ شعر نہیں ہیں باقی صرف ۹۵۶ ہیں۔ اور برٹش میوزیم کے روٹوگراف کا آخری حصہ موجود نہیں ہے۔ اس مثنوی کی اور خصوصیت یہ ہے کہ ہر ممدوح کے حالات خاندان دینے کے بعد مشتری، مریخ، شمس، زہرہ اور عطارد باری باری پیر دانش آموز کی صداقت کی تصدیق کرتے ہیں اور آخر میں خواجو اپنے معشوق سے ایک غزل طلب کرتے ہیں جو ترنم سے سنائی جاتی ہے

اسی وجہ سے یہ مثنوی نہایت دلچسپ ہوگئی ہے ۔

سام نامہ ایک اور مثنوی سام نامہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ۔ میرے خیال میں یہ خواجو کی تصنیف نہیں ۔ اس کے مختلف سائز کے نسخے پائے جاتے ہیں ۔ ۱۱ ہزار اشعار بھی کسی نسخے کے ہیں ۔ جب تک دو چار مختلف نسخے دیکھنے کا موقعہ نہ ملے ۔ میں اس کے متعلق کچھ کہنے کو تیار نہیں ۔ البتہ برٹش میوزیم سے جو روٹوگراف منگایا گیا ہے ۔ اس کو مدّنظر رکھتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ یہ چیز نہایت مایوس کن ہے اور مجعول کتاب ہے ۔ خواجو کی مستقل تصنیف نہیں ۔ شاہنامہ اور ہمائے ہمایوں سے سرقہ کیا ہے ۔

تاریخ وفات خواجو کی تاریخ پیدایش کی طرح ان کی تاریخ وفات کے متعلق بھی بہت اختلاف دیکھنے میں آیا ہے ۔ بہتیرے مہربان تو ۷۴۲ دیتے ہیں ۔ حالانکہ خواجو کی مثنوی کمال نامہ اور گوہر نامہ ۷۴۴ ، ۷۴۶ھ میں لکھی گئیں ۔ اور تاریخ خود شاعر نے ضبط کی ہے ۔ اس لئے یہ تاریخ لغو محض سمجھ کر نظر انداز کی جا سکتی ہے ۔ ان حضرات میں صاحب تذکرۃ الشعراء ، خزینہ گنج الٰہی ، میخانہ ، مجمع النفائس ، مرآۃ العالم ، آثار عجم شامل ہیں ۔ ڈاکٹر ارڈمان بھی اسی مغالطے میں ہیں ۔ مرآۃ الخیال ، ہفت اقلیم ، آتشکدہ ، حبیب السیر میں مجھے کوئی تاریخ نہیں ملی ۔ دوسری تاریخ ۷۵۳ھ ہے ۔ خزانۂ عامرہ ، نشتر عشق ، منتظم ناصری اور شمع انجمن میں تاریخ یہی ہے ۔ پروفیسر براؤن بھی اسی پر متفق ہیں ۔ یہ تاریخ خزانۂ عامرہ میں اوّل اوّل ہمیں مل رہی ہے ۔ اس سے زائد ثبوت ہمارے پاس نہیں ۔ خزانۂ عامرہ (۱۷۶ھ) میں یہ واقعہ اس طرح ہے :-

" خواجو مادح محمد مظفر بوده ، آخر ازو رنجیده نزد شاه ابو اسحٰق والی شیراز رفت و مشمول عواطف گردید ، و در رسم ختان علی سہل بن شاه مذکور قصیدهٔ گفته

بعرض رسانید۔ شاہ طبقی پر از زر عنایت کرد، خواجو بمجرد مشاہدۂ طبقِ زر شادی مرگ شد، و روح او از فرط انبساط در ہوا پرواز کرد، مضجع او در تل اللہ اکبر شیراز است"
یہی کیفیت ہمیں نشترِ عشق میں مل رہی ہے۔ شمع انجمن میں بھی یہی چیز ہے۔ یہ
تل وہی تنگ اللہ اکبر ہے۔ جس کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ اس
درہ سے گزرنے پر شیراز کے شہر کا دلکش منظر سامنے آتا ہے تو انسان
بے اختیار اللہ اکبر کہہ اٹھتا ہے۔ مجمع النفائس (۱۱۶۴ھ) میں جو خزانۂ عامرہ
سے بارہ برس پہلے لکھا گیا۔ خواجو کا مدفن شیراز کے اسی تنگ اللہ اکبر کو بتایا
ہے۔ لیکن تاریخ ۷۵۳ کی بجائے ۷۴۳ دی ہے اور شادی مرگ کا واقعہ بھی
درج نہیں کیا ہے۔ اس کے قبل کے تذکروں میں کسی میں بھی خواجو کی وفات
اس طرح سے بیان نہیں کی گئی۔ صاحب میخانہ خواجو کی وفات کرمان میں بتا
رہے ہیں۔ مدفن اور تاریخ وفات دونو کا جھگڑا ہے۔ رضا قلی خان ہدایت خواجو
کی وفات ۵۰۳ درج کر کے ریاض العارفین میں ۷۴۲ بیان فرماتے ہیں۔ ایک
ہی مصنف سے ۲۳۹ سال اختلافِ فاحش نہایت محیر العقول ہے۔ قاموس الاعلام
ترکی میں تاریخ وفات ۷۶۲ ہجری ہے۔ حاجی خلیفہ کشف الظنون میں ایک جگہ
۶۴۲، دوسری جگہ ۷۴۲ اور تیسری جگہ ۸۴۲ دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے خواجو
کی وفات ۵۰۲ ــ ۸۴۲ کے درمیان محصور ہو جاتی ہے۔ ۶۴۲، ۵۰۳ تو بالکل
ناقابلِ قبول ہیں۔ جب خواجو اپنی پیدائش ۶۸۹ دے رہے ہیں۔ پھر ۸۴۲
مان لینا گویا خواجو کی عمر ۱۵۳ سال فرض کرنا ہے۔ کہ طبعی عمر سے بہت زائد ہے
۷۴۲ اس لئے ممکن نہیں کہ اس سنہ کے بعد کی کتابیں ملتی ہیں۔ ۷۵۳ اور
۷۶۲ دونو کا امکان ہو سکتا ہے۔ سعید نفیسی فرماتے ہیں کہ میں ۷۶۲ کو ترجیح دیتا
ہوں اور یہ کہ جن صاحبان نے تاریخ ۶۴۲، ۷۴۲ یا ۸۴۲ درج کی ہے اصل۔

میں ۷۶۲ کی غلطی سے تحریف کی ہے۔ اس سنہ سے خواجو کی عمر ۷۳ برس ہوتی ہے۔ یہ پروفیسر سعید نفیسی کا ذاتی اجتہاد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرینِ قیاس ہے۔ لیکن کوئی ثبوت فی الحال ہمارے پاس موجود نہیں۔

مرقدِ خواجو جن دنوں ڈاکٹر محمد اقبال صاحب (صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی) ایران تشریف لے گئے تھے۔ شعاع الملک نے اُن کو شیراز میں خواجو کی قبر تنگِ اللہ اکبر کے پاس دکھائی تھی۔ مزار پکّی تھی لیکن سنگِ مزار پر کوئی تحریر نہ تھی۔ شعاع الملک کے پاس بھی کوئی خاص ثبوت اس قبر کا خواجو کی قبر ہونے کے متعلق نہ تھا۔ لیکن وہ ذاتی تفحص کی بنا پر مُصر تھے۔ صاحب آثار عجم رقمطراز ہیں۔

"از تکیہ مشرقی کہ بمقدار ہشتاد قدم تخمیناً بگذرند بر کنار جداول رکنا باد طاقی و رواقی ست و محرابی دران دیدہ می شود کہ عبادت گاہی بودہ و در گوشۂ ازان رواق مزاری ست کہ سنگ بسیار بزرگی دارد، و بر آن خطی کہ نام صاحب قبر باشد نقر نشدہ، جز اینکہ بالای سرش بخط ثلث نوشتہ "کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذی الجلال والاکرام"، مشہور است کہ آن قبر مشرقی ست کہ یکی از مشائخ عرفاست، اگرچہ بر ما مجہول است کہ قبر کہ باشد ولی از قرائن کہ صاحبانِ تذکرہ وغیرہم ذکر کردہ اند و نشان دادہ اند باید قبرِ خواجوی کرمانی باشد، و جماعتی کثیر ہم اعتقاد شان ہمین است، و اینکہ برخی اورا قبر مشرقی دانند اصلی نداشتہ باشد۔"

پھر حاشیہ میں یوں لکھا ہے "مثل اینکہ وقتی در مسافرت نامۂ شخص انگلیسی کہ دویست سال قبل ازین بشیراز آمدہ نوشتہ بود کہ وارد شیراز شدم نزدیک بہ تنگِ اللہ اکبر بر کنار جدول رکنا باد سنگی بزرگ محدب بر قبری نہادہ اند۔ مردم شیراز آنجا آمدہ فاتحہ می خواندند، پرسیدم این قبر ازکیست، مذکور داشتند از خواجوی کرمانی است باین دلیل قبر وی باشد واللہ اعلم"،

عبرت کا مقام ہے کہ ایسے شاعر اور ادیب جن کے ادبی شاہکاروں سے گلستانِ ادب کی رونق ہے اور جن کا کلام ہزاروں بندگانِ خدا کے دماغی تعیش کا سامان بن رہا ہے۔ اب اس قدر بے نشان ہو چکے ہیں۔ کہ اُن کی قبر کے متعلق بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ اُن کی ہے۔ سالِ وفات تو بڑی بات ہے۔ اس کا تو سلسلہ ہی الگ رہا ؛

خواجو علیہ الرحمۃ کے دیوان کی بحث فی الحال مشکل ہے۔ میگزین کے کسی آیندہ نمبر میں دیوان کا مطالعہ کرنے پر شایع ہوگی۔ خواجو کی غزلیات کی وقعت بی اے پرشین کورس میں درج ہونے پر ادبی حلقوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ ان کے قصاید بھی نہایت لطیف اور دلچسپ ہیں۔ قطعات اور دیگر اصنافِ سخن میں بھی دلچسپی کا بہت بڑا سامان ہے۔ وہ لبا اوقات بہت سی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو اعتبارِ سوانح نگاری سے نہایت اہم اور مفید ہیں۔ کہیں بیمار ہونے اور دوستوں کے عیادت پر نہ آنے کے شاکی ہیں کسی جگہ تقاضا زین کے لئے کر رہے ہیں جب گھوڑا مل چکا ہے کہیں ایک زبردست ہجو لکھ کر اس قدر بے نقط سناتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ کبھی کسی شاعر سے اُلجھ رہے ہیں تو کبھی کسی سرکاری افسر کی مدح ہے۔ ان کے ممدوحین کی تعداد بیس سے زائد ہے۔ جن میں ہرمز کے دو بادشاہ بھی شامل ہیں۔ غرض خواجو کی سوانحِ حیات کے متعلق کچھ جاننے کے لئے دیوان کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ فنِ تاریخ کے بھی ماہر ہیں اور اکثر اوقات قطعۂ تاریخ لکھتے نظر آتے ہیں۔ کوئی حوض یا محل تعمیر ہوا ہے تو سالِ تعمیر خواجو لکھ رہے ہیں۔ یہ بحث کافی وسیع ہے۔ فی الحال نظر انداز کی جاتی ہے ؛

تاج محمد خاں

مسائلِ نافع بن الازرق عن عبداللہؓ ابن عباسؓ

تفسیر قرآن کے بارے میں سب سے پہلی اور ابتدائی کوشش جس کے بارے میں ہمیں کوئی مفصل شہادت ملتی ہے وہ وہ ہے جو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے۔ میرا مطلب اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ احادیث میں بعض آیات کی جو تشریح مذکور ہے اور جو عموماً خود سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم یا دیگر ممتاز صحابہ سے مروی ہے وہ ابتدائی کوششیں نہیں ہیں۔ یقیناً وہ اس قابل ہیں کہ انہیں ابتدائی تفسیر کا درجہ دیا جائے مگر وقت یہ ہے کہ کسی ایک صحابی سے اتنا کچھ مروی نہیں ہے کہ اس صحابی کو مفسر کہہ سکیں یا اس کی روایات کو تفسیر کا درجہ دے سکیں۔ ہاں حضرت ابن عباسؓ سے جو کچھ مروی ہے۔ وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اسے تفسیر کہا جائے۔ کیوں نہ ہو حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی دعا اَللّٰھُمَّ عَلِّمہ الکتاب کہیں شرفِ اجابت سے محروم رہ سکتی ہے!

روایات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابن عباسؓ سے جو کچھ مروی ہے اس کا کثیر حصّہ وہ ہے جو تفسیر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، لوگ آپ کے پاس آتے تھے اور اپنے اشکال بیان کر کے شافی جواب پاتے تھے۔ ہمارے یورپین نقاد جو جی چاہے کہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ آپ کی ذکاوت تفقہ فی الدین اور دینداری پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال کرنا کہ آئندہ چل کر چونکہ حکومت بنو عباسؓ کے ہاتھ آگئی تھی اس لئے حضرت ابن عباسؓ کی

۱؎ بخاری مناقب صحابہ، ۲؎ دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام - آرٹیکل عبداللہؓ بن عباسؓ۔

کسی کمزوری کو ٹھیک ٹھاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے کسی طرح قابلِ وثوق بات نہیں۔ اس لئے کہ اگر حکومت کے دباؤ یا اشارے سے کچھ کیا جاتا تو آج ان کے خلاف کسی کو کچھ کہنے کی گنجایش ہی نہ ہوتی اور وہ بعض خامیاں جواب بھی آپ کی طرف منسوب نظر آتی ہیں صفحۂ تاریخ سے بالکل مٹا دی گئی ہوتیں۔

ہمارے پاس تفسیر کے سلسلے میں جو کچھ آپ سے پہنچا ہے وہ دو صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک تو تنویر المقباس من تفسیر ابن عباسؓ کی صورت میں ہے۔ جسے علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے شائع کیا ہے۔ تفسیر مذکور میں مشکل الفاظ کے معنے مندرج ہیں یا مختصر تشریحی نوٹ وبس۔ کتاب مذکور مصر میں چھپ چکی ہے اور ہندوستان میں عموماً مل جاتی ہے۔ سند اس کی حسب ذیل ہے :۔

اخبرنا عبد اللہ بن المامون الهروی قال اخبرنا ابی قال اخبرنا ابو عبد اللہ قال اخبرنا ابو عبید اللہ محمود بن محمد الرازی قال اخبرنا عمار بن عبد الحمید الهروی قال اخبرنا علی بن اسحاق السمرقندیؒ عن محمد بن مروان عن الكلبی عن ابی صالح عن ابن عباس .... الخ

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ سے مختلف الفاظ کی تشریح کے لئے کہا گیا اور آپ نے سائل کی پوری طرح سے تسلّی و تشفّی کی۔ سائل نے اگر استشہاد کے لئے کہا۔ تو آپ نے سند پیش کی۔ سائل نے توضیح کے لئے کہا تو آپ نے مزید توضیح کی۔ ممکن ہے۔ کہ ابتدا میں لوگ حضرت ابن عباسؓ سے مختلف مسائل دریافت کرتے رہے ہوں۔ حتےٰ کہ قرآن مجید کے بیشتر حصّوں کی آپ نے تفسیر بیان کر دی ہو اور پھر کچھ عرصہ گذرنے پر آپ نے پورے قران مجید کی

تفسیر بیان کر دینے کا تہیّہ کرلیا ہو جو آج تنویر المقباس کی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہے ؛

اس نظریے کے ماتحت تفسیر کی بنیاد صرف وہی چند مسائل ہوں گے جو مختلف افراد نے حضرت ابن عباسؓ سے مختلف اوقات میں دریافت کئے یعنی ابتدائی تفسیر ان چند مسائل پر منحصر ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کئے گئے اور آپ نے جواب دئے ؛

ان مسائل کے دریافت کرنے والوں میں نافع[1] بن الازرق کی شخصیت ممتاز نظر آتی ہے اور چونکہ نافع خوارج کا ایک اہم سردار آئندہ زندگی میں بن گیا تھا، اس لئے وہ مسائل جو اس نے حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کئے تھے اہمیت حاصل کر گئے اور مختلف رواۃ کے ذریعہ کم و بیش ہم تک پہنچ گئے ؛

نافع کی ہستی کوئی نئی نہیں ہے۔ مبرد نے جو صلتان[2] عبدی کے اشعار نقل کئے ہیں وہ نافع اور نجدۃ کی حالت کو بہت کچھ واضح کرتے ہیں ؛

ارى اُمّةً شهرت سيفها ۔۔۔ وقد زيد فى سوطها الاصبحى

بنجديّةٍ وحروريّةٍ ۔۔۔ وازرق يدعوالى ازرقى

اشعار بالا اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ نجدۃ بن عویمر یا عامر اور نافع بن الازرق دو اہم لیڈر ہیں۔ چنانچہ مبرد نے وازرق یدعوالی ازرقی کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔ یريد[3] من كان من اصحاب نافع بن الازرق الحنفى اور نافع کی شخصیت ان الفاظ میں انٹروڈیوس کرائی ہے[4] وكان نافع شجاعًا

---

[1] حالات کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام آرٹیکل نافع ، [2] الکامل للمبرد طبع مصر ج ۳ ص ۱۰۴ ، [3] الکامل ج ۳ ص ۱۰۵ ، [4] الکامل ج ۳ ص ۱۰۵ ،

مقدمًا فی نفقہ الخوارج ولہٗ مع عبد اللہؓ بن عباسؓ مسائلُ کثیرۃٌ

ان مسائل کے متعلق یہاں تو یہ کہا ہے وسنذکر جملۃ منھا فی ھٰذا الکتاب انشاء اللہ

اور آگے چل کر اس بیان کو یوں شروع کیا ہے :-

"وکان نافع ینتجع عبد اللہؓ بن عباسؓ فیسألہ فلہٗ عنہ مسائلُ

من القرآن وغیرہٖ قد رجع فی تفسیرھا فقبلہ"[1]

ان مسائل کا ذکر مبرد نے ہی نہیں بلکہ اور کئی مصنفوں نے بھی کیا ہے

کہ نافع بن الازرق نے حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ سے قرآن مجید کے بعض

الفاظ کی تشریح چاہی اور جواب میں عربی زبان سے حجت بھی طلب کی۔ ملاحظہ

ہو جمھرۃ اشعار العرب لابی زید الاتقان للامام السیوطی۔ کتاب

الوقف لابن[3] الانباری ومعجم الکبیر للطبرانی (آخر الذکر دونوں کتابیں

بحوالہ امام سیوطی درج کی گئی ہیں)

صاحب جمہرہ فرماتے ہیں :-[4] فمن ذٰلک ما حدثنا بہ المفضل

بن محمد الضبی یرفعہ الی عبد اللہؓ بن عباسؓ قال قدم

نافع بن الازرق الحروری الی ابن عباس رضی اللہ عنھما یسألہ

عن القرآن فقال ابن عباس یا نافع القرآن کلام اللہ عزوجل خاطب

بہ العرب بلفظھا علی لسان افصحھا فمن زعم ان فی القرآن غیر

العربیۃ فقد افتری قال اللہ تعالٰی قرآنا عربیا غیر ذی عوج ..... الخ

امام سیوطی نے اس بات کو جائز ثابت کرتے ہوئے کہ اشعار عرب سے

قرآن مجید کے معانی پر استدلال کیا جا سکتا ہے لکھا ہے :-

---

[1] الکامل ج ۲ ص ۱۳۳ ، [2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے غیر قرآن کے متعلق بھی دریافت کیا تھا،

[3] کتاب کا نام ایضاح الوقف والابتداء ہے۔ اسکا ایک بہت ہی اعلیٰ نسخہ سلیم آغا آفندی اسکیدار استنبول کے کتب خانے میں ہے جو ۳۱۳ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ دیکھو کتب خانہ مذکور ۳۲ ، [4] جمہرۃ اشعار العرب مقدمہ ،

قلت[1] قد روینا عن ابن عباس کثیراً من ذٰلك واوعب ما رُوِیناہ عَنْہُ مسائل نافع بن الازرق وقد اخرج بعضہا ابن الانباری فی کتاب الوقف والطبرانی فی معجمہ الکبیر . . . . الخ

ان بیانات کی روشنی میں یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ نافع بن الازرق نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے قرآن مجید کے بعض مشکل مقامات کو حل کرنے کے لیے سوالات کئے اور جواب میں عربی زبان سے استشہاد چاہا ؛

اب ہم مختلف کتب پر اور ان کے بیان کردہ مسائل پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں اور سب سے پہلے مبرد اور ان کے بیان کردہ مسائل کو لیتے ہیں مبرد نے صرف سات مسئلے بیان کئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی سند قریبًا علیحدہ ہے ؛

۱۔ حدثنا[2] ابو عبیدۃ معمر بن المثنی التیمی النسابۃ عن اسامۃ بن زید عن عکرمۃ قال رایت عبداللہؓ بن عباسؓ وعندہٗ نافع بن الازرق وھو یسألہ ویطلب منہ الاحتجاج باللغۃ فسألہ عن قول اللہ جلّ ثناءہ . . . . الخ

۲۔ سمعناہ من غیر وجہ انّہ سألہٗ . . . . الخ

۳۔ وروی ابو عبیدۃ وغیرہ ان نافعًا سأل ابن عباسؓ . . . الخ

۴۔ ویروی عن غیر ابی عبیدۃ انّہ سألہ . . . الخ

۵۔ عن ابی عبیدۃ من غیر وجہٍ ان نافع الازرق سأل ابن عباسؓ . . . . الخ

---

[1] اتقان ج ۱ ص ۱۲۰ ، [2] الکامل جلد ۳ ص ۱۳۰ ومابعد ،

لے مما سألہ کہہ کر ٹال دیا ہے۔

آگے جا کر ایک اور مسئلہ والذین لا یشہدون الزور کے معنوں میں ھی اعیاد المشرکین بیان کرنا حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے۔ مگر سائل کا نام مذکور نہیں۔ صرف ویروی عن ابن عباسؓ کہا گیا ہے،

اب ذرا جمہرہ کی عبارت اور سند ملاحظہ ہو :-

[2]فمن ذالك ما حدثنا بہ المفضل بن محمد الضبی یرفعہ الی ابن عباس رضی اللہ عنہما قال قدم نافع بن الازرق الحروری الی ابن عباسؓ یسألہ عن القران فقال ابن عباسؓ یا نافعُ القرانُ کلام اللہِ عزوجل خاطب بہ العرب بلفظہا علیٰ لسان افصحہا فمن زعم ان فی القران غیر العربیۃ فقد افتریٰ قال اللہ تعالیٰ قرانا عربیا غیر ذی عوج وقال تعالی بلسان عربیٍ مبین وقد علمنا ان اللسان لسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم وقال تعالیٰ وما ارسلنا من رسول اِلّا بلسان قومہ لیبین لہم وقد علمنا ان العجم لیسوا قومہ وان قومہٗ ھذا الحی من العرب وکذالك اُنْزل التوراۃ علی موسیٰ علیہ السلام بلسان قومہ بنی اسرائیل اذ کانت لسانہم الاعجمیۃ وکذالك انزل الانجیل علی عیسیٰ علیہ السلام لا یشاکل لفظہ لفظ التوراۃ لاختلافِ لسانِ قومِ مُوسیٰ وقوم عیسیٰ وقد یقارب اللفظُ اللفظَ او یوافقہ واحدھما بالعربیۃ والاٰخر بالفارسیۃ اوغیرھا فمن ذالك استبرق بالعربیۃ وھو بالفارسیۃ استبرہ وھو الغلیظ من

لے الکامل ۳ ۱۴۶ ، ۲ے جمہرۃ اشعار العرب مقدمہ ص ۷ ۔

الدیباج والفرند وھو بالفارسیۃ الفکرند وکورو ھو بالعربیۃ
کورو سجیل وھو موافق اللغتین جمیعًا وھو الشدید وقد
یدانی الشیئُ الشیئَ ولاینسب الیہ لیعلم العامۃُ قربَ ما بینھما
وفی القران مثل ما فی کلام العرب من اللفظ المختلف ومجاز المعانی
فمنْ ذالك قول ۔۔۔۔ الخ

زان بعد صاحب جمہرہ نے بہت سے اشعار اور قرآنی آیات ذکر کی ہیں مگر اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو روایت بیان کر رہا ہے اسے پوری احتیاط کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی طرز میں ڈھال کر بیان کر رہا ہے۔ میرے اس خیال کی تائید حسب ذیل وجوہات سے ہوتی ہے:۔

(۱) الفاظ کے متعلق بحث کرنا کہ ایک زبان کے دوسری سے ملتے جلتے ہیں جیسے سنگین وسجین یا سجیل۔ استبرق و استبرہ وغیرہ۔ یہ بحث اگرچہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب تو ہوسکتی ہے مگر واقعۃً قریب من المحال ضرور ہے۔

(۲) حضرت ابن عباسؓ کا یہ کہنا فمن ذالك قول امرئ القیس اور پھر اسکا شعر پڑھ کر قرآن مجید کی آیت کا حوالہ دینا اور اسی طرح آخر تک کئے جانا۔

(۳) کوشش کرنا کہ ایک شاعر کے اشعار اکٹھے آئیں۔ چنانچہ جمہرہ میں پہلے امرؤ القیس کے اشعار اور قرآنی آیات مذکور ہیں۔ پھر زہیر کے اور پھر اعشیٰ کے ۔۔۔۔۔

(۴) پہلے شعر کا ذکر کرنا پھر قرآن مجید کی آیت کا۔

(۵) کہیں کہیں صرفی۔ نحوی یا لغوی تشریح کرنا۔

(۶) نہ نافع کا سوال کرنا نہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کا جواب دینا۔ جیسا کہ عادی طور پر ہونا چاہیئے تھا۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

قال امرؤ القیس بن حجر فی موافقة اللفظ

وتبرجت لتروعنا — فوجدتُ نفسی لَمْ تُرَعِ

وقال تعالیٰ غیر متبرجات بزینةٍ والتبرج هوان تبدی المرأة زینتها

صاحب جمہرہ نے کل ۱۸ مسائل بیان کئے ہیں۔ جن کے لئے ۸۴ اشعار اور ۸۳ آیات درج کی ہیں۔ ان میں سے بہت کم مسائل ہمارے رسالہ سے مشترک ہیں۔

امام سیوطی نے ۱۹۵ سوالات کا تذکرہ کیا ہے اور استشہاد میں ۹۶ اشعار ذکر کئے ہیں۔ سند ملاحظہ ہو :۔

اخبرنی ابو عبداللہ محمد بن علی الصالحی بقرأتی علیہ عن ابی اسحاق التنوخی عن القاسم بن عساکر انبأنا ابو نصر محمد بن عبداللہ الشیرازی انبأنا ابوالمظفر محمد بن سعد العراقی انبأنا ابو علی محمد بن سعید بن نبھان الکاتب انبأنا ابو علی بن شاذان حدّثنا عبدالصمد بن علی بن محمد بن مکرم المعروف بابن الطستی . . . الخ

ابن طستی اور اس کے مابعد کے رواۃ وہی ہیں جو زیر بحث رسالہ کے ہیں۔ یعنی ہماری روایت ابن طستی سے شروع ہوتی ہے۔ بخلاف اتقان کی روایت کے جسے امام سیوطی اپنے زمانے تک پہنچاتے ہیں۔ ابوبکر بن الانباری کی کتاب الوقف میں جو سند مذکور ہے وہ حسب ذیل ہے :۔

قال[1] حدثنا بشر بن انس انبأنا محمد بن علی بن الحسن بن شقیق انبأنا ابو صالح ھدبة بن مجاھد انبأنا مجاھد بن شجاع

---

[1] اتقان ج ۱ ص ۱۲۰ ،

انبأنا محمد بن زیاد الیشکری عن میمون بن مهران قال دخل نافع بن الازرق المسجد فذکرہ

امام سیوطی نے طبرانی کی سند کے متعلق حسب ذیل الفاظ ذکر کئے ہیں :-

وأخرج الطبرانی فی معجمہ الکبیر منھا قطعة وھی المعلم علیھا صورة ط من طریق جویبر عن الضحاک عن مزاحم قال خرج نافع بن الازرق فذکرہ ،

امام[1] سیوطی نے اتقان لکھتے وقت وضاحت کے لئے طبرانی اور ابن الانباری کی روایات سے ملتے ہوئے مسائل پر سرخ ك اور ط کے نشان لگا دیئے تھے - مگر نقل کرنے والوں اور چھاپے کی مہربانی سے مطبوعہ کتاب میں یہ امتیاز باقی نہ رہ سکا - ان دونوں کتابوں کے مطبوعہ نہ ہونے سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ زیر بحث رسالہ کے کون کون سے مسائل ان کتب میں موجود نہیں ہیں۔

یہاں[2] پر یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ ابن الانباری کی کتاب ایضاح الوقف والابتداء کا ایک نسخہ سلیم آغا اُسکیدار کے کتب خانے میں ۳۲ پر ہے - جو ۵۶۳ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے - اسی طرح اس کا ایک نسخہ فیض اللہ استنبول کے ۱۳ پر ہے - عاشر آفندی کے کتب خانہ ۷ پر ایک اور نسخہ ہے جو ۴۹۹ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے ؛

معجم[3] الکبیر طبرانی کے نسخے دمشق کی الظاہریہ لائبریری میں نمبر ۲۸۲ پر کتبخانہ احمد ثالث توپ قپو سرائے استنبول کے نمبر ۴۶۵ پر اور کتب خانہ کوپرولو زادہ محمد پاشا استنبول میں موجود ہ میں ظاہریہ کا نسخہ ۵۸۵ھ ہجری میں لکھا گیا ہے - یہ تینوں نسخے

---

[1] اتقان ۱ × ۱۳۳ ، [2] یہ اطلاعات استاذی میمن عبدالعزیز نے مہیا کی ہیں -

[3] یہ حصہ میمن صاحب کی یادداشت سے لیا گیا ہے ؎

مکمل نہیں ہیں ؂

اتقان کے مسائل کے متعلق امام سیوطی فرماتے ہیں۔ کہ بعض حذف کر دیئے گئے ہیں۔ عبارت ملاحظہ ہو :۔

[1] ھٰذا اٰخر مسائل نافع بن الازرق وقد حذفتُ منھا یسیراً نحو بضعۃ عشر سؤالا وھی اسئلۃ مشھورۃ اخرج الائمۃ افراداً منھا باسانید مختلفۃ الی ابن عباسؓ

امام سیوطی نے جس طرز سے ان مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ نے بے انتہا اختصار سے کام لیا ہے نمونہ ملاحظہ ہو :۔

[2] قال اخبرنی عن قولہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ قال الوسیلۃ الحاجۃ قال وھل تعرف العرب ذالک قال نعم اما سمعت قول عنترۃ [4]

ان الرجال لھم الیک وسیلۃ ان یأخذوک تکحلی وتخضبی

اور آگے چل کر اس سے بھی زیادہ اختصار سے کام لیا ہے :۔

[3] قال اخبرنی عن قولہ تعالیٰ صلدا قال املس اما سمعت قول ابی طالب

وانی لقرم وابن قرم لھاشم لآباء صدق مجدھم معقل صلد

اوپر جن جن کتب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جس نے بالاستیعاب ان تمام مسائل کو لے لیا ہو جو نافع نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کیئے تھے ؂

---

[1] اتقان ۱ × ۱۳۳ ، [2] اتقان ۱ × ۱۲۰ ، [3] اتقان ۱ × ۱۲۲ ، [4] اس شعر کے متعلق صاحب اغانی نے کہا ہے کہ عنترہ کی طرف اسکی نسبت صحیح نہیں بلکہ اسکا قائل خزز بن لوذان ہے دیکھو اغانی ۹ × ۸۸ ،

اگر مبرد کی یہ عبارت کچھ وقعت رکھتی ہے :۔ وی[1] یروی من غیر وجہ

انّ ابن الازرق اتی ابن عباسؓ فجعل یسأله حتی املّه فجعل

ابن عباسؓ یظہر الضجر وطلع عمر بن عبد اللہ بن ابی

ربیعۃ علی ابن عباسؓ وھو یومئذٍ غلام فسلّم وجلس

فقال لہٗ ابن عباسؓ الا تنشدنا شیئاً من شعرک فانشدہٗ

أمن آل نُعم انت غادٍ فمُبکرٗ　　غداۃ غدٍ ام رائح فمہجّرٗ

. . . .

حتی اتمّھا وھی ثمانون[2] بیتاً

تو یہ یقینی امر ہے کہ نافع نے حضرت ابن عباسؓ سے دس بیس یا سو پچاس مسائل پر گفتگو نہیں کی بلکہ بہت زیادہ پر کی ہوگی جبھی تو حضرت ابن عباسؓ اس سے تنگ آئے۔ اس بات کی تائید ایک اور وجہ سے بھی ہوتی ہے - خارجی دین و مذہب کے معاملے میں بے انتہا توغل و تعمق سے کام لیتے تھے بالخصوص نافع بن الازرق جس کے متعلق مبرد نے ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے :۔

و[3] یروی عن ابی الجلد انّہ نظر الی نافع بن الازرق

الحنفی والی نظرہ وتوغّلہ وتعمّقہ فقال انّی لاجد لجہنّم سبعۃ

ابواب وانّ اشدّھا حرّاً للخوارج فاحذر ان تکون منھم

یہی وجہ تھی کہ جب حضرت ابن عباسؓ نے عمر بن ابی ربیعہ سے اشعار سنے[4] تھے تو اس نے فوراً کہا۔

[5] للہ انت یا ابن عباسؓ انضرب الیک اکباد الابل نسالک

---

[1] الکامل ج ۳ ص ۱۳۵ ، [2] یورپین ایڈیشن میں ۵ ، بیت ہیں ممکن ہے اکائی نہ ذکر کی گئی ہو، [3] الکامل ج ۳ صفہ ۱۳۰ ، [4] یہ واقعہ دیوان عمر بن ابی ربیعہ طبع مصر ۱۳۳۰ھ میں ص ۱۹۲ پر مذکور ہے، [5] الکامل ۳ × ۱۳۶ ،

عن الدين فتعرض و يأتيك غلام من قريش فينشدك سفها فتسمعه ،

ان مسائل کے بارے میں ایک رسالہ ہمارے پاس الاستاذ میمن عبدالعزیز پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے پہنچا ہے جسے[1] محمود صدقی نسّاخ نے اس زمانے میں جبکہ دارالکتب المصریہ سے قلمی کتابیں سیاہی سے نہ لکھی جاسکتی تھیں پنسل سے نقل کیا اور پھر اس کی سیاہی سے احمد تیمور پاشا وغیرہ کے لیے متعدد نقلیں کی گئیں۔ اس اصل پنسل کے نسخے کو میمن صاحب نے خرید لیا تھا۔ جو مجھے ان کے ہاں سے ریسرچ کرنے کے لئے مل گیا۔ اس رسالے کا تذکرہ میمن صاحب نے اپنی کتاب الطرائف الادبیہ حاشیہ ص۴۵ پر بھی کیا ہے۔

مسائل[2] نافع بن الازرق کا ایک نسخہ ملّا مراد استنبول کے کتب خانے میں مجموعہ نمبر ۳۰۹ ورق ۱۷۰ ب سے ۱۷۵ ا تک موجود ہے۔ اس کا ایک نسخہ بروایت ابن الانباری کتب خانہ سلطان محمد فاتح مجموعہ نمبر ۵۴۰۴ میں موجود ہے۔ جس کتاب کے ساتھ یہ رسالہ لگا ہوا ہے۔ اس کا نام الجامع الصغیر فی اصول العربیہ لابی عبید اللہ محمد الکلائی ہے اس کے اخیر میں ورق ۱۹۰ سے ۱۹۶ تک مسائل نافع بروایۃ ابن الانباری موجود ہیں۔ یہ نسخہ ۷۷۳ ہجری کا لکھا ہوا ہے اور مصنف کے نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ بہت ہی اعلےٰ درجہ کا تقطیع خورد میں ۱۷ سطروں کا ہے۔

اب سب سے پہلے ہم اس کی سند کو لیتے ہیں جو کہ حسب ذیل ہے:۔

حدثنا ابوالحسین عبدالصمد بن علی بن محمد بن مکرم المعروف[3] بابن الطستی

---

[1] و [2] یہ معلومات میمن صاحب سے حاصل ہوئی ہیں، [3] ابن طستی کے لئے دیکھو کتاب المشتبہ طبع یورپ ص۳۲۵۔ پیدائش ۲۶۶ ہجری وفات ۳۴۶ ہجری خطیب عبدالصمد ۱۸/۵

قراءةً عليه من لفظه فی مسجده بدرب زباج یوم الخمیس
لعشر خلون من ربیع الآخر من سنة اربع واربعین وثلاثمائة
قال (انا) ابو سهل السّریّ بنُ سهل بن خَرْبان الجندیسابوری[1]
عند نشابور قراءةً عَلَیْهِ سنة ثمان وثمانین ومائتین
قال (نا) یحییٰ[2] بن ابی عبیدة المُسْلِمیّ واسم ابی عبیدة بحر بن
فرّوخ قال اخبرنا سعید[3] بن ابی سعید قال (انا) عیسیٰ[4] بن
داب عن حمید[5] الاعرج وعبدُ الله بنُ[6] ابی بکر بن محمد من
ابیه[7] قال بینا عبد الله بن عباس رضی جالس بفناء الکعبة قد
اسدل رجله فی حوض زمزم والناس قد اکتنفوه من کلّ ناحیة
یسألونَهُ عن تفسیر القرآن وعن الحلال والحرام واذ هو لایتعایا
بشیئٍ یسألونه عنه فقال نافع بن الازرق لنجدة بن عویمر
قم بنا الی هٰذا الذی یجترئ علی تفسیر القرآن والفتیا بما لا
علم لَهٗ بِهٖ فقاما الیه فقالا یا ابن عباس ما یحملك علی تفسیر
القرآن والفتیا بما لاعلم لك بِهٖ أشیئًا سمعتَه من رسول اللّٰهِ
صلی الله علیه وسلّم ام هٰذا منك تخرّصًا فهذهٖ والله الجرأة

---

[1] دیکھو المشتبہ طبع یورپ ص۱۵۴ ، [2] باوجود کوشش کے ابھی تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ یحییٰ
بن سعید بن فروخ کا ذکر تو رجال کی کتابوں میں ہے مگر بحر بن فروخ یا یحییٰ بن بحر بن
فروخ وغیرہ کا نہیں ، [3] سعید بن ابی سعید الانصاری المدنی مجہول
من الثالثة تقریب ص۱۴۵ و تہذیب التہذیب ۴ ر ۳۷ ، [4] خطیب ۴۵ ۵ لسان المیزان نمبر ۱۲۵
ج ۴ ، [5] حمید بن ابی حکیم لسان المیزان ج ۲ ص ۱۴۸۵ تہذیب ۳ × ۳۷ ، [6] تہذیب ۵ × ۱۶۴ نمبر ۲۸۱
وفات ۱۳۵ ہجری ، [7] المتوفی سنہ ۱۲۰ ہجری قاضی المدینة ،

علی اللہ عز وجلّ فقال ابن عباس مجیبًا لنافع بن الازرق لا واللہ ما ھذا منی تخرصا ولکنہ علم علّمنیہ اللہ ولکنی سأدلک علی من ھو اجرأ منی یا ابن الازرق قال دلّنی علیہ فقال رجل تکلّم بما لا علم لہ بہٖ او رجل کتم الناس علماً علّمہ اللہ عز وجل فذالک اجرأ منّی یا ابن الازرق وقال نجدۃ فانّک ترید ان نسألک عن اشیاء من کتاب اللہ عزّ وجلّ فتفسّرہ لنا وتأتینا بمصداقہ من کلام العرب فانّ اللہ عز وجلّ انّما انزل القرآن بلسان عربیٍّ مبین قال ابن عباسؓ سلانی عمّا بدالکما نجدا علمہ عندی حاضراً ان شاء اللہ تعالیٰ فقالا یا ابنَ عباسؓ اخبرنا عن قول اللہ عز وجل .... الخ

میں نے اوپر پوری عبارت اس لئے نقل کر دی ہے کہ جس طرز سے یہ واقعہ اس کتاب میں مذکور ہے۔ وہ عقلاً غیر ممکن الوقوع نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا پوچھنے والوں سے گھرے ہوئے ہونا اور نافع و نجدۃ کا سوالات شروع کرنے سے پیشتر اپنے اطمینان اور تسلی کے لئے ایسی پوچھ گچھ کرنا جیساکہ اوپر مذکور ہوا کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ تسلّی کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا جب انہیں اطمینان ہو گیا تو سوالات کئے اور جوابات پائے۔

اب ذرا سند اور رواۃ کے متعلق کچھ سُن لیجئے۔ سند کے تمام روای معتبر ہیں سوائے ایک دو کے۔ سعید بن ابی سعید جو اس روایت کو عیسیٰ بن داب اور عبداللہ بن ابی بکر الانصاری دونوں سے لیتا ہے۔ ابوبکر بن محمد الانصاری القاضی یعنی آخری راوی کا آزاد شدہ غلام ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے آقا کے لڑکے اور عیسیٰ بن داب دونوں کی روایت کو اس نے مدغم کر کے ایک مکمّل چیز بنا لی ہے۔ ابوبکر اور اس کا لڑکا عبداللہ دونوں ثقہ اور قابل اعتماد ہیں۔ ہاں عیسیٰ بن دأب حدیث میں بالکل ناقابل اعتماد ہے۔ گو ادب، تاریخ

اور ایام عرب کا بہت بڑا عالم ہے۔ کسی بات کے گھڑنے اور اس کے لئے فوراً شاہد پیش کرنے میں اسے پورا ملکہ حاصل ہے مسعودی نے اسی قسم کی ایک بہت لمبی چوڑی حکایت اس سے نقل کی ہے۔ اور تعجب کا اظہار کیا ہے ؛

رجال کی کتابوں میں عیسیٰ بن دأب کے متعلق یہ شعر درج ہے :۔

خذوا عن مالك وعن ابن عون ولا تروا احاديث بن داب[1]

یا

احاديث الّفها شوكر واخرى مروية لابن دأب

مگر اس کی وجہ سے تمام روایت کو ساقط الاعتبار کر دینا کسی طرح درست نہیں۔ دوسرا راوی قاضی عبداللہ بن ابی بکر قابل اعتبار اور ثقہ ہے۔ عیسیٰ بن داب کے آجانے کی وجہ سے ممکن ہے کہ کہیں ایک آدھ مسئلہ گھڑنٹ ہو۔ تمام کا تمام قصہ گھڑنت نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں یہ سوالات اور ان کے جوابات مختلف اسناد سے مختلف کتابوں میں مذکور ہیں۔ اس لئے ہمیں اس روایت کو قابل اعتماد تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیئے ؛

اس سلسلہ میں اندرونی شہادت جو ان مسائل کے متعلق ہمیں مل سکتی ہے کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ چنانچہ ہم اگر اشعار کو اور ان کے قائلین کو دیکھیں۔ تو ہمیں معلوم ہو گا کہ شعراء یا تو جاہلی زمانہ کے ہیں یا حضرت ابن عباس اور نافع کے ہمعصر ہیں۔ ان سے جو حضرت ابن عباسؓ کے ہم عصر ہیں بہت کم اشعار مروی ہیں۔ ان میں بھی زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کے منہ سے یہ کہلوایا جاتا ہے اما سمعت الشاعر وھو یقول مختلف دواوین کے تتبع سے میں نے بہت سے ایسے اشعار کے قائلین کے

---

[1] خطیب ۵۰۴۵ ولسان المیزان ۱۲۵ جلد ۴

نام معلوم کر لیئے ہیں اور سوائے ایک موقعہ کے جہاں اگر مطبوعہ دیوان پر بھروسہ کیا جائے تو اور کہیں بھی حرف رکھنے کی جگہ نہیں پائی ان دریافت ہونے والوں میں بیشتر جاہلی شاعر ہیں۔ جیسے اکاد اخفیھا کے متعلق استشہاد اس شعر سے کیا ہے :۔

فان تدفنوا الداء لا نخفه　　　وان تبعثوا الحرب لا نقعد

یہ شعر دیوان امرؤ القیس بروایت ابوجعفر الکوفی کے روٹوگراف میں جسے میں نے میمن صاحب کے ہاں دیکھا تھا ورق ۷ پر موجود ہے۔

بہت سے ایسے اشعار بھی ہیں جن کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ جیسے بشر[۲] بن ابی خازم کا یہ شعر جو امرؤ القیس کی طرف منسوب ہے :۔

دار لبیضاء العوارض طَفْلَةٍ　　　مهضومة الکشحین ریّا المعصم

یا زہیر بن حرام الملقب بداخل ہذلی کا یہ شعر ابو ذویب[۳] کی طرف منسوب ظاہر کیا گیا ہے :۔

کأنّ الریش والفوقین منه　　　خلال النسل خالطه مشیج

بعض ایسے اشعار بھی ہیں۔ جو بعض مشہور شعرا کی طرف منسوب ہیں مگر ان کے مطبوعہ یا مخطوطہ دیوان میں نہیں ملتے جیسے یہ شعر :۔

---

[۱] یہ شعر مشین الیّ لم یطمث قبلی + وهن اصحّ من بیض النعام فرزدق کا ہے اور ان کے تازہ مطبوعہ مصری دیوان میں ہشام بن عبد الملک کی مدح کے سلسلے میں مذکور ہے والخلل اذن ظاہر ہو سکتا ہے کہ مسئلہ دربارہ ملث گم رٹ ہو یا ہم وزن اور ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے فرزدق کی طرف غلط نسبت کی گئی ہو۔ (صاحب اساس مشین کی بجائے دُفعن ضبط کرتے ہیں۔ جو بہت اچھا ہے)۔

[۲] دیکھو جمہرۃ اشعار العرب جمہرہ لبشر + [۳] تعجب ہے کہ علامہ زمخشری اساس میں اسے ابو ذویب ہی کا شعر بتاتے ہیں۔ دیکھو اساس مادہ مشیج ،

شننّا ارضهم بالخیل حتّٰی تركناهم اذلّ من الصراط

عبید بن الابرص کی طرف منسوب ہے۔ حالانکہ ان کے مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہے
اسی طرح یہ شعر

وانی لقرم وابن قرم لهاشم لاباء صدق مجدهم معقل صلد

ابو طالب کی طرف منسوب ہے۔ حالانکہ ان کے مخطوطہ دیوان کے روٹوگراف میں
جسے میں نے میمن صاحب کے ہاں دیکھا تھا موجود نہیں۔ یا

ضازتْ بنو اسد بحکمهم اذ یعدلون الراس بالذنبِ

امرؤ القیس کی طرف منسوب ہے۔ حالانکہ اس کے دیوان میں نہیں مل سکا۔
چونکہ ہمارے پاس جاہلی شعراء کا پورا کلام نہیں پہنچا۔ اس لئے ہو سکتا ہے
کہ ان کی نسبت صحیح ہو۔ یا گھڑنت ہو۔ یقینی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ ہاں
ایک بات کا اقرار ضرور کرنا پڑتا ہے۔ کہ نسبت جن شعراء کی طرف دی گئی ہے۔ اگر
ان کے دیوان میں یہ شعر رکھ دیئے جائیں تو کوئی تمیز نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی جزم
سے کہہ سکتا ہے کہ یہ شعر ان کے نہیں ہیں ؛

اس وجہ سے کہ یہ رسالہ بہت سے علمی، ادبی نکتے بیان کرتا ہے۔ اس کی
حیثیت امام سیوطی کے اس باب سے جسے آپ نے اتقان میں درج فرمایا ہے
بہت بلند ہو جاتی ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ اس میں وضاحت زیادہ ہے
اور اگر ان چھ[1] مسائل کو چھوڑ دیا جائے جو امام سیوطی نے اپنی کتاب میں اس رسالے

---

[1] ممکن ہے کہ یہ مسائل امام سیوطی نے طبرانی یا ابن الانباری سے لئے ہوں مگر زیادہ قرین قیاس جو بات ہے وہ یہ ہے کہ
اس رسالے کے اصل کاتب سے یا نساخ سے رہ گئے ہیں اس لئے کہ ایسے موقع پر جو استشہاد پیش کیا جاتا ہے وہ
اصل مسئلے کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا اور حیرانی ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے یہ شعر کیسے استشہاد میں
پیش کیا یا نافع نے کیسے مان لیا۔ اس کی مثالیں رسالہ دیکھنے سے مل جائیں گی ؛

زیادہ درج کئے ہیں۔ جب بھی اس کے مسائل بہت زیادہ ہیں یعنی قریباً ۲۳۵ یا ۲۴۴ کے لگ بھگ۔ اس سلسلہ میں اشعار قریباً پونے تین سو مذکور ہیں +

سوائے ایک جگہ کے باقی تمام مسائل قرآن مجید کی آیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ جگہ یہ ہے :-

قال یا ابن عباس اخبرنی عن قول عمرؓ بن الخطاب کذب علیکم الحجّ قال یعنی بقوله علیکم بالحجّ قال وهل تعرف العرب ذالك قال نعم اما سمعت الهذلی [والاصل انه لمعقّر بن الحمار البهارقی انظر لسان ۲×۳۰۵] وهو يقول

وذبیانیةٍ اوصت بنیها بان کذب القراطفُ القروفُ

نافع کی اس سے تسلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے زِدْنی یا ابن عباس چنانچہ وہ فرماتے ہیں قال وقال رجل آخر من هذیل [والاصل انه اما لعنترة لسان ۲×۲۰۴ او لحزز بن لوذان الاغانی ۹×۸۸ وقال الاصفهانی والحق انه لحرز بن لوذان]

کذب العتیقُ وماءُ شنٍّ باردٍ ان کنت سائلة غبوقا فاذهبی

یہ مسئلہ اتقان میں محذوف ہے۔ اوپر کی مثال سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا۔ کہ وضاحت کے لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ دوسرا شعر فوراً پیش کر دیتے ہیں۔

یہی حالت اس صورت میں ہوتی ہے۔ جب ایک لفظ کے دو معنے ہوتے ہیں۔ بنان کے معنے اطراف الاصابع اور الحسب کله بلغةِ هذیل[۲] آپ نے بیان کئے ہیں۔ پہلی صورت کے لئے یہ شعر آپ نے پیش کیا ہے

فنعم فوارس الهیجاءِ قومی اذا علق الاعنة بالبنان

دوسرے معنے کے لئے یہ شعر آپ نے پیش کیا ہے۔

---

[۱] انظر سمط ص۳۸۲ ، [۲] اتقان میں یہ حصہ محذوف ہے ،

لدی اسد مثاکی البنان مقاذف — لہٗ لبد اظفارہ لم تُقلّم

شان نزول کی جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ وہ شان نزول اور گرد وپیش کے حالات بھی بیان کرتے ہیں۔ مکاء وتصدیۃ کے معنوں میں کہا ہے

قال المکاء صوت القنبرۃ والتصدیۃ صوت العصافیر وھو التصفیق وذالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا قام الی الصلوٰۃ وھو بمکہ وکان یصلی قائماً بین الحجر والرکن الیمانی فیجیئ رجلان من بنی سھم یقوم احدھما عن یمینہ والاٰخر من یسارہ فیصیح احدھما کما تصیح المکاء والاٰخر یصفق بیدیہ کتصدیۃ العصافیر لیفسدا علیہ صلوٰتہ قال وھل تعرف العرب ذالک قال نعم اما سمعت حسان بن ثابت وھو یقول

نقوم الی الصلوٰۃ اذا دعینا — وھمکم التصدی والمکاء

وقال اٰخر من الشعراء (التصدیۃ)

حتی تنبھنا سحیراً — قبل تصدیۃ العصافیر

آپ میں سے اکثر حضرات نے حضرت حسان کے یہ شعر ان کے دیوان (طبع یورپ) میں دیکھے ہوں گے۔ جو امیہ بن ابی الصلت کی ہجو میں کہے گئے ہیں۔

اتانی عن امیۃ زور قول — وما ھو بالمغیب بذی حفاظ

سانشر ان بقیت لکم کلاماً — ینشر فی المجامع من عکاظ

. . . .

اشعار بالا کو پڑھ کر یہ گمان ضرور گزرا ہوگا کہ اسی قافیہ میں امیہ نے حضرت حسان کی ضرور ہجو کی ہوگی۔ مگر دیوان امیہ طبع یورپ میں اتقان اور درمنثور کے حوالے سے صرف یہ شعر ملے گا ع یمانیاً یظل یشب کبراً — وینفخ دائباً لھب الشواظ[1]

---

[1] اتقان میں پہلا مصرع یوں ہے یظل یشب کیرا بعد کیر

آیئے ہم آپ کو اس رسالہ سے مفصل سناتے ہیں۔ شواظ کے معنوں میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ الشواظ اللھب الذی لا دخان لہ قال وھل تعرف العرب ذالک قال نعم اما سمعت امیۃ بن ابی الصلت وھو یھجو حسان بن ثابت وھو یقول

الا من مبلغ حسان عنی — مغلغلۃ تدبّ الی عکاظ

الیس ابوک فینا کان قینًا — لدی الغایات فسلا فی الحفاظ

یمانیا یظل یشب کیرًا — وینفخ دائبًا لھب الشواظ

فاجابہ حسان بن ثابت

اتانی عن امیتنا کلام — وما ھو بالمغیب بذی حفاظ

ستاتیہ قصائد محکماتٌ — وتنشد بالمجاز الی عکاظ

ھمزتک فاختضعت بذل لفظ — بقافیہ تأجّج کالشواظ

غرض یہ مشتے نمونہ از خروارے آپ کے سامنے پیش ہے۔ امید ہے کہ آپ استحسان کی نظر سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین

عبدالخالق (ایم۔ اے)
لکچرار عربک کالج دہلی

شمالی ہند میں طباعت کے ابتدائی دور کے حالات

[۱۸۴۷ء کے آخر میں گورنمنٹ آف انڈیا نے ڈاکٹر اے سپرنگر کو شاہان اودھ کے عظیم الشان کتابخانوں کی فہرست مرتب کرنے کیلئے مقرر کیا، موصوف نے یہ فہرست مارچ ۱۸۴۸ء اور جنوری ۱۸۵۰ء کے درمیان کئی جلدوں میں مرتب کی، مگر ان میں سے صرف ایک جلد ۱۸۵۴ء میں طبع ہوئی، مؤلف نے اس جلد میں ۶ صفحہ کا مختصر سا دیباچہ لکھا ہے اور اس میں ایک مقام پر اس زمانہ کی طباعت کا کچھ حال دیا ہے سطور ذیل اس حصہ کے ترجمہ پر مشتمل ہیں]

. . . . اسی ضمن میں قارئین کو شاید لکھنؤ کے چھاپہ خانوں کے متعلق بھی کچھ اطلاع حاصل کرنا مرغوب خاطر ہو گو میرے مضمون کے ساتھ اس موضوع کا تعلق قریبی نہیں ہے ۔

غازی الدین حیدر نے ایک چھاپہ خانہ بنوایا - اس چھاپہ خانہ کی مطبوعہ کتاب ہفت قلزم نے یورپ میں بہت شہرت حاصل کی ہے، گو ہندوستان میں اس کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ۔ لغت کی اس کتاب کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں سربی حرفوں میں لکھنؤ میں چھپی ہیں :- المناقب الحیدریہ، مصنفہ احمد شروانی، یہ کتاب غازی حیدر کی تعریف میں بزبان عربی تصنیف ہوئی، سن طباعت ۱۲۳۵ھ تقطیع کامل صغیر (Small folio) صفحات ۲۰۴۔ محامد حیدری، اسی موضوع پر اختر[1] نے فارسی نظم و نثر میں لکھی، سال طباعت ۱۲۳۵ھ تقطیع کامل صغیر صفحات ۲۸۸، گلدستۂ محبت، لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال فارسی نظم و نثر میں سال طباعت ۱۲۳۹ھ تقطیع وزیری (Octavo) صفحات ۱۳۱، پنجسورہ (شریف) بھی بخط طغرا چھاپا گیا، تاج اللغات، عربی کی لغت جس میں الفاظ کے معنی فارسی میں بیان ہوئے ہیں، سات جلدوں میں چھپی ہے تقطیع کامل کلاں (Large folio) ۴ جلدیں سربی حرفوں اور باقی تین پتھر سے چھپی ہیں - ج ۱ : ۵۱۴ صفحات، ج ۲ : ۶۲۴ صفحات، ج ۳ : ۵۳۴ صفحات، ج ۴ : ۶۷۱ صفحات، ج ۵ : ۵۹۴ صفحات ج ۶ : ۸۰۴ صفحات، ج ۷ : ۱۳۸ صفحات، مسٹر آرچر نے کانپور میں لیتھو کا (سنگی) چھاپہ خانہ قایم کیا تھا ۱۸۳۰ء کے قریب یہ صاحب نصیر الدین حیدر شاہ کی ایما سے اپنا چھاپہ خانہ ہمراہ لے کر نواب موصوف کی نوکری میں گئے پہلی کتاب جو لکھنؤ میں پتھر پر چھاپی گئی وہ بهجة مرضیہ ہے جو علامہ سیوطی کی تصنیف اور الفیہ کی شرح ہے، سال طباعت ۱۲۴۷، تقطیع وزیری، صفحات ۲۴۴، جب میں لکھنؤ میں تھا تو وہاں پتھر کے غیر سرکاری چھاپے خانے بارہ تھے، ان میں سے حاجی محمد حسین اور مصطفے خاں کے چھاپے خانے دوسروں کی نسبت بدرجہا بہتر ہیں - حاجی محمد حسین نے بعض کتابیں چھاپی ہیں

---

[1] قاضی محمد صادق اختر ہگلوی سے مراد ہے، انہوں نے صبح صادق اپنے سوانح حیات پر لکھی اور مثنوی سراپا سوز اور ایک تذکرہ فارسی شعرا کا اور انشاء ہفت اختر

جو بہت صحیح چھپی ہیں۔ ۱۸۳۹ء میں کمال الدین حیدر منشی رصدگاہ نے اودھ کے شاہی خاندان کی تاریخ لکھی تاکہ اسے دربار میں مقبولیت حاصل ہو جائے۔ مگر سوءِ اتفاق سے اس کتاب میں دو موقعوں پر ایسی عبارتیں آ گئیں جو بادشاہ کی طبیعت پر گراں گزریں، غصے میں آ کر بادشاہ نے فوراً رصدگاہ کو بند اور لکھنؤ میں طباعت کو ممنوع قرار دیا تاکہ یہ قابلِ اعتراض کتاب کہیں چھپ نہ جائے، ہیر مشورے سے مطبع مسیحائی کا مالک کانپور چلا گیا اور اس کے بعد باقی اہلِ مطابع بھی وہیں جا پہنچے، بعض نے جن میں کہ مصطفےٰ خاں بھی شامل تھا کانپور کے علاوہ لکھنؤ میں بھی مطبع قایم رکھا۔ ان چھاپے خانے والوں کا دستور یہ تھا کہ عموماً وہ صرف کتب کے سرورق پر چھاپے خانے کا نام لکھتے، مگر شہر کا نام نہ دیتے، اسلئے اگر کوئی کتاب اخراجِ مطابع کے بعد چھپی ہو تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتاب لکھنؤ میں چھپی یا کانپور میں، لکھنؤ اور کانپور میں قریب قریب سات سو کتابیں چھپی ہونگی اور ان میں سے بعض کتابیں تو دس دس بار چھپ چکی ہیں، ان میں سے زیادہ مانگ یا تو درسی کتابوں کی ہے یا مذہبی اور کلامی کتابوں کی جن کو مولوی صاحبان عموماً زیرِ مطالعہ رکھتے ہیں یا زیرِ مطالعہ رکھنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، اس امر کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں کہ علم کا دائرہ وسیع ہونے لگا ہے اس سے زیادہ اہم یہ کہ طباعت کے ذریعے تعلیم سب طبقوں تک پہنچنے لگی ہے، یہاں تک کہ عورتوں کے حلقہ میں بھی پہنچ گئی ہے آج سے بیس برس پہلے لوگ قرآن مجید کی آیات کو نمازوں میں پڑھتے اور تعویذوں میں لکھتے تھے اور سارا قرآن مجید حفظ بھی کرتے تھے مگر بہت کم اس کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے اور سنّت سے بے خبری تو عام تھی مگر اب آہستہ آہستہ فہمِ مطالب قرآنی کا ذوق پیدا ہو چلا ہے اور جو تفسیریں عربی، فارسی اور ہندوستانی میں حال میں چھپی ہیں ان کا ذکر مجھے آیندہ صفحوں میں کرنا ہوگا اگر حدیث یا سنّہ کے مطالعہ میں قرآن مجید کے مطالعہ سے کہیں زیادہ ترقی ہوئی ہے صرف یہی نہیں کہ مشہور کتابوں کے متن چھپ گئے ہیں بلکہ مشکوٰۃ اور مشارق الانوار کا ترجمہ فارسی اور ہندوستانی میں بھی چھپ چکا ہے اور ایک سے زیادہ بار چھپ چکا ہے، صدیوں سے مسلمان اپنے مذہب کی اصلی حقیقت سے بیگانہ ہو چکے تھے مگر اب وہ اس کوشش میں ہیں کہ انکی مذہبی کتابیں ہر شخص کی سمجھ میں آ جائیں نتیجہ اس کا وہی ہوگا جو بائیبل کے ترجمے و مطالعہ کا یورپ میں ہوا، فنِ طباعت کی ترقی کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا ہے کہ موقت الشیوع مطبوعات اور تفریحی کتابوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے،

ایشیا میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں چھاپے خانے پر کسی قسم کی کوئی پابندیاں عائد نہیں ہوئیں، چنانچہ بالائی صوبوں میں قریباً ہر شہر میں کئی کئی اخبار چھپتے ہیں حال ہی میں کئی مذہبی رسالے اور کہانیوں کی کتابیں۔ جو بالخصوص عورتوں کے لئے تصنیف کی گئیں چھپی ہیں اور اب خوب فروخت ہو رہی ہیں، اس میں شک نہیں کہ نیا ادب جو پیدا ہو رہا ہے فی نفسہٖ چنداں اہمیت نہیں رکھتا مگر اس ادب کی ترقی کی رفتار ویسی ہی تیز اور اس کا مواد اتنا ہی کم ضرر ہے جتنا وہ یورپ میں فنِ طباعت کی ابتدائی زمانے میں تھا، یہ مواد عام میلان کے اعتبار سے مشرقی اور اسلامی ہے۔ لیکن اس میں ابھی سے حریتِ فکر کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں جو درسی فضیلت اور محدود درباری تہذیب کے وسعت پانے اور ترقی کرنے کے بعد عام تہذیب کی صورت اختیار کر لینے کا قدرتی نتیجہ ہیں،

(مترجمہ احمد ربانی متعلم ایم اے کلاس)

گوہر نامہ

خواجوی کرمانی

شاعرِ شہیرِ ایران

تاج محمد خان ایم اے

پروفیسر گورنمنٹ کالج رہتک

دیباچہ

خواجوی کرمانی علیہ الرحمۃ کے خمسہ کی پانچویں مثنوی کا نام گوہر نامہ یا گہر نامہ ہے۔ خود انہوں نے یہ نام دو طرح سے دیا ہے۔ مثلاً ؎

چو کردم گوہر افشان نوکِ خامہ　　گہر نامہ نہادم نامِ نامہ

اور پھر ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

اگر چون مشتری صاحب قرانی　　بدانی ہمچو خورشید این معانی
کہ گوہر نامۂ را گر بہائیست　　بہایش دُرِّ درجِ کبریائیست

یہ مثنوی اپنے مضمون کی حیثیت سے نرالی ہے۔ امیر مبارز الدین بانی خاندانِ مظفری کے ایک وزیر بہاء الدین محمود کے ایماء پر یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ یہ وزیر چھٹی پشت میں نظام الملک طوسی کے پوتے ہیں۔ سلسلۂ نسب اس طرح پر ہے، بہاء الدین محمود بن عز الدین یوسف بن زکی الدین محمود بن فخر الدین احمد بن قوام الملک نور الدین مسعود بن حمید الملک محمود بن نظام الملک طوسی۔

دستور بہاء الدین محمود کے حالات مجھے دستیاب نہیں ہو سکے، نہ ہی ان کے نام کا پتہ کسی تاریخ سے چلا ہے۔ اسی کتاب سے ہی روشناس ہو رہے ہیں۔ شروع کتاب میں حمد و نعت کے بعد امیر مبارز الدین کی مدح اور ایک تازہ فتح کی تہنیت ہے۔ فی الحال معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کونسی فتح تھی جس کا ذکر خواجو اس کتاب میں کرتے ہوئے اس واقعہ کو اپنی کتاب کے لئے ایک فالِ نیک شمار کرتے ہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے

کہ قاضی شمس الدین صائن جن کا ذکر خواجو کے سوانح حیات میں کر چکا ہوں
اسی سال یعنی ۷۴۶ ہجری میں شکست کھا کر قتل ہوتے ہیں ؎

کتاب کیا ہے۔ گویا خواجہ نظام الملک طوسی اور ان کے احفاد کے مدائح ہیں۔ افسوس ہے کہ اس خاندان کے متعلق کسی گرانقدر تاریخی مواد کا اضافہ اس سے نہیں ہُوا۔ البتہ ناموں کے ساتھ مقاماتِ وفات ضرور بتا دیئے گئے ہیں۔ اس کا سنہ تصنیف ۷۴۶ ہجری ہے چنانچہ مصنف خود فرماتے ہیں ؎

شبِ آدینہ بود و روز بر چیں　　سعودِ آسمان ناظر زتسدیس
مہ تیر و زمہر یک نیم رفتہ　　زہجرت ذال و واو و میم رفتہ

اسلوب بیان اس طرح پر ہے کہ ایک پیرِ دانش افروز سے باری باری ہر ایک کے حالات پوچھتے ہیں۔

چنانچہ اوّل اوّل نظام الملک طوسی کے اوصاف گنوائے جاتے ہیں۔ پھر بتایا ہے کہ وہ اصفہان میں سپردِ خاک ہوئے، طوسی کے متعلق جو کچھ پیر دانش افروز سے سنتے ہیں اس کی تصدیق کیوان کی بلند بانگ گواہی سے کی جاتی ہے۔ بعد میں ایک غزل کی فرمائش مطرب سے کرتے ہیں۔ اس کی تعمیل ہوتی ہے۔ پھر پیر دانش افروز کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

دگر دستو ایست ہست از سلاطین　　بگو احوالِ دستورانِ پیشین

چنانچہ پہلے کی طرح اب حمید الملک محمود کی تعریف میں چند شعر اسی مردِ پیر کی زبانی سپردِ قلم ہوتے ہیں۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ نظام الملک طوسی کے بارہ فرزند تھے۔ اور سارے کے سارے ان کی زندگی ہی میں سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ مجھے ان حمید الملک محمود کا

حال کسی کتاب میں نہیں ملا۔ خواجو کہہ رہے ہیں کہ اپنے عالی قدر والد کی طرح سخن پرور اور رعایا نواز حاکم تھے۔ تبریز میں فوت ہوئے اور وہاں کے مشہور گورستان جرنداب نامی میں دفن ہوئے۔ ان امور کی تصدیق ہر جنبیں کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور آخر میں ایک غزل سنائی جاتی ہے۔

قوام الملک نور الدین مسعود کے حالات کی پرسش پر بتایا جاتا ہے کہ وہ قزل ارسلان کے وزیر تھے۔ یعنی قزل ارسلان بن ایلدگز کہ اتابکان آذربائیجان میں سے ہیں اور جن کا جلوس تخت پر ۱۱۸۵ء میں ہوتا ہے۔ اور ۱۱۹۱ء میں فوت ہوئے ہیں۔ نظامی نے اپنی مثنوی خسرو شیریں کی پیشکش ان کو اور ان کے بھائی محمد کو کی تھی۔ اور قزل ارسلان سے حمدونیاں کا گاؤں ملا تھا قزل ارسلان ظہیر فاریابی کے مربی اور ممدوح ہونے کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہیں۔ ظہیر کا شعر ہے ؎

نُہ پایۂ فلک نہد اندیشہ زیر پای تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

اس دستور گرامی کی وفات بھی شہر تبریز میں ہوئی اور جرنداب میں مدفون ہوئے چنانچہ فرمایا ہے ؎

زجام دَور چون آمد گران خواب شد آسایشگہِ او ہم جرنداب

ان واقعات پر بہرام کی گواہی سے مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔

فخر الدین احمد کے ذکر میں اتنا بتایا ہے کہ ان کی زندگی اکثر آذربایجان ہی میں گزری۔ انہوں نے بھی معارف پروری اور دادگستری میں اپنی عالی نسبی کا ثبوت دیا۔ اور سیواس میں مدفون ہوئے سیواس شہر کے نام کا ماخذ یونانی لفظ (Sebastia) ہے، قزل ارماق (R. Halys) کے کنارے واقع تھا سلطان علاء الدین نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ اور اس میں نئی سنگین

عمارتیں بنوائی تھیں۔ جو تراشیدہ اور صاف کئے ہوئے پتھر کی تھیں۔ مستوفی کا قول ہے کہ یہ مقام اُونی کپڑوں کے لئے مشہور تھا، جو کثرت سے باہر بھیجے جاتے تھے۔ یہاں کی آب و ہوا سرد تھی اور غلہ بھی بکثرت پیدا ہوتا تھا۔ ابن بطوطہ رقمطراز ہے کہ سیواس اِس صوبے کا جس میں میسوپوٹیمیا کا سلطان حکومت کرتا تھا سب سے بڑا شہر تھا۔ یہاں ایک دارالامارہ بھی تھا۔ سڑکیں اور بازار عُمدہ تھے۔ ایک کالج بھی تھا۔ دستور فخر الدین احمد کے حالات کی تصدیق خورشید کے بیان سے ہوتی ہے ؛

اس کے بعد دستور زکی الدین محمود کے متعلق بتایا ہے۔ کہ وہ ایران سے توران چلے گئے تھے۔ اور کسی ترک بادشاہ کے وزیر بنے ، ؎

کنارِ تختِ خاقان جای اوشد شہِ ترکان مطیع رای اوشد

اور یہ کہا ہے۔ کہ خاقان وقت انہیں اتا محمود کہتے تھے۔ بعد میں ترکستانی علاقہ چھوڑ کر آذربایجان چلے آئے۔ اور باقی عمر وہاں ہی گزار دی۔ دہخوارقان میں دفن ہوئے۔ اس بیان پر ناہید کی طرف سے صاد کیا جاتا ہے ؛

دستور عز الدین یوسف کے واقعات مختصر طور پر بتا کر خاک روم میں انکی وفات بتائی ہے۔ اور اس کی تصدیق منشی فلک (تیر) کرتے ہیں۔ آخر میں دستور بہاء الدین محمود اپنے ہم عصر اور مربّی وزیر کی مدح کی ہے اور اوصاف شمار کئے ہیں۔ جن کی تصدیق ماہ کی طرف سے ہوتی ہے' اور دعا کے طور پر انجام میں کہا ہے ؎

فلک چون سیرتِ محمود دادش خدایا عاقبت محمود بادش

اس کے بعد سلطان ملک شاہ سلجوقی کے اُس فرمان کا ذکر کیا ہے۔ جس کی رو سے نظام الملک طوسی کو اپنے ممالک محروسہ کا صدر کل مقرّر کیا ہے۔ اور

رعایا کی فلاح و بہبود کا ذمہ وار ٹھہرایا ہے۔ اور ساتھ ہی ایک مکتوب گرامی کا ذکر ہے۔ جو ملک شاہ نے اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر اپنے عالی مرتبہ وزیر کے ہاں بھیجا ہے۔ مضمون اس خط کا بھی وہی ہے۔ اور یہ کہ قیامت میں اگر باز پرس ہوئی۔ تو نظام الملک طوسی سے ہی ہوگی۔ کہ سلطنت کا تمام انتظام اُن کے سپرد ہے۔ اس کے بعد اس مشہورِ عالم وزیر کی معارف پروری اور علماء نوازی کے واقعات لکھے ہیں۔ مثلاً عید کے روز امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اُن کے ہاں آئے۔ تو اُن کی خدمت میں ہشتاد تومان زر کی گرانقدر رقم پیش کی۔ اُن کے ہمراہیوں اور شاگردوں کو بھی انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ ایک واقعہ عجیب ضرور ہے۔ وہ یہ کہ ایک دن دورانِ گفتگو میں کسی نے فرعون کا ذکر کیا۔ تو نظام الملک طوسی آگ بگولا ہو گئے۔ اور کہا کہ اگر اس ملعون کو مصر کے ملک اور دریائے نیل کی سرسبز وادیوں پر ناز تھا اور اس پر اس نے خدائی دعوے کر رکھا تھا۔ تو میں اس طاغی کے خلاف یہ ملک ایک معمولی سگبان کو دے دیتا ہوں۔ چنانچہ ایک سگبان کو ملکِ مصر کا حاکم بنا دیا گیا۔ خواجو نے بظاہر گلستان کے واقعہ کے متعلق ہارون رشید پر تصرف کیا ہے۔ ورنہ ملک مصر پر تو سلجوقی قابض نہ تھے،

کتاب کے اختتام میں اعداد ابیات کی تعیین اس طرح کی ہے۔

حسابی از نظام الملک برساز

وزان مجموع لام و نون بینداز

یعنی ۱۰۲۲ شعر ہیں۔ اس متن کے کل شعر ۱۰۲۷ ہیں۔ ایک قلمی نسخہ گوہر نامہ کا آقای عبدالرحیم خلخالی کے پاس ہے۔ جس کے اشعار کی تعداد بتصریحِ سعید نفیسی ۱۰۰۸ ہے۔ نسخۂ ب ناقص الآخر ہے۔ اور نسخۂ ل ناقص الاول

ہونے کے علاوہ درمیان میں بیسیوں شعر نہیں رکھتا۔ جس سے کلام میں انتہائی بے ربطی پیدا ہوجاتی ہے۔ بنابریں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ گوہر نامہ کا یہ متن ہر لحاظ سے صحیح اور جامع ہے ؛

اس مثنوی کا یہ متن دو قلمی نسخوں پر مبنی ہے اور جن کو حاشیہ میں بؔ اور اؔ سے تعبیر کیا گیا ہے ؛

بؔ۔ سے مراد برٹش میوزیم کے قلمی نسخے نمبر ۸ ۵ ۷۷ ؁ کا عکس ہے۔ یہ اصل میں خمسۂ خواجو کا یکجا قدیم مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں ورق نمبر ۱۴۳ ا سے لے کر ۱۵۵ ا تک گوہر نامہ کا متن ہے۔ سنہ تحریر ۹۳۴ ہجری ہے۔ کاتب علی بن حسین بن عمادالدین حسینی ہیں۔ جہاں تک معلوم ہے۔ گوہر نامہ کا یہ نسخہ قدیم ترین ہے۔ اس کا متن ا سے زیادہ صحیح اور قابلِ اعتماد ہے۔ خط نستعلیق ہے مگر باریک ہے اور صاف نہیں۔ پہلا صفحہ خراب ہوچکا ہے۔ داغ پڑ گئے ہیں۔ کئی شعر نہیں پڑھے جاتے۔ البتہ اشعار کی تعداد کا شمار ہوسکتا ہے۔ خاتمہ کے دو صفحے بھی مفقود ہیں۔ عنوان عام طور پر غلط ہیں ؛

اؔ۔ سے مراد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا نسخہ پنج مثنویات خواجو نمبر ۵۷۶ ہے۔ یہ خمسۂ خواجو کا ناقص المتن نسخہ ہے۔ اس کا سنہ تحریر ۹۹۰ھ ہجری ہے۔ خط نہایت خوبصورت نستعلیق ہے۔ عنوان سُرخ قایم کئے ہیں۔ جداول کا بھی اہتمام ہے۔ کاتب اس کے برہان الدین بن بھائی جیو مخدوم ہیں۔ کمال نامہ کا متن بھی میں نے اسی نسخہ کی مدد سے تیار کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ اس مجموعہ میں گوہر نامہ کا پہلا صفحہ موجود نہیں۔ صفحہ ۲۶۵ سے صفحہ ۲۸۷ تک گوہر نامہ کا متن ہے۔ درمیان میں بھی

تین مختلف جگھوں سے کافی مقدار میں شعر رہ گئے ہیں۔ جس سے ربط کلام
کا قائم نہ رہتا تھا۔ یہ مقامات نسخۂ ب کی مدد سے درست کر لئے گئے ہیں
یہ نسخہ نہایت کارآمد ہوتا۔ مگر سوائے کمال نامہ کے کسی مثنوی کا متن اس
میں مکمل موجود نہیں +

خواجو علیہ الرحمۃ کا گوہر نامہ اب ہدیۂ قارئین ہے۔ دست بدعا ہوں
کہ خداوند کریم مجھے طاقت عطا فرمائیں۔ کہ اُن کے باقی غیر مطبوعہ آثار بھی
ایڈٹ کر سکوں۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ،

تاج محمد خان، ایم۔ اے
پروفیسر گورنمنٹ کالج۔ رہتک

بسم الله الرحمن الرحیم

(۱۴۳ ا)

بنام نام بخش نام داران — گدای درگه او شهریاران
برافروزندهٔ ایوان زرکار — که خارا زخاره آرد خیری از خار
نهد در کاخ بینا تخت جمشید — نهد بر فرق گردون تاج خورشید
بربندد روز روشن چشم انجم — کند روشن بمردم چشم مردم
[۱] . . . . ثواقب — مالک بخش سلطان کواکب
عروسان سپهری رانتق بند — خداوندان عالم را خداوند
بر نی داده شکر از جان شیرین — بریحان داده چین جعد مشکین
کند[۲] سیاره را در قصر شش در — شود[۳] فرمان[۴] روا بر هفت کشور
از و بر دست گردون [۵] . . . — وزو در دامن خاک اشک جیحون
جهانداری که ملکش بی زوال است — جلال و کبریایش لایزال است
خداوندی که نامش حرز جانست — خرد را نام او ورد زبانست
جهان مستغرق دریای جودش — دو عالم صورت و معنی وجودش
همه مخلوق او از مور تا مار — همه مصنوع او از نور تا نار
مطیع امرش از مه تا بماهی — رهین فضلش از شه تا سپاهی
[۶] . . . . . . — نه او را جای جفت و یار و پیوند

---

[۱] این شعر با سی و یک اشعار لاحقه در نسخهٔ آ موجود نیست. زیرا که بدبختانه صحیفهٔ اول از آن نسخه افتاده است؛ و نیز در نسخهٔ ب بطوری محو شده که بدقت تمام خوانده قلمبند کرده شد، چیزی که بکلی ناخواندنی بود بجای آن نقطه ها گذاشته شد، [۲] در نسخهٔ ب چنان محو شده که خواندنی نیست ، [۳] اصل، شده ، [۴] اصل - کند، [۵] اصل - فرمان دادن،

(باقی دارد) — تاج محمد خیال

(۲) فهرس الامکنة

(۳) فہرس الکتب

التی ورد ذکرها فی الکتاب لکاف من مجمع الآداب

(۴) فہرس المصادر

التی انتفعت بہا وذکرتہا فی تعلیقات الکتاب

کتب الطبقات

۱ الاستیعاب لابن عبد البر (طبع حیدرآباد)

۲ اسد الغابۃ لابن اثیر (طبع مصر)

۳ الاصابۃ لابن حجر (طبع کلکتہ)

۴ الانساب للسمعانی (طبع اوربا)

۵ البدر الطالع للشوکانی (طبع مصر)

۶ بغیۃ الوعاۃ للسیوطی (طبع مصر)

۷ تتمہ صوان الحکمۃ للبیہقی (طبع کلیۃ فنجاب)

۸ تنقیح المقال للمامقانی (طبع ایران)

۹ تہذیب التہذیب لابن حجر (طبع حیدرآباد)

۱۰ الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیۃ لعبد القادر القرشی (طبع حیدرآباد)

۱۱ الدرر الکامنة لابن حجر
(طبع حیدر آباد)

۱۲ روضات الجنات للخوانساری
(طبع ایران)

۱۳ شذرات الذهب فی اخبار من ذهب لابن العماد الحنبلی
(طبع مصر)

۱۴ الطالع السعید لمن باعلی الصعید للادفوی (طبع مصر)

۱۵ الطبقات لابن سعد
(طبع اورپا)

۱۶ طبقات الشافعیة للسبکی
(طبع مصر)

۱۷ غایة النهایة فی طبقات القراء للجزری (طبع استنبول)

۱۸ فوات الوفیات لابن الشاکر الکتبی
(طبع مصر)

۱۹ الفوائد البهیة فی طبقات الحنفیة لمولانا عبد الحی اللکنوی
(طبع مصر)

۲۰ مجمع الآداب (مخطوطة الکتاب نفسه)

۲۱ المعارف لابن قتیبة
(طبع مصر)

۲۲ معجم الادباء لیاقوت الحموی
(طبع مصر) (۲۰ جزءاً)

۲۳ وفیات الاعیان لابن خلکان
(طبع المیمنیة مصر)

کتب التاریخ

۲۴ الاشارة الی من نال الوزارة لابن الصیرفی

۲۵ تاریخ الامم والملوک للطبری

۲۶ تاریخ بغداد للخطیب

۲۷ تاریخ بیهق للبیهقی

۲۸ تاریخ الخلفاء للسیوطی
(طبع لاهور)

۲۹ تاریخ دولة آل سلجوق (زبدة النـ
(طبع مصر)

۳۰ تاریخ العراق (الجزء الاول) للعباس العزاوی

۳۱ تاریخ ابی الفداء

۳۲ تذکرة الحفاظ للذهبی (الطبعة الاولی بحیدر آباد)

۳۳	تہذیب تاریخ ابن عساکر لعبد القادر افندی
۳۴	الحوادث الجامعة المنسوب الی ابن الفوطی (طبع بغداد)
۳۵	دول الاسلام لرزق اللہ منقریوس الصدفی
۳۶	ذیل تاریخ دمشق للعمید بن حمزة القلانسی
۳۷	السلوک لمعرفة دول الملوک للمقریزی
۳۸	الفخری فی الآداب السلطانیہ لابن الطقطقی (طبع اوربا)
۳۹	الکامل لابن الاثیر الجزری (طبع الازہریة (۱۳۰۱ھ))
۴۰	نفح الطیب للمقری (طبع اوربا)

کتب الادب واللغة والانساب

۴۱	(کتاب) الاشتقاق لابن درید (طبع غوتنجن)
۴۲	الاغانی لابی الفرج الاصفہانی (طبع مصر (۱۲۸۵ھ)
۴۳	البستان للبستانی
۴۴	تاج العروس شرح القاموس للسید مرتضی الزبیدی
۴۵	تاریخ الآداب العربیہ لجرجی زیدان
۴۶	دائرة المعارف للبستانی
۴۷	دمیة القصر للباخرزی
۴۸	دیوان کثیر
۴۹	صبح الاعشی للقلقشندی
۵۰	العقد الفرید لابن عبد ربہ (طبع الازہریہ، ۱۳۲۱ھ)
۵۱	عمدة المطالب فی انساب آل ابی طالب (طبع بومبای)
۵۲	لزوم ما لا یلزم لابی العلاء المعری
۵۳	النہایہ لابن الاثیر الجزری
۵۴	نہایة الارب للنویری
۵۵	یتیمة الدہر للثعالبی (طبع دمشق)

کتب التفسیر والحدیث

۵۶	تفسیر ابن عباس (طبع لاہور)

۵۷ لباب التاویل للخازن

۵۸ مشکوٰة المصابیح (طبع لاہور)

کتب الجغرافیا وما یلحق بہا

۵۹ عمران بغداد للصادق الحسینی

۶۰ لب اللباب للسیوطی (طبع اوربا)

۶۱ مراصد الاطلاع (طبع ایران)

۶۲ معجم البلدان لیاقوت الحموی (طبع اوربا)

المتفرقات

۶۳ التوراة

۶۴ قاموس الکتاب المقدس

۶۵ کشف الظنون (طبع استنبول)

۶۶ معجم المطبوعات العربیة و المعربہ لسرکیس

۶۷ فہرست المخطوطات العربیة ببرلین

۶۸ فہرست دوزی (Catalogus) Codicum Orientalium, Lugduno Batavae. by R. P. A Dozy.

الکتب الفارسیة

۶۹ تاریخ گزیدہ لحمد اللہ المستوفی (طبع اوربا)

۷۰ تاریخ مفصل ایران للاستاد عباس اقبال

۷۱ تذکرۂ دولت شاہ السمرقندی (طبع اوربا)

۷۲ راحة الصدور للراوندی

۷۳ روضة الصفا لخواند امیر

۷۴ نزہة القلوب لحمد اللہ المستوفی

۷۵ ہفت اقلیم

الکتب الاردویہ

۷۶ جغرافیۂ بلاد فلسطین وشام

٧٧ جغرافیۂ خلافت مشرقی

٧٨ اورینٹل کالج میگزین

کتب اللغات الاوربیه

٧٩ تاریخ الأداب العربیة لهامیر
Literaturgeschichte der Araber. von Hammer-Purgstall

٨٠ ترجمة الوفیات لدیسلان
English Translation of Ibn Khallikan's Biographical Dictionary. by De Slane

٨١ دائرة المعارف الاسلامیه
Encyclopaedia of Islam.

٨٢ ذیل تاریخ الأداب العربیه لبروکلمن
Geschichte der Arabischen Litterature Supplementband von Brockelmann

٨٣ ذیل المعاجم العربیة لدوزی
R. Dozy. Supplement aux Dictionaries Arabes

٨٤ قاموس الترکیة والانکلیزیة
Turkish and English Lexicon. by Sir James, W. Redhouse.

٨٥ لسترنج
Lands of the Eastern Califate. by G Le Strange

٨٦ وستن فیلد
Genealogische Tabllen der Arabischen Stamme und Familien von Dr. Fardenand Wustenfeld

اورنٹیل کالج میگزین (حصۂ اُردو)

اس علمی ادبی اور تاریخی سہ ماہی رسالہ کا سالانہ چندہ ۱۲؍ ہے۔ اس رسالہ کا ضمیمہ پنجاب یونیورسٹی عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کی طرف سے شایع ہوتا ہے اس کا سالانہ چندہ عا؍ ہے یہ رسالہ ۱۹۲۵ء سے شایع ہو رہا ہے۔ سابقہ نمبر تھوڑی سی تعداد میں باقی ہیں (بجز اگست ۲۷ و ۳۱ء کے دو رسالوں کے کہ وہ ختم ہو چکے ہیں) قیمت فی نمبر .. .. .. عہ/

ذیل کے مقالات اور کتابیں جو اس رسالہ میں شایع ہوئیں الگ بھی مل سکتی ہیں:۔

(۱) ضمیمہ اورنٹیل کالج میگزین جلد اول نمبر ۱ سلسلہ نمبر ۱
غزلیات حضرت امام العالم وغوث الاعظم امیر سید محمدؐ الملقب بہ نوربخش۔ قیمت ۴؍

(۲) سفرنامۂ چین ۱۴۱۹ء تا ۱۴۲۲ء یعنی مضمون و محصل روزنامچہ خواجہ غیاث الدین (نقاش) ایلچی بایسنغر میرزا ابن شاہرخ میرزا ابن امیر تیمور گورگان کہ حافظ ابرو در زبدۃ التواریخ درج نمودہ .. .. .. قیمت ۸؍

(۳) فہارس لسان العرب حصہ اول (اسماء شعرا جن کے اشعار لسان العرب میں درج ہیں) از پروفیسر عبدالقیوم ایم۔ اے۔ مجلد۔ قیمت .. .. للعہ/

(۴) شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد۔ از آغا محمد باقر ایم اے بی ٹی۔ قیمت ۸؍

(۵) فہارس لسان العرب حصۂ دوم (فہرست قوافی) از مولوی عبدالقیوم ایم۔ اے، ۲۹۶ صفحے چھپ چکے ہیں۔ باقی زیر طبع ہیں

(۶) مطلع سعدین از کمال الدین سمرقندی۔ مرتبہ پروفیسر محمد شفیع ایم اے پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور۔ ۶۲۴ صفحے چھپ چکے ہیں۔ باقی کتاب زیر طبع ہے

(۷) تلخیص مجمع الآداب فی معجم الالقاب۔ لابن الفوطی جلد ۵ کتاب الکاف عہ/

درخواستیں پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور کے نام آنی چاہئیں